قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2019 قیمت 15 ₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

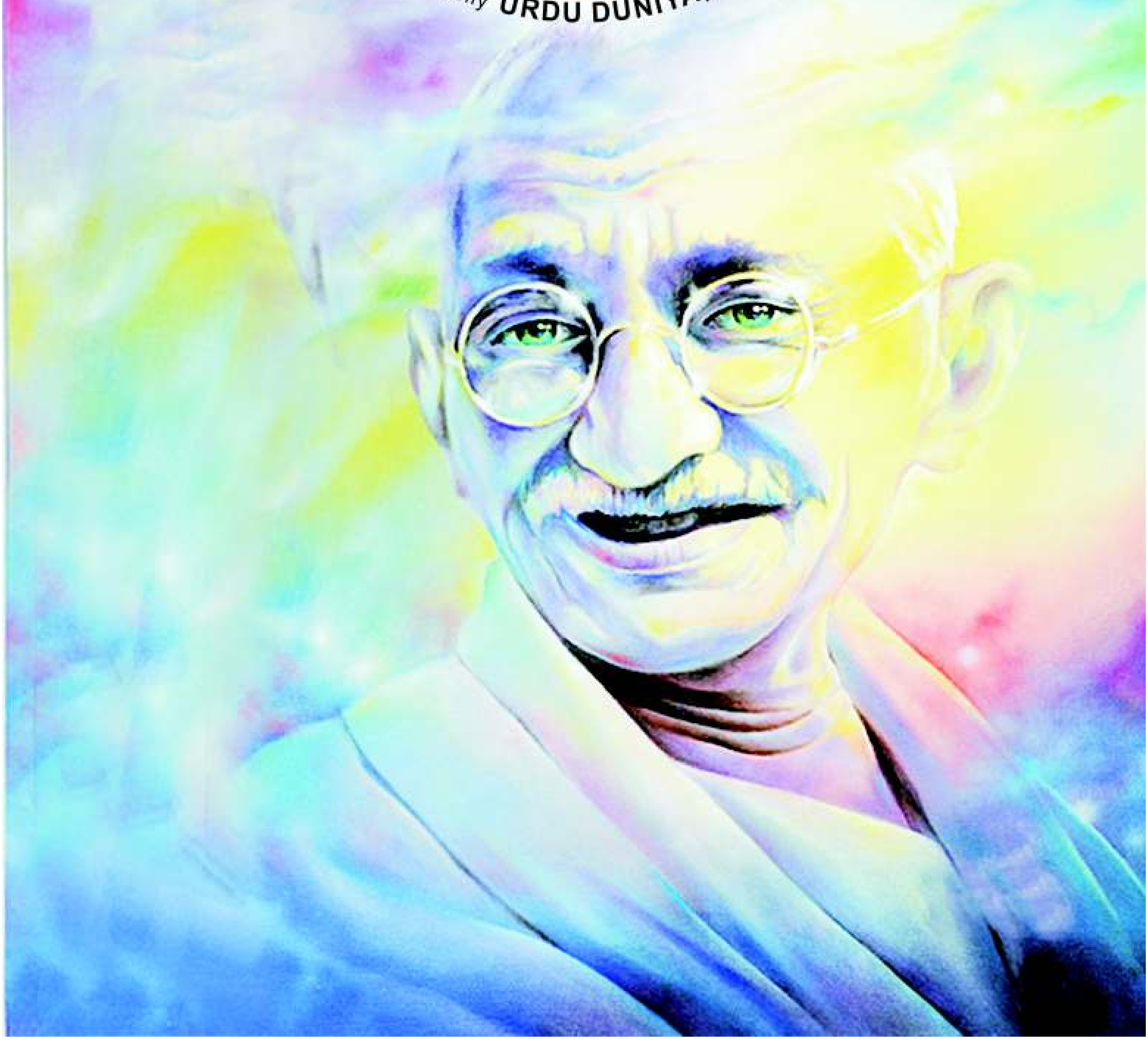

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

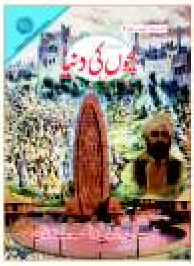

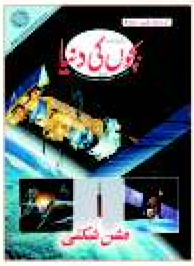

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

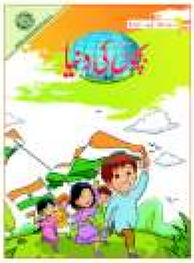

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

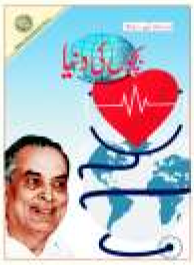

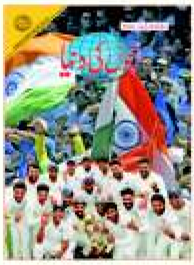

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21،شمارہ:10،اکتوبر2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت **-/15** روپے   سالانہ **-/150** روپے

Total Pages:**100**

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،۔ نئی دہلی-110025
فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746،   فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم
الفاظ کی طاقت — شمس الاسلام فاروقی 8

اردو کی تدریس میں
خرد تدریس کی اہمیت — شاذلی حسن خاں 10

زبان اور زمینی صورت حال
زبان کی موت انسانی
وراثت کا خاتمہ ہے — نورالہدیٰ 13

نقد و نگاہ
برج نرائن چکبست کی شاعری میں
حب الوطنی کے عناصر — ممتاز احمد خاں 16

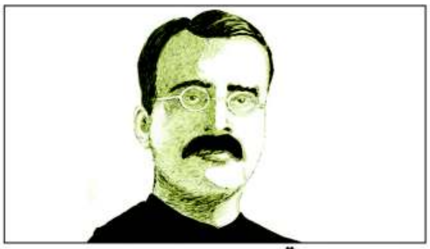

اردو غزل میں قدرتی آفات — محمد عادل 18
اردو کی پہلی داستان
اور شمالی ہند کی داستانیں — سعود عالم 22
اردو مثنوی: تعارف اور تفہیم — خان محمد رضوان 26
اردو ریڈیائی ڈراما — پاکیزہ اختر 31

خراج عقیدت
مہاتما گاندھی اور سماجی برابری
کی جدوجہد — شمیم احمد 35
تعلیمی بیداری اور سرسید احمد خاں — محمد خالد ظہیر 37

یادیں
موسیقار: خیام کی یاد میں — صدر عالم گوہر 40

طنز و مزاح کا ایک روشن چراغ
حضرت غوث خواہ مخواہ — ضامن علی حسرت 43

سلسلۂ صحافت
اردو کی ادبی صحافت اور وہاب اشرفی — ابرار احمد اجراوی 46

تہذیبی/ لسانی رشتے
اردو اور کشمیری زبان کا
لسانی و تہذیبی رشتہ — الطاف حسین نقشبندی 50
اردو اور پنجابی - ایک تہذیبی
و لسانیاتی مطالعہ — ندیم احمد ندیم 52

نیا آسمان نئے ستارے
اردو ناولوں میں
نسوانی کرداروں کا مطالعہ — طاہرالدین 56
ڈپٹی نذیر احمد اور تعلیم نسواں — محمد عامر 58

فلم
بالی ووڈ: اردو جاننے والوں
کے لیے مواقع — محمد شمیم اختر 62

کمپیوٹر
دستاویز میں عناصر جوڑنا 65

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 68

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 78

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 79

ہماری بات

ٹیکنالوجی نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے وہیں بہت حد تک ہماری ترجیحات کو بھی تبدیل کیا ہے۔ ٹیکنالوجی کی وجہ سے سارے مکانی فاصلے اور دوریاں ختم سی ہوگئی ہیں۔ دنیا ایک مٹھی میں سمٹ آئی ہے۔ پہلے زمانے میں جہاں کسی بھی مطلوبہ مواد تک رسائی کے لیے کافی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اب وہ ساری دشواریاں ٹیکنالوجی کے فیض سے سہولتوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ خاص طور پر انٹرنیٹ اب ایک ایسا ذریعہ بن چکا ہے جس کے ذریعے ہم ہر وقت معلومات اور پیغامات سے جڑے رہتے ہیں۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی انٹرنیٹ کا سلسلہ منقطع ہوجائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل کی دھڑکن بند ہوگئی ہو۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے ہی اب زبانیں بھی ان دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی ہیں جہاں تک رسائی کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زبانوں کی ترسیل اور ترقی کی راہ میں جو دشواریاں حائل تھیں وہ اب قدرے دور ہوگئی ہیں۔

انٹرنیٹ پر زبان و ادب کا اتنا وافر ذخیرہ موجود ہے کہ اب تحقیقی مواد اور تنقیدی مضامین کے حصول میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ بہت سارے ویب سائٹس ہیں جن میں بہت سی پرانی کتابیں، قدیم رسالوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر جدید ترین کتابیں موجود ہیں اور اب یہ سلسلہ مزید بڑھتا جارہا ہے۔ نئی نئی ویب سائٹس تشکیل دی جارہی ہیں اور ان کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ کا کام بھی وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں بہت سے ادارے اور افراد سرگرم ہیں وہیں قومی اردو کونسل بھی مستعدی کے ساتھ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے نئی ٹیکنالوجی کا سہارا لے رہی ہے اور اس تعلق سے جتنے بھی اقدامات کیے جاسکتے ہیں اس پر غور وغوض بھی کر رہی ہے۔

اردو کونسل عصری ٹیکنالوجی کی مدد سے اردو کو عالمی پیمانے پر فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر قومی اردو کونسل ایک سائبر لائبریری کی تشکیل کرنے جارہی ہے جس میں ادبی، سائنسی، سماجی، تعلیمی اور دیگر موضوعات پر مشتمل قومی اردو کونسل کی مطبوعات شامل رہیں گی۔ اس کے علاوہ قومی اردو کونسل ایک موبائل ایپ بھی تیار کرنے جارہی ہے جس میں اردو لرننگ سے متعلق کہانیاں، نظمیں اور دیگر چیزیں ہوں گی اور آڈیو ویژول کی سہولت بھی فراہم کی جائے گی تاکہ اردو زبان سیکھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ اس طرح کے اور بھی سلسلے ہیں جو قومی اردو کونسل شروع کرنے جارہی ہے۔

قومی اردو کونسل چاہتی ہے کہ اردو مشن کو عام کیا جائے تاکہ اردو کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو کی ترویج اور تشہیر کے لیے ہر طرح کی کوششیں کی جائیں گی۔ اس سلسلے میں محبانِ اردو سے درخواست ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے کن سطحوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے اس کی نشان دہی کریں تاکہ قومی اردو کونسل، جس کا تاسیسی مقصد اردو زبان کا فروغ ہے، اس میں اسے مکمل کامیابی مل سکے۔

قومی اردو کونسل کی کوشش یہ بھی ہے کہ اردو کو ہر گھر تک پہنچایا جائے اور اس کے لیے جو بھی ممکنہ ذرائع ہوسکتے ہیں اس کا استعمال کیا جائے۔ اردو زبان کے فروغ کے جہاں بہت سارے ذرائع ہیں وہیں موجودہ عہد میں اس کے فروغ کا ایک ذریعہ مشاعرہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ مشاعرے سے صرف اردو زبان سے محبت کرنے والے نہیں بلکہ دوسری زبانوں سے تعلق رکھنے والوں کی بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس طرح ہماری زبان ان علاقوں اور دیاروں تک پہنچ سکتی ہے جہاں تک پہنچنے میں بڑی دشواریاں ہیں۔ یہی مشاعرے ہیں جن کے ذریعے ہم دوسری زبانوں اور قوموں کے لوگوں سے جڑتے ہیں۔ اسی مقصد کے تحت قومی اردو کونسل ایک مسابقتی پروگرام کا بھی انعقاد کرے گی جس میں دس بہترین شاعروں کا انتخاب کرکے نہ صرف ان کی ہمت افزائی کی جائے گی بلکہ ان کو انعام واکرام سے بھی نوازا جائے گا۔ اردو مشن کو عام کرنا ہماری ذمے داری ہے اور اس سلسلے میں ہمیں پوری دنیا سے محبانِ اردو کی محبت اور مشوروں کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ فروغِ اردو کے اس مشن میں تمام احباب ہمارا ساتھ ضرور دیں گے!

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

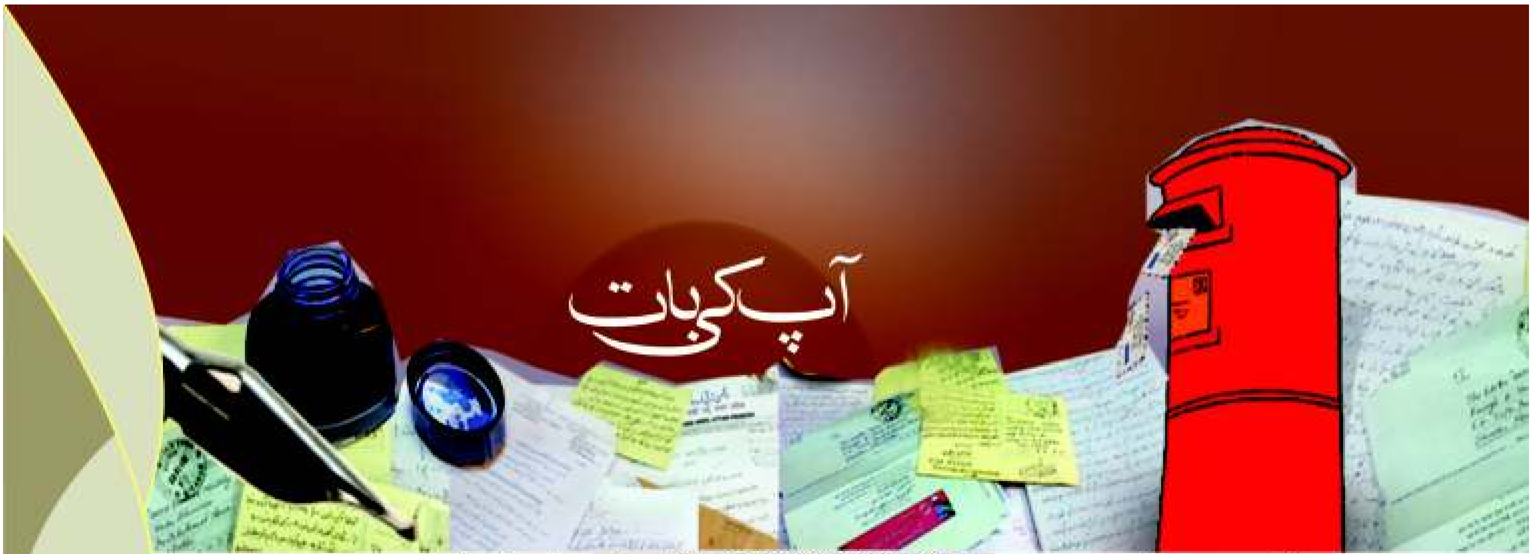

آپ کی بات

✍ 'اردو دنیا' اگست 2019 کا شمارہ اپنی شاندار روایت کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ کشمیر میں اردو کتاب میلہ منعقد کرنے کی مناسبت سے سرورق پر افتتاحیہ تقریب کا منظر، بیک سرورق پر NCPUL کی سرگرمیوں کی بولتی ہوئی تصویریں، خبرنامہ اور نادر مشمولات آپ کی ادارتی صلاحیت کو عیاں کرتے ہیں۔ 'ہماری بات' میں یوم آزادی کے موقعے پر تعمیر وطن اور آزادی کی جدوجہد میں اردو کے رول کو یاد کرکے آپ نے قابل ستائش کام کیا ہے۔ نئی نسل کو اس سے واقفیت ہوگی۔ آزادی کے بعد بھی ایوان ہائے پارلیمنٹ میں اردو شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے اور ممبران پارلیمنٹ داد سے نوازتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اردو کے فروغ کے لیے کچھ اور ٹھوس اقدامات اٹھائے۔ اس سے قومی یکجہتی اور ملک میں امن و امان کی فضا ہموار ہوگی۔ ڈاکٹر عبدالحی نے اپنی رپورٹ 'کشمیر میں کتاب میلہ' میں کشمیر کی تاریخ پر جو روشنی ڈالی ہے وہ نئی دریافت ہے۔ اتنا کامیاب کتاب میلہ جس میں پچاس لاکھ کی کتابیں بک گئیں یقیناً آپ کا لوگوں کو کتابوں سے جوڑنے کی تجربہ کامیاب رہا۔ اس تجربے کو اور شہروں میں دہرانے کی ضرورت ہے۔ این سی پی یو ایل نے کشمیر میں شاندار کتاب میلہ، مشاعرہ اور دیگر ثقافتی پروگرام منعقد کرکے قابل تحسین کام کیا ہے۔ خواجہ اکرام الدین نے اپنے مضمون 'غیر ملکی جامعات میں اردو تدریس، صورت حال اور مستقبل میں بیرونی ممالک میں اردو جامعات' کا بڑی محنت اور عرق ریزی سے تاشقند، مصر، جاپان، ماریشس، ترکی، یوروپی ممالک، برطانیہ، امریکہ، افریقہ، بنگلہ دیش میں اردو جامعات میں اردو کی روداد پیش کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے۔

✤ **عبدالحی پیام انصاری**: پپروی بازار، ضلع گورکھپور، یوپی

✍ 'اردو دنیا' اگست کا شمارہ ملا۔ سرورق پر کتاب میلے کے افتتاح کا فوٹو بڑا خوبصورت لگا۔ اداریے میں اردو

شعرا اور بانے ملک کی آزادی میں جو قربانیاں دی ہیں اس کا مختصر مگر جامع تذکرہ مدیر نے اچھے انداز میں کیا ہے۔ نائب مدیر عبدالحی صاحب نے کتاب میلے کی نہایت خوبصورت روداد پیش کی ہے۔ ساتھ ہی فوٹو سے مزین کرکے اسے کشمیر کی وادیوں کی طرح حسین اور جنت نظیر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اردو کتابوں کی فروخت کا ریکارڈ بھی انھوں نے ایک نظر میں سامنے کردیا ہے۔ غیر ملکی جامعات میں اردو تدریس کی صورت حال اور مستقبل کے امکانات پر حوالوں سے مزین کرکے اچھی تحقیق پیش کی گئی ہے، دیگر مضامین بھی عمدہ ہیں، تبصرہ اور تعارف بہت جامع اور دلچسپ ہوتا ہے۔ خبرنامہ کے تحت قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔

✤ **انصار احمد معروفی**: پورہ معروف، مئو، یوپی

✍ 'اردو دنیا' کا شمارہ اگست 2019 بروقت دستیاب ہوا۔ اداریہ 'ہماری بات' میں مدیر نے 'اردو دنیا' کے قارئین کو یوم آزادی کی مبارک باد دیتے ہوئے اردو کے قومی و وطنی کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی بات کے تحت ڈاکٹر م ق سلیم کا خط چھپا۔ اس میں موصوف نے رہنمائے دکن اور سیاست کی اشاعت پر روشنی ڈالی۔ میری دانست میں رہنمائے دکن جولائی 1949 سے شروع ہوا۔ یہ رہبر دکن کا تسلسل ہے۔ رہبر دکن سید احمد محی الدین کی ادارت میں 1920 میں جاری ہوا تھا اس کے مالک سید محمود وحید الدین تھے۔ روزنامہ 'سیاست' جناب عابد علی خاں کی ادارت میں 15 اگست 1949 کو شائع ہوا۔ مصنف کو محمود انصاری نے 3 مارچ 1979 کو یوم رحمۃ للعالمین کے مبارک و مسعود موقعے پر نظام شاہی روڈ حیدرآباد سے جاری کیا۔ نوید دکن جمعہ 26 جنوری 1976 عظیم عسکری، نواب محبوب عالم خاں کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ عبدالحی نے کشمیر میں کتاب میلہ میں ابتدا و تمہید میں کشمیر کی وجہ تسمیہ اور سری نگر کی تاریخ بیان کی ہے۔ کشیپ سے کشیپ میر یا کشمیر بنا ہے۔ کشمیر کی تاریخ، تہذیب و ثقافت کو پیش کرتے ہوئے 23واں اردو کتاب میلے کی ہر دن کی تفصیلات روداد و سرگرمیاں پیش کی ہیں۔ اردو تدریس کے ذیلی عنوان کے تحت خواجہ محمد اکرام الدین نے غیر ملکی جامعات میں اردو تدریس صورت حال اور مستقبل کے امکانات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ بیرون ہند اردو شعبے ہیں لیکن اردو کی بنیادی تعلیم کا نظم ہو تو اردو کے اعلیٰ تعلیمی خواب مستقل طور پر درخشاں رہیں گے۔ محمد فیروز عالم نے زبان و تعلیم کے تحت رائٹ ٹو ایجوکیشن ایکٹ موجودہ صورت حال اور امکانات میں حق تعلیم کے کوائف و تفصیلات بیان کی ہیں حق تعلیم کے بعد بھی خاص طور سے مسلمان تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں۔ نقد و نگاہ کے تحت منظر اعجاز نے ظفر عدیم کی چند منظومات فضا ابن فیضی کی غزلوں میں، ایم نسیم اعظمی خود نقدیت کے عناصر، حاذق فرید نے مسدس حالی کی غرض و غایت اور اس نظم کا محاکمہ و تبصرہ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ شعور اجاگر ہوتا ہے کہ مسلمان کون تھے کیا تھے کیا ہوگئے ہیں۔ علم و تعلیم سے محروم ہوگئے اس لیے تجارت، حکومت، و حکمرانی میں پیچھے

رہ گئے۔ اردو شاعری میں رام اور رام کتھاؤں کی روایت محمد قاسم انصاری نے لکھا۔ علامہ اقبال نے رام کو امام ہند کہا ہے اور نظم لکھی ہے۔ اردو ادب میں رام پر وسیع ادب موجود ہے۔ نکولن کے وی نے اردو کی ادبی تاریخ نگاری میں غیر مسلم ادبا کے حصے پر روشنی ڈالی۔ مضمون معلوماتی ہے۔ اسما نے نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں ہندوستانی تہوار و تہذیب کی تفصیلی ترجمانی ہے۔ نظیر نے اپنے عہد کے آگرہ و ہندوستان کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔ محمد طیب شمس نے زبان اور زمینی صورت حال سوال نامے کا جواب دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مدارس سے اردو کا مستقبل روشن ہے۔ خراجِ عقیدت میں شفاعت علی صدیقی، شاہد حبیب اقبال مجید کا فن، عشرت لطیف نے اس کی ادبی خدمات فکر و فن پر عکاسی کی ہے۔ سلسلہ صحافت میں اڈیشہ میں اردو صحافت، سعید رحمانی وہاں کے اخبارات رسائل و جرائد پر لکھا ہے۔ تہذیب و ثقافت فاروق ارگلی نے مقدس گنگا لکھا ہے۔ گنگا مقدس مانی جاتی ہے تو اس کی حفاظت اور دیکھ بھال اچھی طرح سے ہونی چاہیے۔ نیا آسمان نئے ستارے کے تحت محمد حسنین رضا نے مخدوم محی الدین کی غزلیہ شاعری میں ان کی شاعری کی خصوصیات پر لکھا ہے۔ ہم نے جنھیں بھلا دیا کے تحت ابوزر عبدالاحد فرقانی نے نرالے میاں شمس کی حیات، کارنامے سے بحث کی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے تحت انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اردو عرفان رشید نے لکھا۔ اردو کا ٹیکنالوجی میں کتنا استعمال ہو رہا ہے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے۔

❖ **ڈاکٹر ناظم علی**: برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

✍ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ بہت تاخیر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ زیرِ نظر شمارے کے اداریے 'ہماری بات' میں آپ نے (کتاب) تہذیب کلچر کی اہمیت و عظمت کو واضح کیا ہے۔ بقول آپ کے بے شک کتاب اسرار فطرت سے آشنا کراتی ہے اور آدابِ زندگی بھی سکھاتی ہے لیکن آج کتاب کی جگہ موبائل اور انٹرنیٹ نے اپنا جال اس طرح پھیلا دیا ہے کہ لائبریریوں، مدرسوں اور کالجوں میں کتابیں پڑھنے والے انگلی بھر موبائل میں مقید ہو چکے ہیں جبکہ کئی ذاتی اور سرکاری لائبریریز میں نایاب اور نادر کتابیں دھول میں اَٹی ہوئی دیمکوں کی غذا بنتی جا رہی ہیں لیکن یہ اٹل حقیقت ہے کہ اس مطالعہ شکن ماحول میں بھی کچھ قارئین اور قلم کار موجود ہیں جو کتابوں اور رسالوں کو آنکھوں اور دلوں سے لگائے ہوئے ہیں کیونکہ بقول آپ کے کتابوں سے ہی اپنی روایت اور

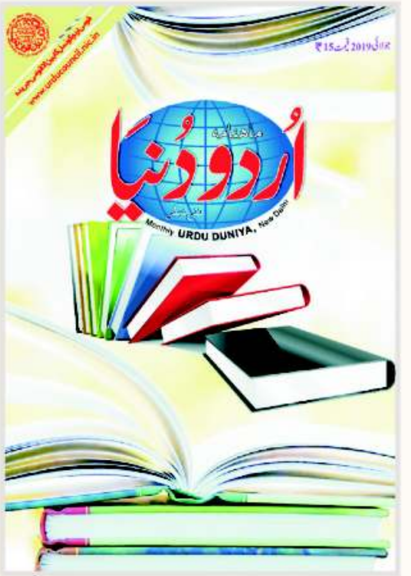

تہذیب کا رشتہ وابستہ اور پابستہ رہ سکتا ہے۔ قومی کونسل نے مختلف ریاستوں اور اضلاع میں کتاب میلے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ مستحسن ہے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی کا شمارہ حسبِ سابق دیدہ زیب و جاذب نظر سرورق اور معیاری مشمولات سے مزین ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس میں جناب ندیم احمد انصاری نے اپنے مقالے میں شاعری کی 'بارہ ماسہ' موسومہ ہیئت پر مبنی نایاب موضوع پر ایک احسن و معیاری مضمون پیش کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اسی بیان پر مبنی افضل جھن جھانوی کی اول تصنیف 'بکٹ کہانی' نام سے بتائی ہے اور اسی سے تحریک پا کر اسی نام سے اس سے بھی کہیں بہتر 'بارہ ماسہ' لکھنے والے مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی کی 'بکٹ کہانی' کا جاندار تجزیہ پیش کیا ہے۔ محمد نہال افروز صاحب نے اپنے مقالے میں سنہ 1980 کے بعد کی اردو اور ہندی کہانیوں کا ایک ایسا ہمہ گیر تقابلی تجزیہ پیش کیا ہے، جو کہ از حد عرق ریزی سے مملو اور معلومات افزا ہونے کے موجب قابلِ مدح ہے۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک**: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر، پٹیالہ

✍ 'اردو دنیا' جولائی 2019 کا شمارہ پہلی بار نظر سے گزر رہا ہے جو اردو زبان کا نمائندہ ماہنامہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اداریہ میں آپ نے کتاب کے وجود کو سامنے رکھ کر جو معنی خیز گفتگو کی ہے اسے اردو والوں کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنا چاہیے۔ چونکہ کتاب نے جس گھر میں بھی قدم رکھا ہے اس کی صورت بدل کر رکھ دی ہے۔ اداریہ کے مطالعے کے دوران کتاب کی معنویت و اہمیت کے تعلق سے ایک شعر وجود میں آ گیا ہے جسے آپ کی نذر کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہا ہوں، شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہر نفس ذہن کی وسعت میں اضافہ ہوگا
عشق کرنے کا شغف ہے تو کتابوں سے کرو

مذکورہ شمارے میں متعدد تحریریں ہیں جو اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کرتی ہیں اور اس کی بقا کے مناسب مشوروں کو بھی سامنے رکھتی ہیں اور اردو زبان سے متعلق ایک سوال نامہ بھی شائع کیا گیا ہے جو آنے والے جوابات کی روشنی میں اردو زبان کی موجودہ صورتِ حال سے پوری طرح آگاہ کر سکتا ہے لیکن خاکسار کا خیال ہے۔ اردو زبان کی گرتی ہوئی صحت کو سنبھالنے کے لیے سوالوں کے بڑے بڑے بت تراشنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اردو عاشقین کو اردو کے روشن مستقبل کے لیے صرف اتنا کرنا ہے کہ تمام اردو مدرسین کی ایک فہرست بنا کر انھیں ایک تنظیم میں تبدیل کرنے کی کوشش دل و جان سے کرنے کے ساتھ انھیں ان کی اصل ذمہ داری کا احساس اس انداز سے دلانا ہے کہ اردو زبان سے ان کا جذباتی رشتہ قائم ہو جائے۔ پھر دیکھیے کوئی ایک شخص بھی یہ کہتا ہوا نظر نہیں آئے گا کہ اردو زبان آگے چل کر ختم ہو جائے گی۔ دانشور طبقہ بڑی بڑی یونیورسٹیز کے اردو شعبوں میں بڑے بڑے سمینار منعقد کرنے کے بعد بھی اردو زبان کی حالت میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں لا سکا ہے اس لیے اردو زبان کو عوام سے پوری طرح جوڑنے کی ضرورت پر دھیان دینا لازمی ہے اور اس مشکل کام کو اردو مدرّسین آسانی سے انجام دے سکتے ہیں اور اس کام میں ان کے طلبہ بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے خوشی سے تیار ہو جائیں گے۔ اب ذرا ایک ہلکی سی نظر اردو زبان کے عروج کے زمانے پر بھی ڈال لیتے ہیں جس میں کتاب کا متبادل تھا ہی نہیں۔ لوگ ذہنی تفریح کے لیے افسانے اور ناول جم کر پڑھا کرتے تھے۔ مذہبیات سے متعلق کتابیں بھی خوب پڑھی جاتی تھیں۔ جو لوگ بغیر پڑھے لکھے تھے وہ پڑھے لکھے لوگوں سے ناول یا افسانہ پڑھوا کر سنا کرتے تھے اور اس وجہ سے ہی ان کا تلفظ بھی درست ہوا کرتا تھا۔ اردو زبان کا یہ جادو اسمارٹ فون، انٹرنیٹ، فیس بک، کی موجودگی میں پوری طرح تو واپس نہیں آ سکتا، یہ مایوسی نہیں حقیقت ہے لیکن اردو زبان و ادب کی قدآور شخصیات اردو مدرّسین کے ساتھ عوام کی تنگ گلیوں میں زبان کی بقا کی خاطر پھیرے لگانے پر آمادہ ہو جائیں تو

بھی منظر بدل سکتا ہے اور اس کام میں شعری نشستوں کی صورت میں شعرا بھی تعاون کر سکتے ہیں۔ رہا سوال اردو زبان کے رسم الخط کے بدلنے کا سو یہ سب جانتے ہیں یہ کبھی نہیں ہوگا مگر یہ شور اس لیے مچایا جاتا ہے کہ کچھ آوازیں اس کی مخالفت میں بھی ابھر آتی ہیں۔ اس طرح اردو زبان ایک فضول بحث کے شور میں تبدیل ہو جاتی ہے جو نہیں ہونی چاہیے۔ محترم اسعد اللہ نے اپنے مضمون 'اردو ادب اور عالمی مسائل' کے عنوان سے جو گفتگو کی ہے اس کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن جب والدین بچوں کو ملازموں کے سپرد کر کے اپنی اپنی مصروفیات میں محو ہو جاتے ہیں تو انھیں یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ ان کے ملازمین کی اخلاقی نوعیت کیا ہے؟

شارق عدیل: محلہ چوبدار، مارہرہ، ضلع ایٹہ، اتر پردیش

'اردو دنیا' کے شمارے پابندی سے موصول ہو رہے ہیں۔ جولائی 2019 کا شمارہ بھی زیر مطالعہ رہا۔ یہ اتنا دلچسپ اور افادیت سے بھرپور ہے کہ اس کی مشمولات سے روگردانی غیر ممکن ہے۔ کتابوں کو طاق پر رکھ دینے کا رجحان روح فرسا ہے۔ یہ بات فی الواقع صحیح ہے کہ اب تو مکانوں کا نقشہ ہی کچھ یوں تبدیل ہو چکا ہے کہ اس میں ہر واہیات چیز کی گنجائش تو موجود ہے، پر اچھی کتابوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یہی کچھ اس شمارے کے اداریہ کا لب لباب ہے۔ سوالنامہ برائے انٹرویو میں دیے گئے سوالات کے خطوط پر جو جوابات رقم ہیں (ص8) وہ نہایت سلجھے ہوئے ہیں مگر اسی صفحے پر نیشنل اردو پرائمری اسکول کی جو تصویر دی گئی ہے اس میں مقام یا شہر کا نام درج نہیں ہے۔ مزید یہ کہ مدرسہ کا نام اردو ترجمہ کے ساتھ لکھا جاتا تو کیا مضائقہ تھا۔ ص12 پر حالی کی مخالفت کے بارے میں جو مضمون تحریر کیا گیا ہے، وہ نہ صرف حالی کو عظیم تخلیق کار ثابت کرتا ہے بلکہ اردو کے بحیثیت اولین نقاد کے انھوں نے تنقید کی حدیں بھی مقرر کر دیں کہ نکتہ چینی ادب سے تجاوز کر کے ذاتیات پر بیجا دست اندازی بلکہ دست درازی کے مرتکب نہ ہوں۔ اور اگر ایسا ہوا تو ادیب کو چاہیے کہ وہ صبر و استقامت سے کام لے کر اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرے۔ ص16 پر غالب صدی کے بعد دیوان غالب کی قابل ذکر اشاعتوں پر ایک مفصل مضمون درج ہے جو دراصل اک روداد گم شدہ ہے اس میں بقدر ضرورت تعارفی و تحقیقی مواد بھی شامل کیا گیا ہے۔

اردو کا پہلا نثری سفرنامہ بھی ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں علمی اعتبار سے کم مایہ اور قدرے تعلیم یافتہ سفیروں کے انداز بیاں کے فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دہلی سلاطین کے علمی رجحانات میں ان علمی کارگزاریوں کا ذکر خیر کیا گیا ہے جو کہ دہلی سلطنت یعنی محمد غوری سے لے کر تغلق اور لودھی خاندان تک دہلی و اکناف میں جاری ہیں۔ ص27 پر نہال چند لاہوری کا یہ کارنامہ بیان کیا گیا ہے کہ شیخ عزت اللہ بنگالی کی فارسی تصنیف 'گل بکاولی' کا اردو نثر میں ترجمہ کیا اور اسے 'مذہب عشق' کے نام سے موسوم کیا۔ مثنوی گلزار نسیم اسی کی منظوم شکل ہے۔ مضمون بہت عمدہ ہے۔ ص33 پر 1980 کے بعد کی اردو ہندی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ پیش ہے۔ ص38 پر صوبۂ گجرات کے حوالے سے اردو زبان و ادب کے مسائل بحث کی گئی ہے جس میں رسم الخط کا نکتہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ غیر افسانوی اصناف ادب قدرے مفصل پر بڑا اہم مضمون ہے جس میں کوئی اٹھارہ نثری اصناف سخن پر بحث کی گئی ہے۔ ص47 پر مطبع مجتبائی دلی ایک تحقیقی مضمون ہے پر اس کی ابتداء ہندوستان میں پریس و چھپائی کی تاریخ سے کی گئی ہے جو کبھی کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اپنے زمانے میں ماہنامہ 'شمع' نہایت مشہور و معروف فلمی و ادبی جریدہ تھا جو ملک و بیرون ملک اردو دانوں کے ہر گھر میں پڑھا جاتا تھا۔ شمع کے مدیر یونس دہلوی کی زباندانی و کارکردگی پر بڑی دلچسپ گفتگو پیش کی گئی ہے۔ رومانی شاعر کیفی وجدانی، ڈاکٹر محمد حسین فطرت بھٹکلی، حکیم سید فخر الدین خیالی پر عمدہ مضامین ہیں۔

ص59 پر عالمی ادبیات کے ذیل میں سب سے پہلے ورد بھ میں فارسی زبان و ادب کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد شیکسپیئر سے نوکلاسیکی دور تک کے انگریزی شاہکار ادب پر عہد قدیم تا دور جدید تک تحقیقی و تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ اردو ادب اور عالمی مسائل کے ذیل میں موجودہ حقیقی مسائل پر بات کرنے کے بجائے قصہ پارینہ کی پرچھائیوں پر بیانات درج ہیں اور شروعات تانیثیت سے کی گئی اور کہا گیا ہے کہ یہ مغرب کا پیش کردہ تصور ہے۔

ڈاکٹر عبدالحی کا پروفیسر ادریس صدیقی سے لیا گیا انٹرویو دلچسپ اور عمدہ ہے گویا انھوں نے تعلیم کو سزا سے مزہ میں بدلنے کی کلید تھما دی۔ ص72 پر سائنس و ٹکنالوجی کے تحت کاغذ اور اس کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ماحولیات کے زیر اثر فضائی آلودگی (ص74) سے لاحق خطرات سے نہ صرف آگاہ کیا گیا ہے بلکہ ان سے تحفظ کی تدابیر سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اوزون کو درپیش خطرہ اس کا زائیدہ ہے۔ کمپیوٹر کی معلومات جو ہر شمارہ میں بالضرور شامل ہوتی ہیں اور جو عہد حاضر کا شدید تقاضا ہے ص78 پر درج ہے۔ تبصرہ و تعارف (ص81) پر کوئی تیرہ کتابوں پر تبصرے درج ہیں۔ ص91 سے آگے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کے احوال درج ہیں جن سے آپ کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

مصطفی ندیم خاں غوری: روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور فراہم کریں۔** معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

شمس الاسلام فاروقی

الفاظ کی طاقت

ایک مشہور پالش ناولسٹ جوزف کون ریڈ کا قول ہے: ''الفاظ نے پوری پوری قوموں کو متحرک کر دیا ہے۔ آپ مجھے موزوں الفاظ اور صحیح تلفظ دیجیے میں دنیا کو ہلا کر رکھ دوں گا۔''

الفاظ میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ الفاظ کا صحیح انتخاب ایک ہاری ہوئی فوج کو دوبارہ فتح سے ہمکنار کر کے حکومتوں کو بچا سکتا ہے۔ دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن بنا سکتا ہے۔ الفاظ خواہ لکھے جائیں یا بولے جائیں وہ ساری زندگی لگاتار لوگوں کو یا تو بلندیوں پر فائز کرتے رہتے ہیں یا پھر پستیوں میں دھکیلتے رہتے ہیں۔

کن فیکون کا راز بھی ایک ہی لفظ میں پنہاں ہے۔ وہ رب جلیل کا صرف ایک تحکمانہ لفظ ہی تو تھا جس نے زمین آسمان اور پوری کائنات کو وجود بخش دیا۔ ہماری زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ سے مقناطیسی لہریں نکل کر نہ صرف فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں بلکہ وہ ہمارے اور دوسروں کے جسموں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ خراب الفاظ منفی اور اچھے الفاظ مثبت لہریں پیدا کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے اثرات سے آپ نہ تو خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو ان سے بچا سکتے ہیں۔ اس روشنی میں اگر کہا جائے کہ معاشرے کا نیک اور بد ہونا بھی اس امر پر موقوف ہوتا ہے کہ اس میں مجموعی طور پر بھلے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں یا برے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

الفاظ میں پنہاں بے پناہ طاقت کو ثابت کرنے کے لیے جاپان کے ایک سائنسداں ڈاکٹر مَسار وایموٹو نے پانی پر کچھ عجیب و غریب تجربات کیے۔ انھوں نے پانی کے بہت چھوٹے چھوٹے قطرات کو مختلف الفاظ، موسیقی یا ماحول سے ہمکنار کرایا اور پھر انھیں تین گھنٹے کے لیے ٹھنڈا کر کے جما دیا یہاں تک کہ وہ ننھے قطرات کرسٹلس میں تبدیل ہوگئے۔ ڈاکٹر ایموٹو نے جب خوردبین کے نیچے ان کا مشاہدہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہر کرسٹل مختلف طرز اور وضع کا تھا۔ وہ قطرہ جس پر نہ تو کوئی الفاظ بولے گئے تھے اور نہ ہی اسے کسی موسیقی سے ہمکنار کیا گیا تھا اس کے کرسٹل کی بناوٹ میں کوئی نظم نظر نہ آتا تھا بلکہ وہ بہت بے ترتیب تھا۔ دہقانی موسیقی نے قطرے کو کسی قدر اچھے اور کلاسیکل موسیقی نے اسے بہت منظّم اور بالترتیب کرسٹل میں تبدیل کیا تھا۔ ڈاکٹر ایموٹو نے جس قطرے کے اوپر ایک کاغذ لٹکا کر لکھا تھا کہ تم نے مجھے تنگ کر دیا میں تمھیں مار ڈالوں گا اس قطرے کا کرسٹل بے حد انتشار بھرا اور بے ترتیب تھا لیکن محبت کے الفاظ نے قطرے کو بے حد خوبصورت اور باقاعدہ وضع کے کرسٹل میں تبدیل کیا تھا۔

ڈاکٹر ایموٹو کا کہنا ہے کہ چونکہ ہمارے جسم میں 72% فیصدی پانی ہوتا ہے اس لیے الفاظ سے ہمارے جسم مختلف اثرات قبول کر لیتے ہیں۔ اگر ایک شخص اپنے بارے میں کہے گا کہ وہ نکما اور ناکارہ ہے یا وہ کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے کہ اس کے لیے تندرست ہونا ممکن نہیں تو سچ مچ وہ نہ صرف اپنی زندگی میں ناکام رہے گا بلکہ اس کی صحت بھی متاثر ہوگی لیکن اس کے برخلاف ہو شخص جو اپنے بارے میں کہے کہ وہ صحت مند ہے اور اسے کوئی بیماری نہیں ہے، وہ تمام کاموں کو بخیر و خوبی انجام دے سکتا ہے تو یقیناً وہ اپنی زندگی میں کامیاب اور ایک صحت مند آدمی ثابت ہوگا۔

یورپ کا ایک مشہور پادری، دانشور اور صوفی لیڈ بیٹر اپنی کتاب بعنوان 'دی ماسٹرس اینڈ دی پاتھ' میں لکھتا ہے ''ہر لفظ ایتھر (عالم ملکوت) میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً لفظ نفرت اس قدر بھیانک تصور میں بدل جاتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے یہ صورت دیکھ لی اور اس کے

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں جس نے بھی پڑھی ہیں وہ تصدیق کرے گا کہ یہ ایسے الفاظ کے مجموعے ہیں جو اپنے قاری کو سرتاپیر اپنے اندر غرق کرلیتے ہیں اور بے ساختہ اس کے منہ سے توصیفی کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ جن لوگوں نے مولانا موصوف کو سنا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی تقاریر کے ذریعے اپنے سامعین کو جس سمت چاہیں موڑ سکتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض مقررین پورے مجمعے کو اگر ہنسا سکتے ہیں تو رونے پر بھی مجبور کردیتے ہیں۔ اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنی تقاریر سے پوری مجلس کو مسمیرائز کردینے پر قادر ہوتے ہیں۔

بعد مجھے یہ لفظ استعمال کرنے کی کبھی جرأت نہیں ہوئی۔''

ہر لفظ ایک یونٹ یا ایٹم ہے جسے اندرونی جذبات کی بجلیاں برقاتی رہتی ہیں اور اس کے اثرات اس عالم خاکی اور عالم لطیف (کاسمک یا آسٹرل ورلڈ) دونوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال گالی ہے۔ گالی تلوار یا توپ نہیں بلکہ چند الفاظ کا مجموعہ ہے جو مخاطب کے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے۔ لیڈبیٹر کہتا ہے کہ آپ کبھی گالی نہ دیں کیونکہ یہ خود آپ کی اپنی صورت کو بھی مسخ کردیتی ہے۔

پیرا سائیکولوجی کے پروفیسر پیرل ماسٹر اپنی ایک تحقیق میں انکشاف کرتے ہیں کہ میں نے لفظ رحیم اور پرویز کا موازنہ کیا تو جہاں رحیم کے سبز اور سفید روشنی نکل رہی تھی وہیں پرویز سے سیاہ اور نسواری رنگ کی روشنی مترشح ہورہی تھی۔ تعویذ وغیرہ کی شکل میں لکھے ہوئے الفاظ بھی اسی طرح اثرانداز ہوتے ہیں کیونکہ ہر لفظ میں اپنی مخصوص طاقت پوشیدہ ہوتی ہے۔

حکیم محمد طارق چغتائی اپنی کتاب 'سنت نبوی اور جدید سائنس' میں الفاظ کی طاقت کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک حیرت انگیز واقعہ نقل کرتے ہیں جو ان کے ایک مریض نے بیان کیا تھا۔ اس نے بتایا ''میرے گدھے کے پیٹ کے قریب گہرا زخم ہوگیا۔ بہت علاج کرائے لیکن افاقہ نہیں ہوا حتیٰ کہ اس میں کیڑے پڑگئے۔ اس کے بعد ایک ملاقاتی کے مشورے سے تین سودخوروں کے نام لکھ کر تعویذ کی طرح اس کے گلے میں لٹکا دیے۔ حیران کن طور پر تین دن کے اندر گدھا ہر لحاظ سے تندرست ہوگیا۔ کیڑے مرگئے اور زخم بھر گئے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے زہر کو زہر مارے۔ ہم سب واقف ہیں کہ کینسر کے لیے کیموتھیراپی یعنی زہریلی ترکیب کا استعمال مؤثر ہوتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں جس نے بھی پڑھی ہیں وہ تصدیق کرے گا کہ یہ ایسے الفاظ کے مجموعے ہیں جو اپنے قاری کو سرتاپیر اپنے اندر غرق کرلیتے ہیں اور بے ساختہ اس کے منہ سے توصیفی کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ جن لوگوں نے مولانا موصوف کو سنا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی تقاریر کے ذریعے اپنے سامعین کو جس سمت چاہیں موڑ سکتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض مقررین پورے مجمعے کو اگر ہنسا سکتے ہیں تو رونے پر بھی مجبور کردیتے ہیں۔ اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنی تقاریر سے پوری مجلس کو مسمیرائز کردینے پر قادر ہوتے ہیں۔

الفاظ کی طاقت کے حوالے سے پادری لیڈبیٹر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے کسی شخص کے جسم لطیف پر بے شمار پھوڑے اور ناسور دیکھے جن سے پیپ کے چشمے رواں تھے۔ انھوں نے اسے زبور کی چند آیات پڑھوائیں جن سے دو ماہ بعد ہی اس کا جسم لطیف بالکل صاف ہوگیا۔

اس سلسلے میں حکیم طارق کہتے ہیں ''الہامی الفاظ اور اسمائے الٰہی میں اتنی طاقت ہے کہ ان کے ورد سے ہماری پریشانیاں اور بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ مسلمان اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس اللہ کے ننانوے صفاتی نام مثلاً رحیم، کریم، غفور، خبیر وغیرہ موجود ہیں جنھیں حسب حاجت پکارا جاسکتا ہے۔ یہ سہولت دیگر مذاہب میں موجود نہیں۔ الفاظ کی یہ طاقت اصل حروف میں ہوتی ہے۔ اگر کسی لفظ کا ترجمہ کردیا جائے تو وہ بات نہیں رہتی اور اثر بدل جاتا ہے جو طاقت 'رحیم' میں ہے وہ 'یا مہربان' میں نہیں۔

الفاظ کی طاقت کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا جاسکے یا نہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ الفاظ غیرمعمولی طاقت کا سرچشمہ ہیں جن سے مثبت اور منفی لہریں نکل کر نہ صرف بولنے والے کو بلکہ اس کے اطرا ف کو بھی متأثر کرتی ہیں۔ اس لیے اگر آپ ایک صحت مند اور خوشگوار زندگی کے خواہاں ہیں تو اپنی زبان سے ادا ہونے والے ہر لفظ پر قابو رکھیں اور کوشش کریں کہ آپ کا لہجہ نرم اور الفاظ محبت، شفقت اور شیرینی سے لبریز ہوں۔ آپ کے الفاظ نہ تو کرخت اور نہ ہی کریہہ ہوں کہ وہ نہ صرف آپ کی اپنی شخصیت کو مسخ کرڈالیں بلکہ آپ کے مخاطبین کو بھی متأثر کریں گے۔

حکیم طارق مزید لکھتے ہیں کہ انھوں نے دل اور دمے کے مریضوں کو پچھلے دس سالوں میں سورۃ الحجر کی آیات 97 تا 99 صبح شام تین مرتبہ پڑھنے کی تلقین کی۔ ان کے مطابق ان بیماریوں کا ایک بھی مریض ضائع نہیں ہوا۔ بلاشبہ یہ قرآن کریم کے الفاظ کا کرشمہ ہے۔

دعا دراصل الفاظ کا مجموعہ ہے جو ایک شخص اپنے پیدا کرنے والے کے حضور اپنی حاجات کی برآوری کے لیے پیش کرتا ہے۔ دعا کی افادیت کا جائزہ لینے کی غرض سے برطانیہ کے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ نے ایک لاکھ چھبیس ہزار لوگوں پر مختلف ٹیسٹس کیے اور یہ نتیجہ نکالا کہ اگر آپ ایک صحت مند خوشگوار زندگی گزارنے کے خواہشمند ہیں تو کسی روحانی مرکز میں جاکر دعا کیجیے۔ اس ٹیم کے اعلیٰ رابطہ کار ڈاکٹر میک لوگ کہتے ہیں کہ مذہبی رجحان رکھنے والے لوگ مشکل حالات اور ناخوشگوار صورت حال پر قابو پالیتے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں بالخصوص ہارورڈ، اسٹینڈفورڈ اور پرنسٹن یونیورسٹیوں میں 300 مطالعات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دعا شفایابی کے عمل میں ڈرامائی کردار ادا کرتی ہے۔

الفاظ کی طاقت کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا جاسکے یا نہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ الفاظ غیرمعمولی طاقت کا سرچشمہ ہیں جن سے مثبت اور منفی لہریں نکل کر نہ صرف بولنے والے کو بلکہ اس کے اطراف کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ اس لیے اگر آپ ایک صحت مند اور خوشگوار زندگی کے خواہاں ہیں تو اپنی زبان سے ادا ہونے والے ہر لفظ پر قابو رکھیں اور کوشش کریں کہ آپ کا لہجہ نرم اور الفاظ محبت، شفقت اور شیرینی سے لبریز ہوں۔ آپ کے الفاظ نہ تو کرخت اور نہ ہی کریہہ ہوں کہ وہ نہ صرف آپ کی اپنی شخصیت کو مسخ کرڈالیں بلکہ آپ کے مخاطبین کو بھی متاثر کریں گے۔ اگر آپ ایسا کرپائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ نہ صرف ایک اچھی صحت کے مالک ہیں بلکہ آپ کی زندگی بھی بے حد خوشگوار ہے، لوگ آپ کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھیں آپ کی صحبت میں بیٹھنے اور آپ سے گفتگو کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔

■

Shamsul Islam Farooqui
90-B, Ahata Talib
Noor Nagar, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

اردو کی تدریس میں خرد تدریس کی اہمیت

شاذلی حسن خاں

اُردو زبان کی مؤثر اور کامیاب تدریس کے لیے اُردو کے استاد کو نہ صرف اُردو زبان پر مکمل قدرت حاصل ہونا چاہیے بلکہ اُسے مختلف تدریسی طریقوں، ترکیبوں (Strategies) اور مہارتوں (Skills) سے بھی واقفیت ہونا چاہیے اور ان کا مناسب اطلاق اور استعمال بھی جاننا چاہیے۔ دورِ حاضر میں تعلیمی اداروں میں زیر تربیت اساتذہ کو ان تدریسی طریقوں اور مہارتوں کی مشق دی جاتی ہے۔ ایک کامیاب استاد اپنے آزمودہ طریقوں، اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدوں کی بنیاد پر سیکھی ہوئی تراکیب اور مہارتوں کا استعمال اپنی تدریسی سرگرمیوں میں کرتا ہے۔ ان تمام خصوصیات کی مدد سے استاد اپنے درس کو تو مؤثر بناتا ہی ہے لیکن غیر علمی سرگرمیوں میں بھی، مثلاً نظم ونسق، کھیل کود، اور دوسرے غیر نصابی علاقوں میں ان کا کامیابی سے استعمال کرتا ہے۔

اُردو کے اساتذہ کو جن لازمی اور اہم مہارتوں پر عبور ہونا چاہیے اور جن کی تربیت عموماً تعلیم کے تربیتی اداروں میں دی جاتی ہے ان میں ذیل میں دی گئیں مہارتیں (Skills) بالخصوص اہم ہیں:

سبق کا تعارف وتمہید، طلباء کے لیے سبق کی تفہیم کو آسان بنانا، ادبی نکات کی ترسیل وتحسین کے لیے موزوں سوالات کرنے کا فن، تختۂ سیاہ کا استعمال، تقویت (Reinforcement)، امدادی اشیا کا استعمال، تفویضات (Assignments)، دینے کی مہارت، تفہیم کی جانچ، اعادہ وغیرہ۔

تربیتی اداروں میں ان ہی مندرجہ بالا مہارتوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ 'خرد تدریس' بھی ایک تربیتی تکنیک ہے جس کے ذریعہ ایک متعلم، استاد ایک وقت میں کسی ایک مہارت کی مشق کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، خرد تدریس میں تدریس کے سب ہی پہلوؤں کو مختصر کر کے صرف ایک مہارت پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ اس میں صرف پانچ سے دس منٹ تک کا سبق ہوتا ہے اور سامعین (Audience) میں پانچ سے دس تک طلبا ہوتے ہیں۔ اس تکنیک کا مقصد اصل کمرۂ جماعت کی پیچیدگیوں کو کم کر کے تدریس کو آسان بنانا ہے۔

خرد تدریس کا تصور سب سے پہلے اسٹانفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلوڈی ایلن نے پیش کیا تھا۔ تاکہ زیر تربیت اساتذہ اصل کمرۂ جماعت میں پڑھانے سے پہلے اپنے ساتھیوں (Peers) کے سامنے مشق کر لے اور ان سے باز رسائی کر کے اپنی مہارت کو مضبوط بنالے۔ یہ تکنیک نئے اساتذہ کی تربیت کے لیے نہایت مفید ہے۔ لیکن اب اس کا استعمال کچھ دوسرے پیشوں میں بھی جیسے طِب اور نرسنگ میں بھی ہو رہا ہے۔

خرد تدریس کے مراحل:

خرد تدریس کی مشق دینے سے پہلے چند اقدام ضروری ہیں:

(1) سب سے پہلے ایک ماہر استاد (Teacher Educator) ایک مثالی مظاہرہ پیش کرتا ہے۔ جس میں وہ کسی مخصوص مہارت کا استعمال بتاتا ہے۔ بعض اوقات یہ مظاہرہ تحریری شکل یا فلم وغیرہ سے بھی دیا جاسکتا ہے۔

(2) طالبعلم۔ استاد اپنے سبق کا منصوبہ بناتا ہے جس میں وہ کسی ایک مہارت کا انتخاب کرتا ہے۔

(3) خرد تدریس کا ماحول بنانا چاہیے۔ ضروری آلات، امدادی اشیا کا انتظام کرنا۔

(4) سامعین یعنی مشاہدہ کرنے والے نگراں کے علاوہ، طالبعلم۔ استاد کے ساتھی بھی ہو سکتے ہیں۔

مہارتوں کے اجزا:

ہر مہارت کے ذیلی اجزا یا ذیلی مہارتیں بھی ہوتی ہیں۔ جن کا اردو کے اساتذہ کو خیال رکھنا ہوگا۔ مثلاً سبق کی تشریح وتوضیح کے لیے طلبا سے سوالات کیے جائیں گے۔ ان سوالات میں مندرجہ ذیل خصوصیات یعنی ذیلی مہارتیں ہونا چاہئیں:

(i) سوال درجۂ جماعت کے معیار کے مطابق ہو۔

(ii) سوال کی زبان آسان اور قواعدی طور سے درست ہو۔

(iii) سوال سبق میں تناظر کے لحاظ سے موزوں ہو۔

(iv) سوال مناسب رفتار، لہجہ اور آواز کے ساتھ پیش کیا جائے۔

(v) سوال کے پیش کیے جانے کے بعد طلبا کو جواب دینے کے لیے مناسب وقت دیا جائے۔

(vi) کیا سوالات کل کمرۂ جماعت میں ہر سمت میں تقسیم کیے گئے ہیں۔

ایک اور مثال: کمک یا تقویت (Reinforcement) کے اجزا:

طلبا کے جوابات ملنے پر ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔ مثلاً:

(i) تعریفی الفاظ اور جملے کہنا۔

(ii) طلبا کے صحیح جوابات کو تختۂ سیاہ پر لکھنا۔

(iii) طلبا کے جوابات کو استعمال کرنا۔

(iv) طلبا کو خوشگوار اور موزوں اشاروں سے اطمینان کا اظہار کرنا۔

باز رسائی (Feedback):

خرد تدریس کے مکمل ہونے کے فوراً بعد طالب علم۔ استاد کو باز رسائی فراہم کی جاتی ہے۔ یہ باز رسائی نگراں اور سامعین میں شامل دوسرے ساتھی یا اصل طلبا بھی دے سکتے ہیں۔ باز رسائی دینے کے لیے بھی بہت باقاعدگی اور سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ محض تبصرہ کرنے کی بجائے اپنا خیال اور رائے ایک خاکہ پر پیمانۂ قدر کے لحاظ سے نمبرات یا گریڈ کی صورت میں دی جائے۔ تاکہ مشورہ بالکل صحیح اور قابلِ عمل ہو۔ ہر مہارت کے اجزا پر الگ الگ نمبرات دینا چاہیے۔ مثلاً تفہیم کے لیے کیے گئے سوالات کی مہارت کے اجزا پر ذیل کے لحاظ سے دیے جائیں:

مہارت کے اجزا	نگراں/مشاہد کی رائے
(1) سوال درجۂ جماعت کے معیار کے مطابق۔	90
(2) سوال کی زبان قواعدی طور سے درست۔	80
(3) سوال صاف اور واضح۔	80
(4) سوال تناظر کے لحاظ سے موزوں۔	80
(5) سوال مناسب رفتار اور آواز کے ساتھ۔	65
(6) سوال کل درجہ پر ہر سمت تقسیم کیے گئے۔	55

اوسط: 75 فیصد

اُردو کی تدریس اور نصابی اُصول:

اُردو تدریس کے سلسلے میں اُردو کے استاد اور نصاب کی تشکیل کرنے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ لفظیات اور تصورات درجۂ جماعت کے معیار کے لحاظ سے منتخب کیے جائیں۔ ابتدائی درجوں میں نصابی عنوانات اور ان کے تدریسی مقاصد اعلیٰ درجوں سے مختلف ہوں گے۔ ابتدائی درجوں میں آسان اور دلچسپ مضامین، سادہ اور شیریں نظمیں شامل کرنا چاہیے۔ غزل، قصیدہ وغیرہ اعلیٰ درجوں کے لیے ہی مناسب ہیں۔

غزل کی تدریس بالخصوص ایک تجربہ کار اور دانشور معلم کی متقاضی ہے۔ غزل کا ہر شعر معنی کے لحاظ سے مکمل اور منفرد ہوتا ہے۔ استاد کو نہ صرف شعر کے محاسن اور معنی سے طلبا کو آگاہ کرنا ہوگا بلکہ اس میں استعمال کی گئیں تشبیہ واستعارہ وغیرہ سے بھی طلبا کو واقف کرانا ہوگا۔ جہاں تک ممکن ہو صرف ایسی غزلوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جن سے اخلاقی قدروں اور تہذیب کو فروغ ملے۔ فحش اور ناشائستہ غزلوں سے احتراز ضروری ہے۔

استاد تمہیدی گفتگو اور تعارف کے بعد مثالی بلند خوانی کرے گا۔ چند طلبا سے بھی صحیح لب ولہجہ کے ساتھ بلند خوانی کروانا چاہیے۔ اس کے بعد غزل کی تفہیم وتحسین کے لیے، استاد ہر شعر کی توضیح وتشریح سوالات اور جوابات سے کرے گا۔ مشکل الفاظ اور صنعتوں کو زبانی بتا کر تختۂ سیاہ پر درج کرنا چاہیے۔ اس مرحلہ پر استاد کی خرد تدریس سے حاصل کی ہوئی مہارت کام آتی ہے۔ استاد کی زبانی تشریح اور موزوں سوالات سے تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔

خرد تدریس کی خوبیاں:

ذیل میں خرد تدریس کی چند اہم خوبیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(i) خرد تدریس سے سبق کو سادہ اور آسان بنایا جاتا ہے۔ اس میں عام کمرۂ جماعت کی پیچیدگیوں کو کم کیا جاتا ہے۔

(ii) اس سے طالبعلم۔ استاد کو مؤثر باز رسائی دستیاب ہوتی ہے۔

(iii) خرد تدریس کے وقت سامعین اصل طلبا یا طالبعلم۔ استاد کے ساتھی (Peers) ہو سکتے ہیں۔

(iv) یہ ایک مؤثر تربیتی تکنیک ہے۔ تدریسی طریقہ نہیں ہے۔

(v) زیر تربیت استاد کو انفرادی اور مخصوص مہارت کی مشق ملتی ہے۔

(vi) یہ ایک کفایتی مشق ہے۔ طالبعلم۔ استاد خود اپنی کارکردگی کا جائزہ ویڈیو ٹیپ کے ذریعے لے سکتا ہے۔

خرد تدریس کی خامیاں اور تحدیدات:

اس تکنیک کی کچھ تحدیدات بھی ہیں:

(i) خرد تدریس کی کامیابی کے لیے نگراں کو بہت ہوشیار اور مستعد ہونا چاہیے۔

(ii) اس سے استاد کی تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ نہیں ملتا۔

(iii) خرد تدریس ایک مماثلتی ماحول میں کی جاتی ہے۔ اصلاً ماحول بالکل مختلف ہوتا ہے۔

(iv) اس کے لیے کمرۂ جماعت میں خاص انتظام کرنا پڑتا ہے۔

(v) خرد تدریس کی وجہ سے انتظامیہ کو بھی دقتیں پیش آسکتی ہیں۔

غزل کی تدریس اور خرد تکنیک کی اہمیت:

سب سے پہلے استاد طلبا کو غزل کی ساخت اور شکل کے بارے میں بتاتا ہے۔ پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ایک ہی ردیف اور قافیہ رکھتے ہیں۔ آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ استاد پہلے شاعر اور اس کی غزل کا تعارف کرتا ہے۔ غزل کی فنی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد استاد غزل کی بلند خوانی کرتا ہے تاکہ طلبا کو صحیح لب ولہجہ اور اہم زیر وبم سے آگاہی ہو سکے۔ اس سے غزل کی شیرینی اور آہنگ بھی نمایاں ہو سکے گا۔ چند طلبا سے بھی بلند خوانی کرائی جانی چاہیے اور ان کے لب ولہجہ کو درست کرنا چاہیے۔

مثال کے طور پر غالب کی مشہور غزل کے اس شعر کو لیجیے:

بس کہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

استاد شعر پڑھ کر تختۂ سیاہ پر مشکل الفاظ لکھتا ہے۔

استاد کہتا ہے: ''یہ غالب کی مشہور غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس شعر میں غالب نے آدمی کی فطرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ کہ آدمی کی کیا فطرت ہوتی ہے: وہ عموماً خود غرض اور لالچی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے احساسات اور جذبات کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس طرح اس کے لیے انسان ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔''

استاد ہر شعر کی تشریح کے لیے طلباء سے سوالات کرکے طلبا کو غور وفکر کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ مثلاً استاد طلباء سے پوچھتا ہے'' آپ کو غالب کا کون سا شعر پسند ہے''؟۔

غالب کو بڑا شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

غالب کے کلام میں مماثلت اور مبالغہ آرائی کی نشاندہی کیجیے۔

خرد تدریس کی تربیت سے استاد طلبا سے کئی سوال کرتا ہے۔ جس سے طلبا کو اشعار کی تفہیم وتحسین میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً:

(i) غزل کے پہلے شعر کے کیا معنی ہیں۔ اس میں کون سا فلسفہ بیان کیا گیا ہے؟

(ii) غالب کی شاعری کی کون کون سی خصوصیات آپ کو اہم معلوم ہوتی ہیں؟

(iii) غالب کی خود پسندی اور انانیت کے بارے میں کوئی شعر سنایئے۔

اس شعر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مختصر یہ کہ اردو تدریس میں غزل کا خاص مقام ہے جو صرف اعلیٰ درجوں میں پڑھائی جانا چاہیے۔ اردو کے استاد کو خود بہت تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔

اختتامیہ:

اگرچہ خرد تدریس کو ایک جدید ترین ترکیب بتایا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تربیتی اداروں میں اس کے کچھ پہلوؤں کو ایک عرصے سے استعمال کیا جارہا ہے۔ مثلاً پروگرامڈ لرننگ، اور کمپیوٹر کی مدد سے تدریس۔ ان تصورات میں بھی یہی مفروضہ ہے کہ اگر پیچیدہ مہارتوں کو اس کے اجزا میں تقسیم کر دیا جائے تو اکتساب آسان اور مؤثر ہو جائے گا۔

خرد تدریس پر تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس سے کئی مہارتوں کو جلا ملتی ہے۔ پسندیدہ طرز عمل کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ طالبعلم۔ استاد مختلف مہارتیں یکے بعد دیگرے سیکھ لیتا ہے۔

یہ ایک منظم تربیتی تکنیک ہے۔ غور وفکر اور مناسب منصوبہ بندی سے اساتذہ کی تربیت کے لیے اس کو بامعنی اور مفید بنایا جا سکتا ہے۔ خرد تدریس لچکدار ہے اور مختلف حالات کے موافق اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

حوالے اور مآخذ:

1. جے۔ ایس مودی (2013): مائیکرو ٹیچنگ۔ شپرا، نئی دہلی۔
2. رادھا موہن (2010): انوویٹنگ سائنس ٹیچنگ۔ پی ایچ آئی۔ لرننگ، نئی دہلی
3. این کے جنگیرا۔ اور اجیت گپتا۔ (1980)۔ کور ٹیچنگ اسکلس۔ این سی ای آر ٹی، نئی دہلی۔

■

Dr. Shazli Hasan Khan
Senior Assistant Professor, MANUU
College of Teacher Education
Sambhal - (UP)

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

کسی زبان کی موت انسانی وراثت کا خاتمہ ہے

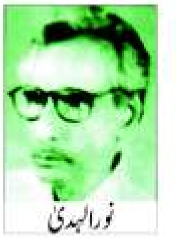

نورالہدیٰ

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگھی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

سوال: کسی زبان کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: کسی زبان کی موت کی متعدد وجہیں ہیں:

اوّل: کسی شے کی پیدائش، اس کی نشوونما اور عروج وزوال کارخانۂ قدرت کے فطری اعمال ہیں۔ نامیاتی مادوں کی طرح زبان بھی ارتقا کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی معدوم ہوجاتی ہے۔

دوم: زبان کا رشتہ عوام سے منقطع ہوجائے۔ خرید وفروخت، لین دین اور روزمرہ کے دیگر معاملات میں اس کا استعمال نہ ہو۔ پبلک اسامیوں اور حکومتی اداروں (سیول، ایڈمنسٹریشن، جوڈیشیل) سے اسے 'دیش نکالا' مل جائے۔ اکادمک طور پر اس کے 'Utilitarian Values' ختم ہوجائیں۔

سوم: کوئی زبان کسی مخصوص صنف ادب سے وابستہ ہوجائے۔ اس میں جدید فکر وفلسفہ، سائنس وٹکنالوجی اور دیگر عصری علوم کو سمونے یا جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔

چہارم: اگر دریا یا ندی اپنے مخرج ومنبع سے کٹ جاتی ہے تو خشک ہوجاتی ہے۔ یہی حال زبان وادب کا ہے۔ آج سے تقریباً 70 سال قبل گاندھی جی (مرحوم) کا ایک قول پڑھا تھا ''بغیر فارسی زبان کے اچھی اردو نہیں آسکتی۔''

پنجم: آخری اور اہم وجہ یہ ہے کہ کوئی زبان لسانی عصبیت اور سیاسی وسماجی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوجائے۔

سوال 2: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

جواب: اس کا سیدھا جواب تو یہی ہے کہ زبان کی موت کے لیے جو اسباب ہیں ان کا تدارک کیا جائے۔

سوال 3: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

جواب: تہذیب وثقافت دراصل وہ صالح اور تعمیری قدریں ہیں جو انسانی گفتار وکردار کے ذریعے بدلی جاتی ہیں یا ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ ہماری روحانی وراثت بھی ہے جو وقت کے لمبے سفر میں سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہیں۔ لازماً ان قدروں کا تحفظ اور ان کا فروغ اس زبان کے وسیلے سے ہوتا ہے جسے ہم استعمال کرتے ہیں۔

اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ کسی زبان کا اثر انسانی تہذیب وتمدن پر کس طرح پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر صاحب عقل کو ہے۔ ہر زبان کی اپنی لسانی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ تہذیب انسان کی گفتگو اور نشست وبرخاست سے ظاہر ہوتی ہے۔ کیا آپ اردو بولنے والوں (صحیح اردو) اور انگریزی یا دیگر زبان کے جاننے والوں کی حرکات و سکنات میں فرق محسوس نہیں کرتے؟

سوال 4: کیا زبان کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔

جواب: زبان کی موت دراصل انسانی تاریخ کے ایک مخصوص عہد کے علمی وادبی، تہذیبی وثقافتی اور دینی وروحانی اثاثوں اور بولیوں کی موت ہے۔ سیکڑوں برس کی تہذیب وتمدن کی اہم یادگاریں اس سے تباہ ہوجائیں گی۔ کسی زبان کی موت انسانی وراثت کا خاتمہ ہے۔

سوال 5: ''کیا کسی زبان میں سائنسی اور سماجی مواد کی کمی سے اس کی خواندگی پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔''

جواب: زبان کی حیثیت ایک Ware-House کی ہے جس میں طرح طرح کے علوم وفنون اور قیمتی معلومات جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر اس گودام میں عمومی اور بازاری اشیا جمع ہوں تو ان کی طرف کون رخ کرے گا۔ اردو زبان پر ہر دور میں یہ تہمت لگتی رہی ہے کہ یہ صرف شعروشاعری کی زبان ہے اب تو یہ عیب بھی ہنر میں شمار ہوتا ہے۔ سو سال سے اوپر کا عرصہ گزرا کسی دل جلے نے یہ لکھا تھا کہ ''اردو شاعری نے ملک کو نقصان پہنچایا ہے۔'' حالی کا فرمان تھا کہ بری شاعری معاشرے کو کرپٹ کرتی ہے۔ کارلائل کا یہ جملہ تو آج بھی دہرایا جارہا ہے کہ ''یورپ کی ایک الماری میں جتنے علوم ہیں پورے ایشیا کے علوم پر بھاری ہیں۔''

حاصل گفتگو یہ ہے کہ ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان کو سائنسی اور سماجی مواد کے علاوہ بھی اس میں جدید اور قدیم علوم کے ذخائر موجود ہوں تاکہ ہر ذوق کے قاری اس سے مستفید ہوسکیں بصورت دیگر زبان کا زوال اس کا مقدر ہے۔

سوال 6: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: اردو زبان کو سب سے بڑا خطرہ درج ذیل نعرے سے ہے۔

''ایک ملک، ایک زبان، ایک کلچر.....''

ہمارے ملک میں جو خوبصورت اور غیر معمولی چیزیں پیدا ہوتی ہیں انھیں ملک بدر کردیا جاتا ہے۔ یہ ملک بدری آرٹس اینڈ کلچر، زبان و مذہب اور عقیدے و مسالک کی شکل میں ہوتی ہے (تفصیل کا موقع نہیں) وہ خطرات جو خود اہلِ زبان نے اردو کے لیے پیدا کیے ہیں بڑے سنگین ہیں۔ اردو قوم کا اس زبان سے بھروسہ ختم ہوچکا ہے۔

سوال 7: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہورہا ہے۔ کیا اردو کی شکل بدل رہی ہے؟

جواب: ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اردو زبان وادب کی شکل بگڑ گئی ہے اور اس کا چہرہ مسخ ہورہا ہے۔ اردو کے اخبارات کا مطالعہ کیجیے آپ کو بڑی مایوسی ہوگی۔ نامہ نگاروں کی رپورٹیں، مسخ شدہ اردو کی عمدہ مثالیں ہیں۔ بہ استثنائے چند اردو رسائل اپنی پاافتادہ روش پر قائم ہیں۔ صنف ادب اور صنف زبان کا کوئی بھی عنوان سامنے رکھیں ایجاد و اجتہاد کا کوئی نقش آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ اختراع وایجاد کے میدان اور آمد و وجدان کے کینوس سمٹے جارہے ہیں۔ اظہار و بیان کا حسن، انتخاب الفاظ کا سلیقہ اور خیالات وتصورات کی وہ ہمہ گیری جن کے لیے اردو محبوب ومقبول سمجھی جاتی تھی آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گی۔ ریڈیو اور ٹی وی میں جس طرح سے خبریں پڑھی جاتی ہیں اور حالات حاضرہ پر تبصرات ہوتے ہیں انھیں سن کر کیا اردو کی کم نصیبی پر آپ

کو ملال نہیں ہوتا ہے۔ اردو کے صحافی جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور مولیان کرام وعظ ونصیحت کے لیے جس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو پر دوسری زبان کے اثرات بدنمایاں ہیں۔

ہر زبان کا اپنا لسانی اور صوتی نظام ہوتا ہے جس کا اثر بولنے والوں کے چہرے بشرے پر بھی پڑتا ہے۔ زبان مسخ ہوتی ہے تو چہرے بھی مسخ ہوجاتے ہیں۔ وہ لوگ جو آزادی سے قبل اردو تہذیب وتمدن کے فیوض و برکات کا لطف اٹھا چکے ہیں انھوں نے زبان وادب کی رو بہ انحطاط قدروں کا کرب کس طرح برداشت کیا ہے، وہی جانتے ہیں۔ زبان بدلی، دہان بدلا، تہذیب وضعداری کے انداز بدلے، یہاں تک کہ بولنے والوں کے قیافے بھی بدل گئے۔

سوال 8: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اس سوال کا سیدھا جواب ممکن نہیں اور نہ اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ آج سے ٹھیک سو سال قبل، 1918 میں پنڈت برج نارائن چکبست نے لکھنؤ سے ایک ماہنامہ 'صبح امید' کے نام سے جاری کیا تھا۔ کسی شمارے میں مولانا ابوالخیر مودودی کا ایک مضمون اسی عنوان (اردو کا مستقبل) سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں موصوف نے اردو کے مستقبل کے بارے میں گرچہ خدشات کا اظہار کیا تھا لیکن کسی مایوسی یا محرومی سے گریز کیا تھا۔ سو سال کے بعد عصر حاضر کی اردو کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمام تر بدحالیوں اور تعصبات کے باوجود اردو صرف زندہ ہی نہیں ہے بلکہ زور شور کے ساتھ زندہ ہے بھلے ہی اس کا معیار ومقام نہایت پست ہوا ہو۔

قارئین کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اردو کے مستقبل کے باب میں زیادہ پر امید نہیں ہے۔ بقول ان کے اس ملک کی روایت رہی ہے کہ یہاں جو بھی خوبصورت چیزیں پیدا ہوتی ہیں انھیں یا تو دیش نکالا ملتا ہے یا آثار قدیمہ کی یادگار کے طور پر نمائش گاہوں میں سجا دیا جاتا ہے۔

مایوسی کفر ہے۔ راقم الحروف کو ان خیالات کو قبول کرنے میں نہایت تامل ہے۔ اردو زبان وادب کا دائرہ سمٹ تو گیا اور اس کی سماجی مخصوص مراکز سے وابستہ ہوگئی۔ معیار شاعری معیار ادب اور دوسری معیار تخلیق پست ہوئی ہے لیکن ہنگامے زور شور سے جاری ہیں۔ اردو اخبارات کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھی ہے۔ صرف پٹنہ شہر (بہار) سے ایک درجن سے زیادہ اردو اخبار (یومیہ) شائع ہوتے ہیں۔ کلکتہ سے نصف درجن اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ رسائل اور جرائد کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ بیشتر ریاستوں میں حکومت وقت کی طرف سے اردو اکادمیاں قائم ہیں جہاں اردو کے فروغ کے لیے حکومت کروڑوں روپے دیتی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ ان روپیوں کا ہم صحیح مصرف کس طرح لیتے ہیں۔ بہار اور بنگال کے کچھ اضلاع میں اردو ثانوی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایثار وعطا اور انعام واکرام کے سلسلے بھی جاری ہیں۔ ان ہنگاموں کے پیش نظر یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں اردو زبان کا وجود باقی رہے گا اس طرح کہ روح تو ختم ہوجائے گی جسم قائم رہے گا۔

سوال 9: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اسے روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

جواب: یہ نہایت اہم اور کارآمد سوال ہے۔ راقم کے ذہن میں چند مشورے ہیں جو لکھے جاتے ہیں:

(i) اردو لکھنے پڑھنے والے فارسی زبان بھی سیکھیں۔ اسکول اور کالج میں فارسی کی پڑھائی قریب الختم ہے اسے جاری رکھا جائے۔

(ii) رسائل اور جرائد میں نظم ونثر کے ناقص اور پا افتادہ مضامین شائع نہیں کیے جائیں، حوصلہ افزائی کے خیال سے یا تربیت وٹریننگ کے مدنظر نو واردوں کے کچے پکے مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سے حتی الوسع پرہیز لازم ہے۔ ڈاکٹر، پروفیسر اور علامہ جیسے القاب سے مرعوب ہونے کے بجائے تخلیقات کی افادیت اور ان کی اصل روح کی طرف توجہ کی جائے۔

(iii) بعض یونیورسٹی کا شعبۂ اردو سہل پسندی اور عمومیت کا شکار ہے۔ وہاں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں پوجا کے پرشاد کی طرح بٹتی ہیں۔ اس سے پرہیز لازم ہے۔

(iv) زبان وادب کا کوئی مذہب ومسلک نہیں ہوتا اور یہ کسی اخلاقی ضابطے کا پابند بھی اس صورت میں نہیں ہے کہ کسی جانبداری کو راہ دی جائے۔ ملک کی اردو اکادمیوں اور دیگر اداروں کو چاہیے کہ وہ گروہ بندی، اقرباپروری اور سیاسی حلقہ بگوشی سے صرف نظر کریں اور انعام واکرام اور ایثار وعطا کے وقت فنکار کے معیار تخلیق اور اس کی افادیت پر نگاہ رکھیں۔

سوال 10: کیا اردو کے ادارے اور انجمنیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہی ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک گئی ہے۔

جواب: ہمارے خیال میں یہ سوال 'Ambigous' ہے۔ زبان وادب دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ زبان تو ایک ذریعہ ہے ادب کے اظہار کا۔ ادب کا معیار جتنا بلند ہوگا زبان کی عظمت اتنا ہی زیادہ ہوگی۔

غالباً اس سوال کا منشا یہ ہے کہ اردو میں گرامر اور قواعد کی کتابیں نہیں شائع ہوتیں یا اردو سیکھنے سکھانے کے لیے کتابیں نہیں چھپتیں۔ آزادی سے بہت قبل ہم لوگوں نے اردو کا قاعدہ پڑھا تھا۔ اردو کی چوتھی تک آتے آتے اچھی خاصی اردو ہی نہیں آئی بلکہ اردو کا ذوق بھی پیدا ہوا۔ بہرکیف اصلاح زبان کے لیے کتابیں شائع ہوں تو بہتر ہے۔ ایسی کتابیں شائع ہوں جن میں تقابلی طور پر صحیح اور غلط زبان کا فرق بتایا جائے۔

سوال 11: کیا کلاسیکیت، جدیدیت، وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: زبان وادب ہو، سائنس وٹکنالوجی ہو یا کوئی فن اور ہنر تجربات ہوتے ہیں۔ اس کے مثبت نتائج بھی نکلتے ہیں۔ اردو زبان میں اس قسم کے جو تجربات ہوئے ہیں راقم التحریر کی رائے میں اسے ذہنی ورزش اور تفنن طبع سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انھیں اردو زبان کے شائستہ اور مہذب ادب کا حصہ نہیں کہا جاسکتا۔

سوال 12: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں۔ ان میں اساتذہ کی تعداد کتنی ہے؟

سوال 13: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں۔

جواب: ان کے بارے میں راقم الحروف کے پاس کوئی اعداد وشمار نہیں ہے۔ ریاست کی اردو اکادمیاں اور دوسرے اداروں کے لیے لازم ہے اس سلسلے میں ایک مشن کے طور پر سروے کرائے کلکتہ میں 'Objective studies' کا ایک شعبہ تھا۔ شاید اب بھی ہے۔ اس سے رجوع کیا جائے۔

سوال 14: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کسی نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہی ہیں؟

جواب: راقم التحریر کا مولد اور وطن دلکھمنیاں، بیگوسرائے، بہار ہے لیکن پچھلے پچاس برسوں سے درس وتدریس کے سلسلے میں وطن ثانی کلکتہ ہے۔ مرکزی کلکتہ میں اردو زبان وادب کے فروغ کے متعدد ادارے ہیں۔ مغربی بنگال اردو اکادمی، ایران سوسائٹی، بزم احباب، مسلم انسٹی ٹیوٹ، مسلم پروگریسیو سوسائٹی، بزم شاکری، بزم نثار وغیرہ اہم ادارے ہیں۔ اور ہر ادارہ اپنے اپنے طور پر اردو زبان وادب کی خدمت میں فعال وسرگرم ہیں۔

سوال 15: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی یا قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے۔

جواب: اس ضمن میں ہماری معلومات ادھوری ہیں۔

سوال 16: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: پتہ نہیں لفظ 'کوشش' سے کیا مراد ہے؟ تحریر و تصنیف اور علمی و ادبی جلسوں اور سمینار میں شرکت اگر فروغ اردو کے باب میں مفید ہو سکتے ہیں تو پچھلے تمیں سال سے ان میں Active Participation ہے۔ سائنس اور ادب پر چند کتابیں تصنیف ہو گئی ہیں۔ (قدیم رسائل اور اداریہ نگاری (اور دوسرے مضامین، تخمین وطن وطن، دیار گم گشتہ، معاصرین کلکتہ، تذکار نظامی، بازگشت وغیرہ) سائنس میں کچھ کتابیں لکھ دی ہیں (ایجاد معانی، داستان کائنات، دو جلدوں میں ہائر سیکنڈری، فیزکس، کیمسٹری) آرگینک کیمسٹری، نصف درجن کتابوں کا مسودہ موجود ہے۔

مقامی طور پر تمام علمی و ادبی اداروں سے وابستی ہے۔ 'بزم احباب' ایک ایسا علمی ادارہ ہے جسے کلیم صادق لکھنوی، آرزو لکھنوی، وحشت کلکتوی وغیرہم نے قائم کیا۔ اس کی صدارت کا شرف حاصل ہے۔ یہ ادارہ 2020 میں 100 سال کی عمر کو پہنچے گا۔ ان شاء اللہ اگر وسائل مہیا ہو سکے تو صد سالہ جشن کا اہتمام ہوگا۔ گاہے گاہے اصلاح و مشورے کا کام بھی جاری رہتا ہے۔ یہ ساری باتیں مختصراً ہم نے بھی ادب کر لکھ دی ہیں۔ ان کے علاوہ 'اردو' کے حق میں دعائیں کرتا رہتا ہوں۔

سوال 17: آپ کے ذہن میں اردو کے فروغ کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: تجاویز تو کئی ہیں۔ اگر ان پر سنجیدگی سے عمل کیا جائے تو فبہا۔

(i) آزادی سے قبل (1940 کے ابتدائی سال) ہم نے دیکھا کہ بستی کے پڑھے لکھے گھرانوں میں خواتین محلّے کے بچوں کو جمع کر کے پڑھایا کرتی تھیں۔ خود ہمارا گھر ایک منی مدرسہ تھا اور میں اپنی ماں سے تیسویں پارہ کے متون، اور اردو کی چوتھی تک پڑھا۔ اس کے بعد اسکول ماڈل مکتب میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد ہی اردو زبان سے ایک طرح ذہنی اور جذباتی نسبت پیدا ہو گئی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ریاست کے خاص خاص حصوں میں اس طرح کے گھریلو مدرسے قائم کیے جائیں۔ اس سلسلے میں ریاست کی وہ اکادمیاں توجہ کریں۔ جو قریہ قریہ گھوم کر 'اردو آپ کے دروازے پر' کا نعرہ بلند کرتی ہیں اور دیگر غیر اہم کاموں میں کثیر رقم خرچ کرتی ہیں جس سے زبان و ادب کا خاص فائدہ نہیں ہوتا۔

(ii) جب کوئی زبان اپنی نشو و نما کے ابتدائی دور میں ہو یا اس کی ترقی رک جائے تو ایسی صورتوں میں دوسری زبانوں کے اہم تراجم نہایت کارآمد اور معاون ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ریاستی اکادمیاں اور دیگر سرکاری اور نیم سرکاری ادارے جو اردو زبان و ادب کی خدمات پر مامور ہیں اپنے یہاں تراجم کا شعبہ خصوصی طور پر قائم کریں۔

(iii) اردو کا تعلق فارسی سے استوار کیا جائے۔

(iv) ایسے اسکول اور کالجوں میں جہاں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے اس طرف توجہ دی جائے۔

(v) ریاست کے قصبات میں چھوٹی چھوٹی انجمنیں قائم کی جائیں۔ ان کی طرف سے اردو ادب کے ماہوار جلسے منعقد ہوتے رہیں۔ ان جلسوں میں دوسری زبان کے ادیب و شاعر اور سامعین بھی مدعو کیے جائیں۔

(vi) جس ریاست میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ حاصل ہے وہاں خط و کتابت اور دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری امور میں اردو استعمال کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔

سوال 18: اردو زبان کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟

جواب: سو سال قبل سے یہ سازش چلی آ رہی ہے کہ اردو زبان کا رسم الخط تبدیل کر دیا جائے تا کہ صدیوں کا علمی و ادبی اور دینی و ثقافتی اثاثہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق ''لٹریچر دراصل ایک قسم کے تمدن کی ترجمانی کرتا ہے اور ہر زبان کے الفاظ و محاورات اور خیالات و احساسات کی ایک دنیا اپنے ماحول میں وابستہ رکھتے ہیں جو صدیوں میں ان کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ ان الفاظ و محاورات کو دوسری زبان کا لباس پہنانا دراصل ان کو ماحول سے الگ کرنا ہے۔'' ہر زبان رسم الخط سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر مفرس اور معرب اردو بھی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے تو وہ ہندی ہی کہلائے گی۔

سوال 19: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

سوال 20: غیر اردو حلقوں میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جا سکتی ہے؟

جواب: دونوں سوال کے مشترک جواب ہیں۔

- اردو زبان و ادب کے جو سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ہیں یا اردو کی دوسری انجمنیں ہیں وہ غیر اردو دانوں کے لیے (خصوصاً ہندی اور بنگلہ) کے لیے تعلیمی کلاس کا مستقل بندوبست کریں۔
- اردو کی اہم تصانیف کا ترجمہ علاقائی زبانوں میں کیے جائیں۔
- اردو-ہندی اور اردو دیگر علاقائی زبان کی مشترک تنظیمیں قائم کی جائیں اور انھیں فعال بنایا جائے۔
- سمینار اور مشاعروں میں دیگر زبان کے ادیب و شاعر بھی مدعو کیے جائیں۔
- سب سے اہم یہ کہ خود اردو والے قومی اور علاقائی زبان سیکھیں اور ان میں عبور حاصل کریں۔

سوال 20: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

سوال 21: کیا آپ کے بعد اردو زبان آپ کے گھر میں زندہ رہے گی؟

جواب: اردو ہماری وراثت ہے جو نسلاً بعد نسل ہم تک آئی ہے۔ ہمارے خاندان کے تمام افراد ''اردو فو بک' ہیں۔ گریجویشن میں ہمارے بیٹے اور بیٹیوں کا ایک سبجیکٹ اردو رہا ہے۔ ان میں فرسٹ کلاس آنرز بھی ہیں۔ ہمارا برادر زادہ (ڈاکٹر سرورالہدیٰ) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اردو پڑھاتا ہے۔ ان شاء اللہ ہمارے گھر میں اردو زبان اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک کہ اردو خود زندہ ہے۔

سوال 23: آپ کے علاقے میں کتنے اسکول اور کالج اور یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔

سوال 25: سنٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔

جواب: اس سلسلے میں راقم التحریر کے پاس کوئی مستند اعداد و شمار نہیں ہے۔ اس ضمن میں باضابطہ سروے کی ضرورت ہے۔ کلکتہ میں Institute of objective studies کے ڈائرکٹر تھے پتہ نہیں یہ شعبہ زندہ ہے یا مر گیا۔ ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

سوال 24: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح کی مدد لی جا سکتی ہے؟

جواب: اوپر لکھے گئے سوال نمبر 23 اور 25 کے تحت انھیں اعداد و شمار جمع کرنے کی ذمے داری دی جا سکتی ہے:

- غیر اردو دانوں کے لیے کلاس قائم کرنا۔
- گھر تعلیم جس کا ذکر اوپر آیا اس کی تنظیم و تعمیر میں مدد لینا۔
- جس ریاست میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہے وہاں بلاک لیول پر یہ نگاہ رکھنا کہ وہاں اردو زبان میں کام ہوتا ہے کہ نہیں اور اس سلسلے میں کسی تعصب یا کم نگاہی تو نہیں برتی جاتی ہے۔

■

Noorul-Hoda
9H/5, Alimuddin Apts
Kolkata - 700016 (WB)
Mob.:09903778757

برج نرائن چکبست کی شاعری میں
حب الوطنی کے عناصر

ممتاز احمد خاں

اردو زبان میں ابتدا سے ہی بلکہ زمانۂ آفرینش سے جمہوری اور انسانی اقدار کی پیش کش پائی جاتی ہے۔ اس زبان نے ہمیشہ سماج میں مثبت اقدار اور اخلاقی و انسانی تعلیمات کے ذریعے کلچر کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ اردو کا سارا ادبی وشعری سرمایہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس میں ہندوستانی کلچر کے بہترین عناصر کی شرکت وشمولیت ہے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اعلیٰ انسانی قدروں کی ہر دور میں تبلیغ کی ہے۔ اردو خود مشترکہ کلچر کی پیداوار ہے۔ ہندایرانی کلچر کے خوبصورت عناصر و اجزا سے اس کی تشکیل ہوئی ہے اور اس کی شاعری اور ادب کی آبیاری میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں بلکہ تمام ہندوستانیوں کا حصہ ہے۔ ولی، میر، سودا، درد، آتش، ناسخ، ذوق، غالب، مومن، داغ، انیس، اقبال، فیض، شاد عظیم آبادی، جوش اور حسرت موہانی کے متوازی اور پہلو بہ پہلو دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم، رگھوپتی سہائے فراق، پنڈت دتاتریہ کیفی، آنند نرائن مُلّا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، کرشن موہن، رام لعل، جوگندر پال، آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، بلراج کومل وغیرہ کے نام آسمانِ ادب پر روشن ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ چنانچہ اردو شاعری اور ادب سے معاشرے میں ہمیشہ امن اور شانتی، محبت واخوت، انسانی ہمدردی، انصاف و عدل، مساوات اور قوانین کی پابندی و پاسداری کی فضا پیدا ہوئی ہے۔

معاشرے کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور باہمی تعلقات میں رواداری، تعاون اور خوش خلقی کو فروغ ہوا۔ ہندوستان کی پانچ چھ سو سال کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ سماج کے ہر طبقے کے افراد نے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا اور صدیوں سے بھائی چارے کے ماحول میں زندہ رہنے کی مثال قائم کی۔ ایسی رواداری اور پُرامن ماحول دنیا میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے کو ملے گا۔ اردو کے جید ادیب و مصر علی جواد زیدی نے اردو کی اسی خصوصیت پر مندرجہ ذیل لفظوں میں روشنی ڈالی ہے۔

"یہ کہنا ایک حقیقت کو دُہرانا ہے کہ خود زبان اردو یک جہتی کی پیداوار ہے۔ ابتدا سے اس میں ہماری رنگا رنگ تہذیب کی گنگا جمنی خصوصیات جھلکتی رہی ہیں۔ اس میں سنسکرت نے اپنا رس گھولا ہے، برج بھاشا، کھڑی، اودھی، مراٹھی، گجراتی، تیلگو، بنگالی، سندھی، پنجابی، پشتو، فارسی، ترکی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، پُرتگالی، لاطینی، یونانی، چینی اور روسی نے اپنا بانکپن اور اپنی عظمت و وسعت سموئی ہے۔ یہ ہر تبدیلی اور انقلاب کی خاموش شاہد ہی نہیں بلکہ اچھائیوں کو سمیٹنے اور اندرونی کثافتوں کو دور کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ و تیار رہی ہے۔ آج بھی کشادہ دامنی سے لبیک کہہ رہی ہے اور نئے پھولوں کے لیے اپنے دامن میں جگہ بنا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا الگ مزاج ہے، وہ مزاج جو مختلف روایات کے امتزاج سے بنا ہے اور جو رُکنے اور تھمنے کے بجائے آگے بڑھتا ہے، جو مسلسل ارتقا پر ایمان رکھتا ہے، جو ترقی کی کسی شکل کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ ان معنوں میں اردو کی تاریخ یک جہتی کی تحریک کی تاریخ بھی ہے۔"

(مضمون 'اردو میں یک جہتی کی روایت'، مشمولہ ماہنامہ شاعر، بمبئی، قومی یک جہتی نمبر، ص 144)

اردو شاعری کا ابتدائی دور دکن سے شروع ہوتا ہے۔ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں ہندوستانی عناصر اور قومی یکجہتی کے اجزا وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعد ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، فائز دہلوی او دیگر شاعروں کے یہاں یہ روایت پھلتی پھولتی اور فروغ پاتی ہے۔ قومی یک جہتی اور ہندوستانی طرزِ احساس کی واضح اور طاقت ور عکاسی نظیر اکبرآبادی کے یہاں نظر آتی ہے۔ نظیر نے ہندوستانی معاشرت اور کلچر پر بے شمار نظمیں لکھیں جن کی کوئی مثال ہندوستان میں کسی اور زبان کے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ نظیر کی روایت کو محمد حسین آزاد، مولانا حالی، اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی اور برج نرائن چکبست نے پروان چڑھایا۔ میرے اس مقالے کا موضوع 'پنڈت برج نرائن چکبست کی شاعری' ہے، اس لیے میں اپنی گفتگو کو ذیل کی سطور میں چکبست کی شاعری تک ہی محدود رکھوں گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چکبست کی شاعری پر گفتگو سے قبل ان کی سوانح حیات مختصراً لکھ دی جائے۔ پنڈت برج نرائن چکبست فیض آباد کے ایک خوشحال کشمیری برہمن خاندان میں 1882 میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان بعد میں لکھنؤ آ کر آباد ہوگیا۔ ان کے والد پنڈت اُودِت نرائن چکبست بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا تخلص یقین تھا۔ چکبست کم عمری ہی سے بے حد ذہین اور مطالعے کے شوقین تھے۔ انھوں نے قانون کی تعلیم پائی اور لکھنؤ کے ممتاز وکلا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے اساتذۂ اردو کے کلام کا بہت وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شعر کے رموز و نکات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ شرر لکھنوی سے 'گلزارِ نسیم' کے موضوع پر ان کا معرکہ بہت مشہور ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس معرکے میں چکبست کا پلّہ بھاری تھا۔ چکبست کا مجموعۂ کلام 'صبحِ وطن' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اور بعد میں 'کلیاتِ چکبست' کے نام سے ان کے کُل کلام کا مجموعہ بھی چھپ گیا۔ اس کلیات کو کالی داس گپتا رضا نے مرتب کیا تھا۔ پھر ان کی نثری تحریروں کا ایک مجموعہ 'مضامینِ چکبست' کے نام سے آیا۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے ان کی علمیت، قابلیت، تنقیدی شعور اور ادبی، سماجی و تاریخی حالات و واقعات پر ان کی نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ چکبست پر میرانیس کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ فراق گورکھ پوری کا خیال ہے کہ چکبست کی شاعری انیس کی انسان دوست شاعری (Humanistic Poetry) کی توسیع ہے۔ چکبست نے قومی وطنی نظمیں بڑی تعداد میں لکھی ہیں مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ صرف 44 یا 45/برس کی عمر میں فالج کے حملے سے انتقال کر گئے، ورنہ وہ بہت بڑے اور اچھے غزل گو بھی تھے۔ یہاں ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انھی اجزا کا پریشاں ہونا

———

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لیے چمن کی خزاں کیا، بہار کیا؟

———

بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زُنار کے جھگڑے
دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

تھکے ماندے مسافر ظلمتِ شامِ غریباں میں
بہارِ جلوۂ صبحِ وطن کو یاد کرتے ہیں

یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
مگر حُسنِ حیا پرور کا عالم اور ہوتا ہے

چکبست کی شاعری کی ابتدا ہی حُب الوطنی اور قومی ہمدردی سے ہوتی ہے۔ انھوں نے بارہ تیرہ سال کی عمر ہی سے شاعری شروع کردی تھی۔ ان کی پہلی نظم 'حُب قومی' کے عنوان سے ملتی ہے۔ یہ زمانہ 1894 کے آس پاس کا تھا۔ چکبست نے یہ نظم لکھنؤ کے ایک جلسے میں پڑھی۔ کم عمری میں ایسی نظم لکھنے پر ان کو بہت داد ملی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کا مذاقِ شعری پروان چڑھنے لگا اور ان کا مطالعہ و مشاہدہ بھی وسیع ہوا۔ ان کے کلام میں پختگی آنے لگی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہر طرف قومی ہمدردی اور حُب الوطنی کا چرچا تھا۔ سرسید اور حالی ہندوستانیوں کی تعلیم اور ترقی کا صور پھونک چکے تھے۔ ان کے بعد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ان کی آواز میں آواز ملائی۔ انگریزوں کی ظالمانہ حکومت، ہندوستانیوں کی ذلت ومحکومی سے تمام حساس فن کار وادیب دل برداشتہ تھے۔ اندر ہی اندر آزادی کی آرزو کروٹ بدل رہی تھی اور ہندوستانیوں کے آپسی اتحاد و اتفاق اور یک جہتی کی اہمیت سمجھ میں آرہی تھی۔ مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور یگانگت کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جانے لگی۔ ایسے دور میں اقبال، چکبست، جوش ملیح آبادی، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم نے حُب الوطنی کے گیت گائے اور اتحاد واتفاق کی تعلیم کو اپنی شاعری سے عام کرنے کی کوشش کی۔ چکبست نے 'خاکِ ہند' کے عنوان سے جو نظم لکھی، وہ اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم کے صرف دو بند ملاحظہ ہوں ۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب وزینت، کیا اَوجِ عزّ وشاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی
اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین وعرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سر زمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کُہن میں

اس نظم میں بھی چکبست نے ہندوستان کے مشترکہ کلچر اور روایات کا ذکر خوب صورت انداز میں کیا ہے ۔

اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

چکبست نے اپنے قومی و وطنی جذبات کا اظہار موثر انداز میں کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں جذبے کا خلوص، زبان کی فصاحت اور فن کی چابک دستی بھی ہے۔ اس نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو

شیدائے بوستاں کو سَرو وسَمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گُل مبارک، گُل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

چکبست نے اپنے زمانے کے کئی قومی لیڈروں کی موت پر جو مرثیے لکھے، ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ نوجوانوں میں اعلیٰ انسانی واخلاقی خوبیاں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ گوکھلے، تلک اور گنگا پرساد ورما کی موت پر ان کے جو مرثیے ہیں، وہ زبان و بیان، اندازِ خطاب اور اخلاقی خوبیوں کی تعریف و تحسین کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔ ان کو پڑھنے سے حب الوطنی، کشادہ نظری اور خدمتِ قومی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے مرثیوں اور نظموں کی فنی سطح اونچی نہیں ہوتی مگر ایسے مرثیوں اور نظموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرتی زندگی میں شاعری سے تعلیم وتربیت اور جوش وولولہ کو اُبھارنے کے لیے ایسے شعری اقتباسات بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ صرف اردو میں نہیں، دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ایسی تخلیقات وجود میں آئی ہیں۔

چکبست کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کا وژن (Vision) وسیع تھا۔ وہ تنگ دلی اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔ مختلف طبقات اور افراد میں باہمی محبت واُخوت کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی ان کا یہ نقطۂ نظر صاف نظر آتا ہے۔ پروفیسر منظر اعجاز نے ان سے متعلق لکھا ہے:

''چکبست مظاہر کے حُسن میں حقیقت کے جمال کا پرتو دیکھتے ہیں اور فطرت وانسانیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ چکبست دنیا کو ایک گھر یا کنبہ تسلیم کرتے ہیں اور پرستشِ وفا کو ہی انسانیت کی معراج تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کعبہ وبت خانہ میں کوئی فرق نہیں بشرطیکہ وفا قدرِ مشترک ہو۔ یہی وہ اخلاقی نکتہ ہے جس پر چکبست مذہبی رواداری، وسیع المشربی، مساوات اور اُخوت جیسے قدری عناصر کو سمیٹ کر انسانیت کے معیار کی تعمیر وتشکیل کرتے ہیں۔''

(اقبال اور قومی یک جہتی، ص 217)

چکبست کے اس نقطۂ نظر کو اُجاگر کرنے کے لیے ان کی دو نظموں کے مندرجہ ذیل بند پیش کیے جاتے ہیں۔

(الف) شرابِ اُنس حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا، کوہ تھا، چشمہ تھا یا یہ مشتِ غبار
درخت وکوہ ہیں کیا، ذاتِ پاک انساں کیا
طیور کیا ہیں، ہوا کیا ہے، ابرِ باراں کیا
یہ موجِ ہستیٔ بیدار کے عناصر ہیں
سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں

(ب) ہر ذرّۂ خاکی ہے مرا مونس و ہمدم
دنیا جسے کہتے ہیں وہ کاشانہ ہے میرا
جس جا ہو خوشی، ہے وہ مجھے منزلِ راحت
جس گھر میں ہو ماتم وہ عزاخانہ ہے میرا
جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

یہاں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ چکبست اور ان کے جیسے دوسرے شاعر وفن کار کے یہاں قومی یک جہتی کا محدود تصور نہیں ہے۔ یہ فنکار ملک اور قوم کی سطح اور دائرے سے اوپر اُٹھ کر دنیا کے تمام انسانوں کے لیے امن وسلامتی اور خوشحالی کا جذبہ رکھتے ہیں اور ہر قوم کی ترقی اور ہر انسان کی عزت و عافیت اور امن و سلامتی کی تمنا کرتے ہیں۔ چکبست اور ان کے قبیل کے دیگر شعرا ومفکرین یہ مانتے ہیں کہ انسان کو رنگ ونسل، مذہب وزبان اور خطّے میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ سب کی انسانی حیثیت یکساں ہے۔ سب عزت واحترام، آزادی و مساوات، امن و سلامتی کے مستحق ہیں۔ انسانوں اور انسانی گروہوں سے امتیازی برتاو آپسی دشمنی اور منافرت کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ سارے عالم کے انسانوں کو وحدتِ آدم اور احترامِ آدمی کی تعلیم سے مزیّن کرنا چاہیے۔ جب ہی یہ دھرتی امن وسکون اور محبت و اُخوت اور تہذیب وتمدن کا حقیقی گہوارہ بن سکتی ہے۔ اقبال نے بہت پہلے ہی کہہ دیا ہے ۔

شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

■

Dr. Mumtaz Ahmad Khan
Sajida Manzil, Baghmali
Hajipur - (Bihar)
Mob.:09852083803

محمد عادل

اردو غزل میں قدرتی آفات

جب سے انسان کا وجود اس روئے زمین پر ہے اس نے مختلف مواقع پر بہت سی قدرتی آفات کا سامنا کیا ہے گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اور قدرتی آفات کا تعلق بہت پرانا ہے۔ جب انسان اس دنیا میں آیا اور اپنے ماحول سے آشنا ہوا تو اس نے اپنے اطراف میں ہونے والی تبدیلیوں کا تجزیہ کیا تو قدرتی آفات کے باعث رونما ہونے والی تبدیلیوں نے اسے حیرت و تجسس کے دریا میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کر دیا۔

ماہرین کے مطابق صدیوں سے وقتاً فوقتاً رونما ہونے والی قدرتی آفات انسان اور اس کے گرد و پیش کے لیے خطرناک ثابت ہوئی ہیں۔ دراصل قدرتی آفات کسی بھی قدرتی خطرے جیسے سیلاب، طوفان، آتش فشاں، زلزلے، جنگل میں آگ، باڑ، سنامی وغیرہ جیسے اثرات کا نام ہے، جو ہمارے قدرتی ماحول پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ جس سے نہ صرف ہمارے قدرتی وسائل کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ جان و مال کی بھی بربادی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اقدام کے بارے میں سوچے جن کے باعث وہ خود کو اور کائنات کو ان قدرتی آفات سے محفوظ رکھ سکے یا ان کے نقصانات کم سے کم ہوں۔

ہر سال دنیا بھر میں 18 اکتوبر کا دن قدرتی آفات کے طور پر منایا جاتا ہے تاکہ لوگوں میں اس سے متعلق معلومات فراہم کراتے ہوئے یہ شعور بیدار کیا جائے کہ کسی بھی مشکل یا قدرتی آفات کے موقع پر ایک انسان کیا عمل انجام دے اور جان و مال کی کس طرح حفاظت کر سکے۔ دنیا بھر کے سائنسدانوں نے اس پر تحقیق کر کے ان آفات کی وجوہات کے بارے میں معلومات حاصل کی ہے اور لوگوں کو اس سے آشنا کرایا ہے۔ اسی طرح ہر بڑا ادیب اور شاعر جو انسانیت کا محافظ ہوتا ہے اور ماحول اور معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے وہ بھی اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو ان قدرتی آفات سے واقف کراتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر ادب میں ان آفات کی حقیقی ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگر ہم اردو غزل کی بات کریں تو اس کے دامن میں بہت سے ایسے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں واضح طور پر ان آفات کا ذکر ملتا ہے۔ مثال کے لیے کچھ قدرتی آفات کا ذکر پیش کیا جاتا ہے جنھیں شعراء نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

زلزلہ (Earth quake)

دنیا کے وجود میں آنے سے لے کر دور حاضر تک زلزلہ آنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ہماری زمین مختلف سطحوں سے مل کر بنی ہے۔ زلزلہ زمین کی سطح کے اچانک ہل جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ زلزلہ کے دوران زمین میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور تیز جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں کے مطابق زمین کے آخری حصے کے اندر گرمی کی وجہ سے وزن والی چیز زمین کے نیچے جاتی ہے اور جس چیز کا وزن کم ہوتا ہے وہ زمین کے اوپر آ جاتی ہے جیسے اگر پانی کے اوپر تیل ڈالا جائے تو وہ پانی کی سطح پر آتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی چیز زمین کے نیچے جاتی ہے تو اس کی وجہ سے ایک کرنٹ پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے زمین کی پلیٹیں آپس میں ٹکراتی ہیں جس کی وجہ سے زلزلے آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ زمینی سطح پر بہت سی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی ہیں۔ مثلاً زمین میں شگاف پیدا ہونا، مٹی کا دھسنا، ہمارے ملک کے ہمالیہ اور دیگر پہاڑی سلسلے ہندوستان کی پلیٹ چین اور یورپ کی بڑی پلیٹوں سے ٹکرانے کے سبب وجود میں آئے ہیں۔ زلزلے کی شدت کو ناپنے کے لیے "Seismograph" کا استعمال کیا جاتا ہے۔ زلزلہ آنے سے گھر، مکان، عمارتیں، پل، سڑک ٹوٹ جاتے ہیں، عمارتوں میں دبنے سے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی موت ہو جاتی ہے۔ 26 جنوری 2001 میں گجرات میں زبردست زلزلہ آیا جس میں 20000 سے زیادہ لوگوں کی جانیں گئیں۔ اپریل 2015 میں نیپال میں زبردست زلزلہ آیا جس میں 8000 سے زیادہ لوگ مارے گئے اور 2000 سے زیادہ زخمی ہوئے۔

زلزلہ آنے سے انسانی ماحول، اس کی زندگی اور نفسیات پر بھی گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اور جب کوئی حساس شاعر اس تکلیف سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی ترجمانی اپنی تخلیقات میں کرتا ہے۔ اردو غزل میں زلزلہ سے متعلق اشعار دیکھیں۔

زلزلہ آیا تو دیواروں میں دب جاؤں گا
لوگ بھی کہتے ہیں یہ گھر بھی ڈراتا ہے مجھے

(اختر ہوشیارپوری)

تم جسے بانٹ رہے ہو وہ ستم دیدہ زمیں
زلزلہ آئے گا کچھ ایسا کہ پھٹ جائے گی

(عارف عبدالمتین)

زندگی جس کی اجڑ جاتی ہے اس سے پوچھو
زلزلہ شہر میں آتا ہے چلا جاتا ہے
(ہاشم رضا جلال پوری)

زلزلہ آیا مکاں گرنے لگا
نیند میں اک خواب داں گرنے لگا
(شائلہ بہزاد)

آتش فشاں (Volcano)

آتش فشاں میں زمین کے اندر سے گرم لاوا، راکھ، گیس نکلتی ہے۔ یہ زوردار آواز کے ساتھ اوپر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو دھیرے دھیرے بھی ہوسکتا ہے اور تیزی سے بھی عمل میں آسکتا ہے۔

آتش فشاں کے پھٹنے کے بعد پرندوں اور جانوروں کی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے، پرندے اس سے نکلنے والی آگ، دھوئے اور گرمی سے مرجاتے ہیں۔ جنگلات میں آگ لگ جاتی ہے۔ انسانی بستیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ اردو غزل میں آتش فشاں سے متعلق بہت سے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں مثلاً

ٹھٹھر گیا ہے بدن سب کا برف باری سے
دہکتا کھولتا آتش فشاں تلاش کرو
(اسعد بدایونی)

جانے لاوا سلگ اٹھے کس وقت
دل کہ آتش فشاں ہے کھیل نہیں
(شفیق دہلوی)

پھٹا مجھ میں پھٹا آتش فشاں پھر
ہیں سینے میں دھماکوں پر دھماکے
(شمیم عباس)

یہ خوف ہے کہیں آتش فشاں نہ بن جائے
ہمارے پاؤں کے نیچے دبا ہوا سا کچھ
(راشد جمال فاروقی)

غم کا اک آتش فشاں تھا اور میں
دور تک گہرا دھواں تھا اور میں
(کبیر اجمل)

کیا جانے کس مقام سے لاوا ابل پڑے
آتش فشاں زمیں پہ سفر کر رہے ہیں ہم
(ناصر شکیب)

جنگل کی آگ (WildFire)

جنگل کی آگ وہ آگ ہے جو جنگل کے درختوں یا کسی غیر آبادی والے ہرے بھرے علاقے میں قدرتی طور پر بھڑ کنے لگے۔ ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ عام طور پر گرمی کے موسم میں جنگلوں میں بہت خطرناک آگ لگ جاتی ہے۔ اس کے پیچھے انسانی اور قدرتی عوامل دونوں ہوسکتے ہیں۔ کئی بار انسان کی لاپرواہی سے بھی جنگل میں آگ لگتی ہے۔ جب انسان جنگل کے اطراف میں کہیں آگ جلاتا ہے اور اس کو بجھانا بھول جاتا ہے جس کے سبب دھیرے دھیرے جنگل میں آگ پھیل جاتی ہے اور وہ ایک خطرناک روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ سورج کی گرمی کی وجہ سے سوکھی پتیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور پورا جنگل اس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کے اترا کھنڈ صوبے میں واقع چیڑ کے جنگلات میں اسی قسم کی آگ دیکھنے کو ملتی ہے۔ جنگل کی آگ کے بہت برے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جس سے ہمارا قدرتی ماحول بھی بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں میں یہ ایک بڑی تباہی کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس طرح کے واقعات دنیا بھر میں دیکھنے کو ملے ہیں۔ مثلاً 'انٹار کٹکا' اور دیگر براعظم میں پیش آئے واقعات اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے سبب ہمارے قدرتی ماحول، انسانی جان و مال، جنگلی جانوروں، پرندوں، پیڑ پودوں کے تباہ ہونے کا خطرہ کافی بڑھ جاتا ہے۔ اردو غزل کے منفرد اشعار میں اس کی بڑی دلچسپ ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے۔

آبادیوں کی خیر منانے کا وقت ہے
جنگل کی آگ پھیل رہی ہے ہوا کے ساتھ
(سرشار صدیقی)

ڈھونڈیں گے اب پرندے کہاں شام کو پناہ
جنگل کی آگ کھا گئی سب ڈالیاں درخت
(پروین کمار اشک)

تیرے گھر تک آچکی ہے دور کے جنگل کی آگ
اب ترا اس آگ سے ڈرنا بھی کیا لڑنا بھی کیا
(وزیر آغا)

تمام شہر میں جنگل کی آگ ہو جیسے
ہوا کے دوش پہ اڑتی ہوئی خبر تھا میں
(جمنا پرشاد راہی)

کون اس کو جلانے والا تھا
اپنی ہی آگ میں جلا جنگل
(شین کاف نظام)

بجلی گرنا یا برق کا گرنا (Lightening)

اکثر بجلی بارش کے موسم میں آسمان سے زمیں پر گرتی ہے۔ ماہرین کے مطابق ہر سال دنیا بھر میں 24000 لوگ آسمانی بجلی گرنے سے موت کے شکار ہوجاتے ہیں۔ آسمان میں مخالف سمتوں میں جاتے ہوئے بادل جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو رگڑ پیدا ہوتی ہے جس سے بجلی بنتی ہے۔ اردو غزل میں بجلی گرنے کے عمل سے متعلق بہت سے اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہم دم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
(غالب)

برق کا آسماں پر ہے دماغ
پھونک کر میرے آشیانے کو
(مومن خاں مومن)

کیا نہیں یاد برق کا گرنا
پھر بناتا جو آشیاں ہوں میں
(میر مہدی مجروح)

ظالم خدا سے ڈر کہیں بجلی نہ گر پڑے
مشکل بہت ہے گرنا اگر آسمان کا
(اطہر نادر)

بلا سے برق گری میرے آشیانے پر
اندھیری رات کے رہرو کو روشنی تو ملی
(اولاد علی رضوی)

برق تھی بیتاب میرے آشیانے کے لیے
ابر سے بھی بیشتر آئی جلانے کے لیے
(خواجہ محمد وزیر لکھنوی)

برق تھی گر گئی شخص تھا جل گیا
دیر تک راکھ سے آنچ آتی رہی
(گل افشاں)

برق گرتی ہے تو خرمن کو جلا جاتی ہے
کب اسے محنت دہقاں کی خبر ہوتی ہے
(انوار الحسن انوار)

آندھی (Storm)

گرم اور خشک موسم کے دوران میدانی علاقوں میں بڑی ہی طوفانی اور تلاطم خیز ہوائیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایسی ہواؤں کو آندھی کہا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ اپنے ساتھ گرد و غبار لے کر چلتی ہیں تو ان کے لیے انگریزی میں ایک خاص قسم کی اصطلاح Dust Storm کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جب یہ سیاہ رنگ کے گرد و غبار کے بادل لے کر چلتی ہیں تو اس کو 'سیاہ آندھی' کہا جاتا ہے۔ اور جب زرد رنگ کے گرد و غبار کے بادل کے ساتھ چلتی ہے تو 'زرد آندھی' کہتے ہیں۔ 'سیاہ آندھی' آنے پر سب جگہ گھنا اندھیرا چھا جاتا ہے اور 'زرد آندھی' آنے پر ماحول زرد رنگ میں رنگا نظر آتا ہے۔ ہواؤں کی رفتار بہت تیز ہوجاتی ہے۔ ہر جگہ

ریت ہی ریت نظر آتی ہے۔ایسی آندھی آنے سے درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں،فصلیں برباد ہوجاتی ہیں،بجلی کے تار اور کھمبے ٹوٹ جاتے ہیں،مکانات اور عمارات کوبھی نقصان پہنچتا ہے۔بڑے پیمانے پرلوگوں کو جان ومال کا خطرہ اٹھانا پڑتا ہے۔یہ طوفانی ہوائیں بڑے طویل فاصلے طے کرتے ہوئے چلتی ہیں۔ماہرین کے مطابق یہ فاصلے دو سے ڈھائی ہزار میل تک ہو سکتے ہیں۔مغربی افریقی ممالک میں چلنے والی خشک اور ریتلی آندھی کو'ہرمٹن' (Harmattan) کہا جاتا ہے۔یہ آندھی دنیا کے سب سے بڑے ریگستان 'سہارا' کے اطراف میں چلتی ہے۔عام طور سے یہ آندھیاں نومبر کے آخر سے شروع ہوکر مارچ کے مہینے تک دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ آندھیاں اپنے ساتھ بڑے باریک مٹی کے ذرات لے کر چلتی ہیں جن کا حجم 0.5 سے 10 مائیکرومیٹر تک ہوتا ہے۔ان طوفانی ہواؤں کے اثرات انسانی بصارت کومتاثر کرتے ہیں۔کئی دن تک سورج کی روشنی زمین تک نہیں آپاتی ہے۔اس کے علاوہ انسان اور جانور ایک خاص قسم کی الرجی سے متاثر نظر آتے ہیں۔اب اس سے متعلق اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

آندھیاں تند درختوں کو اڑا لے جائیں گئیں
بس وہی شاخ بچے گی جو لچک جائے گی
(نامعلوم)

ہوئے ہیں سیہ بخت برباد لاکھوں
انھیں آندھیاں بارہا کالی کالی
(قدر بلگرامی)

آندھیاں بجلیاں شجر کمزور
بچ نہ پائے گا آشیاں تنہا
(رشید الظفر)

آندھیاں ہی اکھاڑتی ہیں اسے
آندھیوں میں ہی پیڑ پلتا ہے
(سیما شرما میرٹھی)

ایک تنکا بھی نہ چھوڑا گھر میں
تیز آندھی سی چلی ہو جیسے
(وحید چغتائی)

آئی تھی جس حساب سے آندھی
اس کو سوچو تو پیڑ کم ٹوٹے
(سوریا بھانو گپت)

مالک یہ دیا آج ہواؤں سے بچانا
موسم ہے عجب آندھی کے آثار ملے ہیں
(حکیم ناصر)

طوفان (Cyclone)

ہمارے ملک ہندوستان میں طوفان بنگال کی کھاڑی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ سمندر کی سطح پر ہوائی دباؤ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔تیز ہوائیں بارش کے ساتھ گھیرا بنا کر چلتی ہیں۔جوسمندری کناروں پر تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ان کی رفتار 280 km/h سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ہمارے ملک ہندوستان میں 1737 میں "Hooghly River Cyclone" آیا جس کے برے اثرات بنگلہ دیش اور کلکتہ میں دیکھنے کو ملے۔اس طوفان کے سبب تقریباً تین لاکھ افراد کی موت واقع ہوئی۔اس کے بعد 25 نومبر 1839 میں آندھرا پردیش میں آئے "Koring Cyclone" میں بیس ہزار سے زیادہ افراد کی موت ہوئی۔1999 اڑیسہ میں آئے 05B کے طوفان میں 15000 سے زیادہ لوگوں کی جانیں گئیں۔ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ جب بھی کہیں وسیع پیمانے پر کوئی طوفان آتا ہے تو اس کے برے نتائج ہمارے معاشرے کو جھیلنے پڑتے ہیں۔ان حالات کا پروردہ شاعر اپنی غزل میں طوفان کے موضوع کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

طوفان کر رہا تھا میرے عزم کا طواف
دنیا سمجھ رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے
(نامعلوم)

مٹی کے گھر ہی صرف نہیں باعث ملال
طوفان کی حدوں میں ہیں پکے مکان بھی
(عزیز خیرآبادی)

ایک ندی ہے کہ رکتی ہی نہیں
ایک طوفان اترتا جائے
(شین کاف نظام)

کوئی سناٹا سا سناٹا ہے
کاش طوفان اٹھادے کوئی
(ناصر زیدی)

وہ نہیں دیکھتے ساحل کی طرف
جن کو طوفان صدا دیتا ہے
(سیف الدین سیف)

مدو جزر (Tides)

چاند اور سورج کی ثقلی قوتوں اور زمین کی گردش کے مجموعی اثرات کی وجہ سے سمندری سطح کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔جس کے سبب مدوجزر پیدا ہوتے ہیں۔اسے عام زبان میں جوار بھاٹا بھی کہا جاتا ہے۔اس کے اثرات صرف سمندروں پر ہی مرتب نہیں ہوتے بلکہ ان سبھی چیزوں پر اس کا اثر ہوتا ہے جن پر وقت اور مقام کے ساتھ قوت ثقل لگتی ہے۔زمین،چاند،اور سورج کی قوت ثقل مدوجزر پیدا ہونے کی اہم وجہ ہیں۔اردوغزل میں اس موضوع سے متعلق اشعار دیکھیں۔

دریا کے مدوجزر بھی پانی کے کھیل ہیں
ہستی ہی کے کرشمے ہیں کیا موت کیا حیات
(فراق گورکھپوری)

مہتاب تو نکلا ہی نہیں ڈوب کے فاخر
لیکن مرے دریا میں وہی مدوجزر ہے
(احمد فاخر)

مجھ کو بھی علم ہے سب مدو جزر کا
میں بھی تو سب کے ساتھ انھیں پانیوں میں ہوں
(محسن زیدی)

بگولہ (Tornado)

طوفان گردوباد یا بگولہ ہوا کے طوفان کو کہتے ہیں یہ طوفان جو چکر کھاتے ہوئے بڑھتے ہیں اور کالے بادل کی طرح گھومتے ہوئے زمین کی طرف اترتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس میں ہوا کی رفتار 300 میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے۔اردوغزل کے شعراء نے اس موضوع کوبھی منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

جو دیکھیے تو بگولہ ہے ریگ آوارہ
جو سوچیے تو یہی آبروئے صحرا ہے
(رفعت سروش)

میں اک انساں ہوں یا سارا جہاں ہوں
بگولہ ہے کہ صحرا جارہا ہے
(احمد ندیم قاسمی)

ترا غبار زمیں پر اترنے والا ہے
کہاں تک اب یہ بگولہ تھکن چھپائے گا
(احسان دانش)

اب مری تنہائی کم ہو جائے گی
اک بگولہ مل گیا ہے دشت میں
(بلوان سنگھ آذر)

یک بیک ہوگیا اوجھل وہ نظر کے آگے
دھند کا ایک بگولہ سا اُٹھا تھا کیا تھا
(حسرت دیوبندی)

بھنور (Whirlpool)

عام طور سے بھنور سمندر میں مدو جزر پانی کا ایک چکردار حصہ ہوتا ہے۔زیادہ تر بھنور زور دار نہیں ہوتے ہیں۔لیکن اگر کبھی بہت شدید اور زوردار بھنور آتا ہے تو اس کے لیے انگریزی میں Maelstroms کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہیں جو عمومی طور سے کم ہی آتے ہیں۔

بھنور آنے پر سمندر میں بڑی اتھل پتھل دیکھنے کوملتی ہے۔ اس دوران ملاح جن کی زندگی کا دارومدار سمندر کی مخلوقات پر ہوتا ہے بری طرح متاثر ہوتے ہیں ان کی کشتیاں اور پانی کے جہاز اس بھنور میں پھنس کر ڈوب جاتے ہیں۔جس سے ان کو جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑ تا ہے۔اردو غزل میں بھنور سے متعلق اشعار دیکھیں:

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

(الطاف حسین حالی)

بھنور سے لڑو تند موجوں سے الجھو
کہاں جارہے ہو کنارے کنارے

(نامعلوم)

مرے اندر بھنور اٹھنے لگے تھے
سمندر سے بڑی وحشت ہوئی تھی

(یاسمین حبیب)

بھنور کا حکم ہے دریا پہ جاری
کنارے ناؤ سے کترا رہے ہیں

(ظفر صہبائی)

آ کے دکھلاؤں رقص پانی کا
اک بھنور اب بھی ناچتا ہوگا

(فیصل سعید ضرغام)

سیلاب (Flood)

کسی علاقے پر جب اچانک سے بہت زیادہ بارش ہو جاتی ہے تو پانی جگہ جگہ بھر جاتا ہے۔ایسے حالات میں سڑکیں، راستے، کھیت، ندی، نالے، سبھی جگہ پانی بھر جاتا ہے جس کے سبب سے سیلاب آتا ہے۔سیلاب آنے سے نشیبی حصے میں رہنے والے لوگ اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔فصلوں کو بہت نقصان ہوتا ہے۔زیادہ سیلاب آنے سے پرندے اور جانور پانی میں ڈوب کر مر جاتے ہیں۔لوگوں کا جینا دشوار ہو جاتا ہے۔ 2009 میں ممبئی میں خطرناک سیلاب آیا جس میں 5000 لوگ مارے گئے۔ اردو غزل کے شعراء نے سیلاب کے موضوع کو اپنے کلام کے ذریعے اس طرح پیش کیا ہے۔

بارش کا لطف بند مکانوں میں کچھ نہیں
باہر نکلتے گھر سے تو سیلاب دیکھتے

(شہریار)

ساحل کی بستیوں کا سارا گھمنڈ ٹوٹا
سیلاب نے طمانچہ جب تان کر دیا ہے

(فرحت احساس)

اس طرف شہر ادھر ڈوب رہا تھا سورج
کون سیلاب کے منظر پہ نہ رویا ہوگا

(انور مسعود)

بستی کے گھروں کو کیا دیکھے بنیاد کی حرمت کیا جانے
سیلاب کا شکوہ کون کرے سیلاب تو اندھا پانی ہے

(سلیم احمد)

بہا کر لے گیا سیلاب سب کچھ
فقط آنکھوں کی ویرانی بچی ہے

(شہزاد احمد)

کھیت جل تھل کردیے سیلاب نے
مرگئے ارمان سب دہقان کے

(افضل ہزاروی)

سنامی (Tsunami)

سنامی یعنی 'بندرگاہوں کی لہریں' سمندر کی سطح پر ہل چل، زلزلہ، زمینی درار پڑنے، زمین کی پلیٹیں ہلنے سے سنامی کی بے حد خطرناک لہریں پیدا ہوتی ہیں اس لہر کی رفتار 400 km/h تک ہوسکتی ہے۔لہروں کی اونچائی 15 m سے زیادہ ہوسکتی ہے۔سنامی کے وجہ سے بھاری جان و مال کا نقصان ہوتا ہے۔آس پاس کے علاقوں، سمندری کناروں، بندرگاہوں اور انسانی بستیوں کو یہ برباد کر دیتی ہے۔

26 دسمبر 2004 میں آئی سنامی نے نہ صرف ہندوستان بلکہ انڈونیشیا، شری لنکا کے ساتھ 14 ممالک کو متاثر کیا جس میں 2 لاکھ 30 ہزار لوگوں کی موت ہوئی۔

زلزلے آرہے ہیں دریا میں
خوف ہے پھر ہمیں سنامی کا

(ڈاکٹر ہلال نقوی)

کبھی بھنور تھی جو ایک یاد اب سنامی ہے
مگر یہ کیا کہ مجھے اب بھی تشنہ کامی ہے

(شمیم عباس)

شور کرتا ہے آج دریا کیوں
آگئی پھر یہاں سنامی کیا

(عادل فراز)

دو بدن آب آب کرنے کو
ایک سنامی اٹھی محبت کی

(وفا نقوی)

قحط (Famine/Drought)

قحط کے دوران کسی مقام پر کئی مہینوں سالوں تک بارش نہیں ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے زیرِ زمین پانی کی سطح تیزی سے نیچے گرنے لگتی ہے۔اس کی وجہ سے پیڑ پودے سوکھنے لگ جاتے ہیں، فصلیں برباد ہو جاتی ہیں، پینے لائق پانی کی کمی ہو جاتی ہے، درجہ حرارت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔پرندوں اور جانوروں کی زندگی بھی دشوار ہو جاتی ہے اور ان کی موت واقع ہونے لگتی ہے۔ایسے دشوار کن حالات میں کھانے پینے کے اشیاء کی کمی ہونے کی وجہ سے انسان بہت سی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق جنگلات کی کٹائی، بارش کا نہ ہونا، زیر زمین پانی کا حد سے زیادہ استعمال، ماحولیاتی آلودگی، قحط پڑنے کے اہم اسباب ہیں۔ اردو شعراء نے قحط کے موضوع کو اپنے اشعار میں بڑے پر اثر طریقے سے پیش کیا ہے۔

سب کے سوکھے ہوئے ہیں پیمانے
ہر طرف قحط آب ہو جیسے

(ڈاکٹر ہلال نقوی)

ہر طرف قحط آب تھا لیکن
ایک طوفان میرے اندر تھا

(شریف منور)

جو چاروں سمت گرانی کی ہے فراوانی
تو قحط بھی اسی بہتات سے نکلتا ہے

(ظفر اقبال)

قحط نے سارے گھر اجاڑ دیے
ایک جو بچ گیا ہے خالی ہے

(انعام کبیر)

الغرض اردو غزل میں قدم قدم پر منفرد انداز میں قدرتی آفات کا بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ موضوع ہے جس سے انسان کی زندگی ہر صدی میں متاثر ہوتی رہی ہے۔جب سے اس زمین کی تخلیق ہوئی ہے اور دور حاضر تک ان قدرتی آفات کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔اور خاص طور سے انسان کی بد عملیوں نے ان خطرات کے ہونے کے امکانات کو اور بڑھا دیا ہے۔انسان اپنے مفاد کی خاطر قدرتی ماحول سے کھلواڑ کر رہا ہے۔جس سے ہمارے ماحول میں ناگزیر تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اور جو کہیں نہ کہیں قدرتی آفات کے آنے کا سبب بنی ہیں۔ہمیں آج اس موضوع پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح ہم ان خطرات کے آنے کے امکانات کو کم کر سکتے ہیں۔اور کس طرح ان آفات سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں جس سے انسانی جان و مال کا خطرہ کم ہو سکے۔

■

Er. Mohd Adil
Hilal House, HNO: 4/114, Jagjeevan
Colony, Naglah Mallah, Civil Line
Aligarh - 202002 (UP)
Mob:09358856606

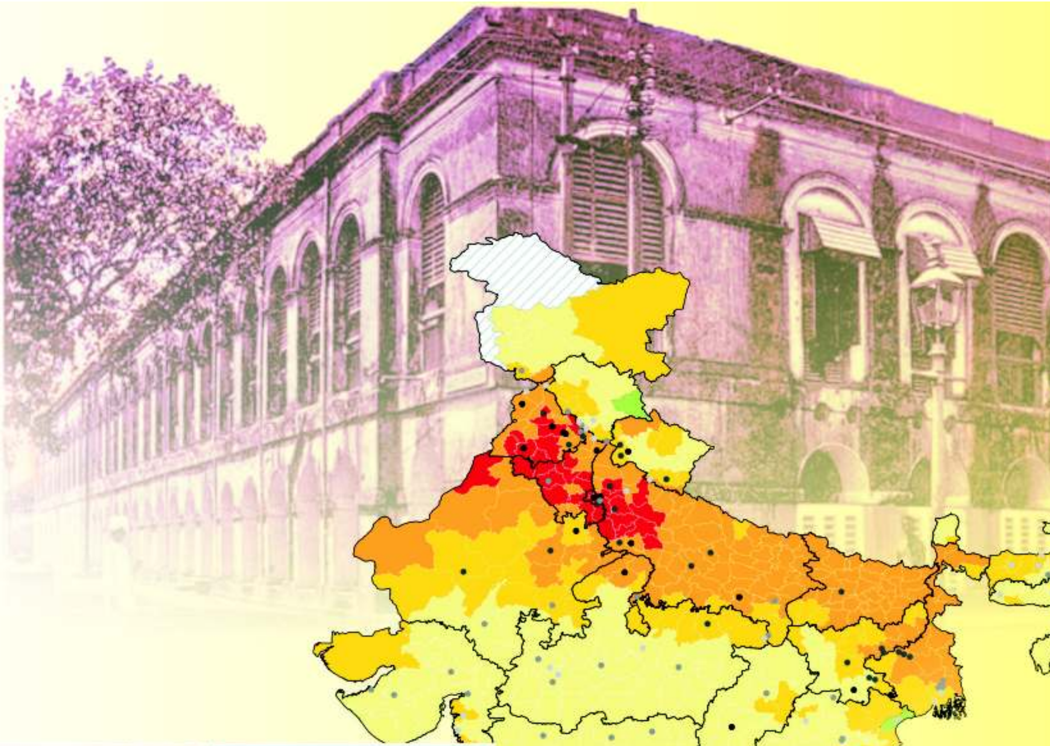

سعود عالم

اردو کی پہلی داستان اور شمالی ہند کی داستانیں ایک تنقیدی مطالعہ

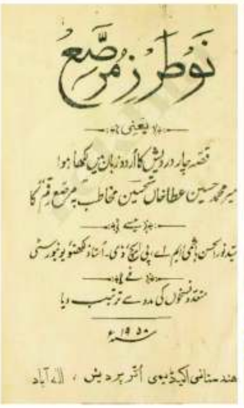

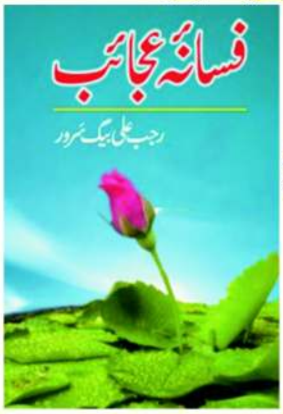

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کا اوّلین دور ادبی نثر سے معرا ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ اردو زبان کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نثری داستان کے علاوہ اردو زبان کی تمام اصناف کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ اگر ملا وجہی کی 'سب رس': 1635 کو اردو کی پہلی داستان مان لیا جائے تو وہ اردو کی پہلی داستان کہلائے گی ورنہ اردو کا باقاعدہ آغاز وارتقا دکن کے بجائے شمالی ہند تسلیم کیا جائے گا۔ اردو کے مشہور محقق ونقاد پروفیسر گیان چند جین اپنی کتاب 'اردو کی نثری داستانیں' میں 'سب رس' سے متعلق یوں گویا ہیں کہ ''سب رس ایک نیم عارفانہ تمثیل ہے۔ اسے پڑھتے وقت ہم اس کے کرداروں کو محض اشخاص کا قصہ نہیں سمجھتے بلکہ مجاز کے پردے دور کر کے ان کے معنی کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے سب رس اس معنی میں داستان نہیں جن معنوں میں چار درویش یا طلسم ہوشربا داستانیں ہیں۔''[1] وہ مزید لکھتے ہیں: ''بہر حال 'سب رس' کو افسانہ گوئی کا شاہکار بھی سمجھ لیا جائے تو بھی اس کے علاوہ دکن میں اور کوئی ایسی داستان نہیں جس میں ادبیت کے پھول کھلے ہوں۔''[2] اس قول سے واضح ہوجاتا ہے کہ اردو کی ابتدائی اصناف مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل وغیرہ کے برخلاف اردو داستان پوری کی پوری دکن کے بجائے شمالی ہند کی مرہونِ منّت ہے۔ دکن میں داستان کا فقدان نثر کے فقدان کا ہم نشیں ہے۔ اس کی شیر خوارگی خانقاہ میں گزری جس کے بعد دربارِ شاہی نے اس کی سرپرستی کی۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی ابتدائی نثر صوفیائے کرام کے مذہبی رسالوں تک محدود ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے زمانے میں اردو نثر کے راستے میں ایک موڑ ایسا بھی آیا تھا کہ اس کی بھرپور آبیاری ہوسکتی تھی لیکن یہ حضرات خود شاعر تھے اور ان کے پاس شعرائے اردو سے بزم سلطانی آراستہ کرنے کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، اس لیے یہ حضرات بھی ان سے محض اپنی محفلیں گرمانے کا کام لینا چاہتے تھے۔ تو بھلا ایسے میں نثر کی ترویج وترقی کیسے ممکن تھی؟

شاعری کے مقابلے نثر کی تنزلی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ نثر میں وہ رنگینی، وہ تڑپ، وہ برجستگی کہاں جو شاعری کی مرصع سازی میں ہوتی تھی۔ شاعری میں مسند اور اَورنگ کا دل موہ لینے کا ہنر تھا برخلاف نثر کے کہ اُس میں نہ وہ رعنائیاں تھیں اور نہ وہ عشوہ طرازیاں۔ نتیجتاً دکن میں اردو نثر بالکل نظر انداز کردی گئی۔ اور وہ وہاں پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے سے قاصر رہی بالآخر نثر نے بجائے دکن کے شمالی ہند میں اپنا راستہ ہموار کیا اور شمالی ہند کے اُدبا نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی بھرپور ترویج واشاعت کی۔ اس سے پہلے کہ آپ شمالی ہند کی نثری تاریخ سے روشناس ہوں آپ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شمالی ہند میں داستان کی ابتدائی ترویج میں نہ شاہ صاحبان کا ہاتھ ہے نہ بادشاہ صاحبان کا، چند لوگوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو گنتی کے چند گروہ باقی رہ جائیں گے۔ اس لحاظ سے داستان کے فروغ میں جس تحریک کی سب سے زیادہ اہمیت رہی ہے، وہ فورٹ ولیم کالج ہے اور وہ بھی بہت دنوں تک نہ چل سکی۔

فورٹ ولیم کالج کے تحت اردو کی کئی شاہکار داستانیں منظر عام پر آئیں۔ اس کے اچھے نثر نگاروں میں میر امن

دہلوی مانے جاتے ہیں۔ کلکتہ میں میر امن کے ساتھ کام کرنے والوں میں میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، مظہر علی ولا، مرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت کے حامل میر امن دہلوی ہیں جنھوں نے 'نوطرز مرصع' کا ترجمہ 'باغ و بہار' کے نام سے کیا جو خالص دہلوی زبان پر مبنی ہے۔

باغ و بہار کی تاریخی اہمیت وافادیت کو جاننے سے قبل ضروری ہے کہ اس کے مرجع ومصدر کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کر لی جائے، جس کی اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت ہے اور وہ رہتی دنیا تک برقرار رہے گی۔ اس کے بعد شمالی ہند کی داستانوں کا مختصراً تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔ لہٰذا ایسے میں سب سے پہلے بات 'نوطرز مرصع' کی ہوگی۔

'نوطرز مرصع' اٹھارویں صدی کی سب سے اہم اردو داستان ہے۔ جس کے مؤلف میر محمد حسین عطا خاں معروف بہ تحسین ہیں۔[3] یہ داستان اٹھارہویں صدی کے آخری دور ہے میں لکھی گئی تھی۔ تحسین نے خود واضح کر دیا ہے کہ وہ داستان لکھ کر نواب شجاع الدولہ (المتوفی: 1775) کے حضور میں پیش کرنا چاہتا تھا کہ حیات مستعار نے نواب سے دغا کی۔ بعدہ اس قصہ کو نواب آصف الدولہ (المتوفی: 1797) کے حضور میں پیش کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تحسین نے اس کتاب کو اٹھارویں صدی کے آخری دور ہے میں لکھا تھا۔ ہم یہاں پر توثیق کے لیے دونوں کے مقدمہ سے ایک ایک حوالہ پیش کریں گے جس سے اس کے استناد میں مزید پختگی آئے گی۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی 'نوطرز مرصع' کے مقدمہ میں اس کی سنہ تالیف کی تصدیق کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

"ڈاکٹر سجاد نے لندن کی لائبریریوں میں ڈوب کر نہ صرف جنرل اسمتھ کا پتا چلایا بلکہ اس کے سفر کلکتہ کا زمانہ 1768 بھی معلوم کرلیا۔ اس سے یہ طے ہو جاتا ہے کہ "نوطرز مرصع کی داغ بیل 1768 میں پڑ چکی تھی۔ تکمیل 1775 میں ہوئی ہوگی۔"[4]

جبکہ 'باغ و بہار' کے مرتب مولوی عبدالحق اپنے مقدمے میں اس کی سنہ اشاعت سے متعلق کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"غرض نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد انھوں نے یہ کتاب نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون کی۔ نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی 1775 میں ہوئی۔ اس وقت یہ کتاب ختم ہو چکی تھی۔ یعنی اس کی تالیف باغ و بہار سے تخمیناً 30-25 برس پہلے ہوئی تھی۔"[5]

متذکرہ بالا دونوں محققین ومدونین کے بیان کما حقہ ایک جیسی تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے تمام طرح کے شکوک وشبہات کی گنجائش رفع ہو جاتی ہے۔

اب جہاں تک اس داستان کے منصۂ وجود پر آنے کا سوال ہے تو اس سے متعلق خود تحسین نے لکھا ہے کہ وہ جنرل اسمتھ کی رفاقت میں دریائے گنگ میں بہ سواری کشتی کلکتہ جا رہے تھے۔ راستے میں ایک عزیز نے یہ داستان شروع کی۔ تحسین کو خیال ہوا کہ اس داستان بہارستان کو اردو میں لکھنا چاہیے۔ چنانچہ اس کا ابتدائی حصہ کشتی ہی میں سپرد قلم کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ مبارز الملک، افتخار الدولہ، جنرل اسمتھ بہادر صولت جنگ سالار فوج انگریزی کی ہمراہی میں، بجرے پر کلکتے کا سفر درپیش آیا۔ خالی بیٹھے بیٹھے دل گھنے لگا، تو ایک عزیز نے جو ہمراہ تھا، یہ قصہ سنانا شروع کیا۔ بہت پسند آیا اور اسی وقت سے 'زبان ہندی' میں لکھنے کی دھن لگ گئی "کیونکہ سلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہ ہوا۔" چنانچہ اسی خیال سے لکھنا شروع کیا۔"[6]

'نوطرز مرصع' جس وقت لکھی گئی اس وقت اردو نثر کو علمی درجہ نصیب نہ تھا۔ 'نوطرز مرصع' کے تقریباً پون صدی بعد تک اردو کے شعرا اُردو نثر کو سرمایۂ ننگ سمجھتے تھے جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا کہ ملا وجہی کی 'سب رس' [جو کہ تمثیلی نثر پر مبنی ہے] کو چھوڑ کر اردو نثر کی مکمل داغ بیل شمالی ہند میں انیسویں صدی کے آغاز میں ڈالی گئی۔

تحسین نے 'نوطرز مرصع' میں جا بجا اردو کے مستند شعرا بالخصوص خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا وغیرہ کے اشعار داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور بیشتر جگہوں پر اپنے کہے ہوئے اشعار شامل کیے ہیں۔ انھوں نے محض ایک دو اشعار پر اکتفا نہیں کی بلکہ پوری پوری غزلیں لکھ ڈالیں ہیں جس کی بدولت کہانی کا تسلسل اور لطف مفقود ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین تحسین کی ادبیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی حرماں نصیبی پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "تحسین کی بدنصیبی تھی کہ میر امن جیسے انشا پرداز نے اس داستان کو دوبارہ لکھا۔ جس کی وجہ سے تحسین کا کارنامہ ماند پڑ گیا۔ لیکن یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس وقت شمالی ہند کی اردو نثر میں کوئی ادبی تصنیف نہ تھی۔ نوطرز مرصع اپنے طرز کی پہلی کوشش ہے۔"[7]

مولوی عبدالحق تحسین کی علمی لیاقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "ان کو فارسی اردو نظم ونثر دونوں پر قدرت تھی، وہ بہت اچھے خوش نویس بھی تھے اور

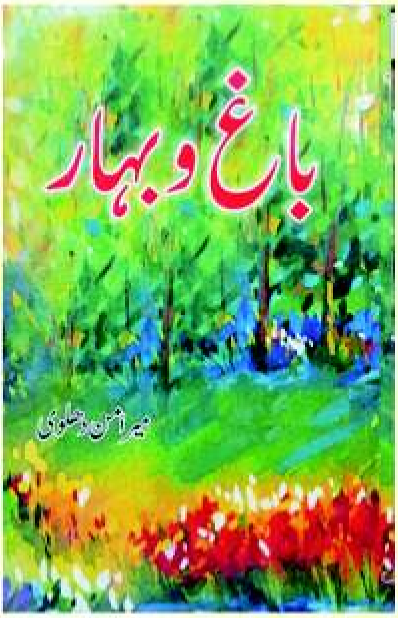

اسی بنا پر ان کا خطاب 'مرصع رقم' تھا۔ علاوہ اس کتاب کے وہ انشائے تحسین، ضوابط انگریز اور تواریخ فارسی وغیرہ کے مؤلف ہیں۔ یہ سب کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔"[8]

اب جہاں تک سوال 'باغ و بہار' کا ہے تو یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ یہ میر امن دہلوی کی سب سے مقبول ومعروف کتاب ہے۔ یہ کتاب سنہ 1802 میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں پائے تکمیل تک پہنچی اور 1803 میں منظر عام پر آئی۔ یہ قصۂ چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے۔ میر امن سے پہلے میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے اس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ کتاب کے دیباچے میں میر امن نے 'نوطرز مرصع' کا کوئی ذکر نہ کرتے ہوئے صرف فارسی ترجمہ کی بات کی ہے۔ 1931 میں جب مولوی عبدالحق نے 'باغ و بہار' کو مرتب کر کے شائع کیا تو انھوں نے فارسی نسخے (مترجم/مصنف: محمد علی معصوم[9]) کی کئی عبارتوں کا 'نوطرز مرصع' اور 'باغ و بہار' سے موازنہ کر کے یہ پردہ فاش کر دیا کہ میر امن کا ماخذ ومنبع 'نوطرز مرصع' ہے۔ 1933 میں حافظ محمود خاں شیرانی اپنے مشہور مضمون چار درویش، مشمولۂ کارواں لاہور میں باغ و بہار کی ابتدائی اشاعت کے سرورق کی مندرجہ ذیل عبارت کچھ اس طرح پیش کر سکتے ہیں:

"باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دلّی والے کا ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصہ چہار درویش سے۔"[10]

تحسین اور میر امن کے علاوہ محمد غوث زرّیں نے بھی 'قصہ چہار درویش' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ زرّیں نے متن کی ابتدا میں کتاب کا نام 'چار درویش' لکھا ہے۔ زرّیں نے اپنے اردو نسخے کی ابتدا میں لکھا ہے کہ اوّل

انھوں نے یہ قصہ فارسی میں لکھا تھا اُسی کو اردو میں ترجمہ کردیا۔ اس کی تاریخ تالیف 1198ھ ہے۔ بقول گیان چند جین ''زرّیں کا فارسی نسخہ اردو نسخے کی نسبت بہت مفصّل اور ترقی یافتہ ہے۔'' وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''زرّیں نے بھی اپنے اردو چار درویش کی تاریخ ''باغ و بہار (1217ھ) سے نکالی ہے لیکن یہ میر امن کے شاہکار سے واقف نہیں''[11]

خلاصۂ کلام یہ کہ 'قصہ چہار درویش' کوئی زیادہ قدیم نہیں ہے۔ یہ مغلیہ دور کی پیداوار ہے۔ غالب گمان ہے کہ یہ 18ویں صدی کی تصنیف ہے جیسا کہ محمود خاں شیرانی اور دیگر حضرات کے بیانات سے واضح ہوتا ہے۔

شمالی ہند کی دوسری مقبول عام داستان فسانۂ عجائب ہے۔ یہ مرزا رجب علی بیگ سرور کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب اور شمالی ہند کی پہلی اہم طبع زاد داستان ہے۔ یہ داستان سنہ 1824 میں لکھی گئی جو دبستان لکھنؤ کی ایک شاہکار ہے۔ اکثر ناقدین کا کہنا ہے کہ 'فسانۂ عجائب' کے مختلف اجزا قدیم فارسی اور اردو داستانوی مثنوی میں مل جاتے ہیں۔ محققین نے اسے محمد بخش مہجور کی 'گلشن نوبہار'، میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' مصحفی کی مثنوی 'گلزارِ شہادت' اور 'داستان امیر حمزہ' سے مشابہ قرار دیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ داستان 'پدماوت اور بہار دانش' کی یاد دلاتی ہے۔ کیونکہ دونوں کی کہانی میں طوطا اسی طرح رہبری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

فسانۂ عجائب میں سب سے زیادہ دلچسپی کا حامل تبدیلیٔ قالب کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین اس کو سرور کے دماغ کی اُپج تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ سنسکرت ادب میں اس طرح کی متعدد کہانیاں ہیں۔ وہ ڈاکٹر پرکاش مونس کی کتاب 'اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر' کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ ''ایسے واقعات 'کتھا سرت ساگر' اور 'پربندھ چنتامنی' میں، راجہ نند اور راجہ مکند کی کہانی، 'پنچ تنتر'، 'بیتال پچیسی' میں راجہ وکرم کے سلسلے میں اور مرگیندر کی تصنیف پریم پیوندھی میں ملتے ہیں۔''[12] گیان چند جین مزید لکھتے ہیں کہ ''پریم پیوندھی کا واقعہ بالکل فسانہ عجائب سے مماثل ہے۔''[13]

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرور نے اپنے ماقبل داستانوں اور کہانیوں سے استفادہ کیا ہے، بہر حال ہر فن کار چراغ سے چراغ جلاتا ہے۔ باوجود اس کے سرور نے اپنی کتاب کے شروع میں وجہ تالیف کچھ اس انداز میں بیان کی ہے کہ ایک روز وہ لکھنؤ میں دوستوں کے زمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک دوست نے ان سے قصہ گوئی کی فرمائش کی تا کہ پریشانی طبیعت دور ہو، اس پر سرور نے کہانی کے چند کلمات بیان کیے: یہ کہانی دوستوں کو پسند آئی۔ بعد میں ان دوستوں کے اصرار پر یہ داستان منظر عام پر آیا۔

اس کے باوجود پروفیسر گیان چند جین فسانۂ عجائب کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور شمالی ہند کی اہم داستانوں میں اس کو شمار کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''اگر کوئی پوچھے کہ اردو کے دو سب سے بڑے داستان نگار کون ہیں تو ہر شخص بلا تامل جواب دے گا کہ میر امّن اور رجب علی بیگ سرور''۔[14] اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں اپنے اپنے دبستان کے مشہور داستان نویس ہیں اور دونوں کی کتابیں اپنی اپنی نوعیت سے الگ الگ مقام رکھتی ہیں۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا سراسر ناانصافی ہوگی۔

نوطرز مرصع، باغ وبہار اور فسانۂ عجائب کے علاوہ شمالی ہند کی ایک اور مشہور ومقبول داستان ہے جو باغ وبہار کے فوراً ہی بعد منصۂ شہود میں آگئی تھی۔ اردو ادب میں یہ داستان 'رانی کیتکی کی کہانی' کے نام سے مشہور ہے۔ اصل میں اس داستان کا نام ''داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی'' ہے جو انجمن ترقی اردو سے 1933 میں شائع ہوئی جس کے خالق انشا اللہ خاں انشا ہیں۔ یہ اردو کی مختصرترین طبع زاد داستان ہے جو 1803 میں لکھی گئی تھی۔ اس داستان کی تصنیف کے پیچھے انشا کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس کی عبارت میں ہندی کے علاوہ (مثلاً فارسی یا عربی) کسی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔

سرور نے اس کتاب میں انشا پردازی کا اعلیٰ کمال دکھایا ہے جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اردو حلقوں میں اسے کافی مقبول ملی اور حیرت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی، مگر بدقسمتی سے انھوں نے دیباچہ میں میر امن اور اہل دہلی کے متعلق کچھ ایسے نازیبا الفاظ کا استعمال کیا جس سے دونوں دبستانوں کے درمیان لفظی جنگ چھڑ گئی۔ انھیں وجوہات کی بنا پر دہلی والوں کے نزدیک ان کی اہمیت خاک میں مل گئی۔

فسانۂ عجائب میں کثرت سے اساتذہ کے کلام سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ اشعار سرور اور ان کے استاد نوازش حسین خاں کے ہیں۔ ان کے علاوہ حافظ، جامی، سعدی، میر، سودا، میر حسن، سوز، جرأت، اور مصحفی وغیرہ کے بھی اشعار جا بجا نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر وقار عظیم فسانۂ عجائب کے اسلوب اور طرز ادا کو اس وقت کے خاص اسلوب سے منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''فسانۂ عجائب ایسے طرز میں لکھی گئی جو اس خاص زمانے اور اس خاص ماحول کا پسندیدہ طرز ہے۔''[15]

پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں: ''فسانۂ عجائب کی فضیلت اس کے اسلوب اور معاشرت کے بیانات کی وجہ سے ہے۔ اس کا دیباچہ گو قصے کا جزو نہیں لیکن وہ ادب میں مستقل جگہ پا گیا ہے۔''[16]

نوطرز مرصع، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے علاوہ شمالی ہند کی ایک اور مشہور و مقبول داستان ہے جو باغ و بہار کے فوراً ہی بعد منصۂ شہود میں آ گئی تھی۔ اردو ادب میں یہ داستان 'رانی کیتکی کی کہانی' کے نام سے مشہور ہے۔ اصل میں اس داستان کا نام ''داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی'' ہے جو انجمن ترقی اردو سے 1933 میں شائع ہوئی جس کے خالق انشا اللہ خاں انشا ہیں۔ یہ اردو کی مختصر ترین طبع زاد داستان ہے جو 1803 میں لکھی گئی تھی۔ اس داستان کی تصنیف کے پیچھے انشا کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس کی عبارت میں ہندی کے علاوہ (مثلاً فارسی یا عربی) کسی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے پُٹ نہ ملے، تب جا کر میرا جی پھول کی کلی کے روپ کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو''[17]

انشا بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ہیں اور کیوں نہ ہوتے کیونکہ اس داستان کا موضوع ہندوانی زندگی اور معاشرت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے کردار بھی معمولاً ہندی ہی بولتے ہیں۔ ایسے میں داستان نگار کے فن کی اصل آزمائش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحریر میں ایسی تکنیک کا استعمال کرے جس سے قاری کو دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ انشا کے فن کا کمال ہے کہ انہوں نے عبارت کے ہندوی پن میں سادگی، سلاست اور روانی بھی قائم رکھی ہے اور روزمرہ کے لطف میں بھی کہیں کمی آنے نہیں دی ہے۔ یہاں قاری کی آسانی کے لیے داستان سے بعض اقتباسات نقل کیے جا رہے ہیں۔ روایت کے مطابق داستان کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے ہوتا ہے لہٰذا ذیل کی عبارت حمد سے ماخوذ ہے:

''یہ کل کا پتلا جو اپنے اس کھلاڑی کی سُدھ رکھے تو

کھٹائی میں کیوں پڑے اور کڑوا کسیلا کیوں ہو؟ اس پھل کی مٹھاس چکھنے جو بڑوں سے بڑے اُگلوں نے چکھی ہے۔"[18]

اس کے بعد کہانی کا آغاز بقول انشا: ''کہانی کے اُبھار کے ساتھ بول چال کی دلہن کا سنگار'' سے شروع ہوتا ہے۔ کنور چندر بھان جھولا جھولتی ہوئی لڑکیوں کے پاس پہنچتا ہے، وہ جھولا جھول رہی ہیں اور ساتھ ہی ساون گا رہی ہیں، ان چالیس پچاس دوشیزاؤں میں ''ایک ایک سے اگلی تھی لیکن ایک لاجواب تھی۔'' انشا کہتے ہیں: ''ان سبھوں میں سے ایک کے ساتھ اس کی آنکھ لڑ گئی'' اس طرح کنور کو رانی کیتکی سے محبت ہوئی اور ''اس کے جی میں اس کی چاہ نے گھر کیا''

مذکورہ بالا عبارت سے پتہ چل رہا ہے کہ اس میں باوجود ہندی کے الفاظ روز مرہ کی سادگی اور محاوروں کا بے تکلف استعمال جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ قاری کو پوری کتاب میں معمولاً یہی سادگی، سلاست اور روانی کا حسین امتزاج نظر آئے گا۔ اسی طرح ہندو کردار کی زبانی قصے کے ہندوی پن کے التزام نے عبارت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ دیکھیے یہ اقتباس:

''جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل، اُچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے، اپنی چوکڑی بھول جائے۔"[19]

اردو کی مختصر ترین داستانوں میں ایک آرائش محفل ہے۔ یہ قصہ حاتم طائی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس داستان کے خالق حیدر بخش حیدری ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے اعلیٰ پائے کے مترجموں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا اسلوب اور طرز نگارش قابل ستائش ہے۔ باغ و بہار کے بعد فورٹ ولیم کالج کے تحت ترجمہ شدہ کتابوں میں سب سے آسان وسلیس ترجمہ ہمیں آرائش محفل میں نظر آتا ہے۔ ادبی پہلو کے قطع نظر آرائش محفل کا قصہ' باغ و بہار' سے بھی کہیں زیادہ زبان زد خاص و عام ہے۔ اس داستان کی کہانی اور ساخت اتنی دلچسپ ہے کہ قاری پل بھر کے لیے بھی اس سے ہٹنا گوارہ نہیں کرتا، ہر موڑ پر ایک نئی طرح کا تذبذب برقرار رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری ہمیشہ کہانی سے پردہ اٹھنے کا منتظر رہتا ہے۔

دیگر داستانوں کی طرح اس داستان کا آغاز بھی کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ ''اگلے زمانے میں طے یمن کا ایک بادشاہ تھا۔ نہایت صاحب حشم، عالی جاہ، فوج کی طرح سے فرخندہ حال مرد، جواہرات سے مالا مال....."[20]

اس کے بعد بادشاہ کے یہاں مہر لقا نام کا ایک شہزادہ پیدا ہوتا ہے جو آگے چل کر حاتم طائی کے نام سے اس قصے کا ہیرو طے پاتا ہے۔ پھر وہی پچھلی داستانوں کی طرح نجومی، پنڈت، جفرداں اور رمال وغیرہ آتے ہیں اور اپنے زایچوں اور پوتھیوں کی مدد سے شہزادہ ہفت اقلیم کا بادشاہ بن جاتا ہے، اور ساری عمر اپنے آپ کو راہِ خدا میں وقف کر دیتا۔ پوری کہانی سات چیزوں کے گرد گرد گھومتی رہتی ہے۔

1۔ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی خواہش ہے
2۔ نیکی کر دریا میں ڈال
3۔ کسی سے بدی نہ کر، اگر بدی کرے گا تو بدی پاوے گا
4۔ سچ کہنے میں ہمیشہ راحت ہے
5۔ کوہ ندا کی خبر لانا
6۔ اُس موتی کا جوڑا تلاش کرنا جو مرغابی کے انڈے کے برابر ہے
7۔ حمام بادگرد کی خبر لانا

اس کے علاوہ بھی اردو کی بہت ساری ایسی داستانیں شمالی ہند میں وجود میں آئی ہیں جن کا تفصیل سے ذکر پھر کہیں کسی موقع پر کیا جائے گا۔ تاہم یہاں صرف اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ داستان کی اہمیت وافادیت آج کے سماج میں زبان کی اصلاح کے لیے بہت ضروری ہے۔ موجودہ دور میں داستان کی زبان اور تہذیب کی صورت حال کا موازنہ اگر ماضی کی داستانوں سے کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ آج داستان کی باتیں صرف داستانوں میں ہی سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ وہ روز بہ روز زوال کی طرف گامزن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ باوجود اس کے آج کا قاری ناامید ہرگز نہیں ہے۔ اس کا آج بھی ہماری کلاسیکی داستانوں سے لگاؤ ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں مزید اس کلاسیکی صنف پر زور دیا جائے گا۔

حواشی

(1) اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، ص 95
(2) ایضاً، ص: 95
(3) بقول گیان چند جین: بعض لوگوں کو تحسین کے نام پر اختلاف ہے، گیان چند جین مسعود حسین رضوی ادیب کے حوالے سے اپنی کتاب' میں لکھتے ہیں کہ: ''میر امن نے' باغ و بہار' میں اور آزاد نے' آب حیات' میں ان کا نام عطا حسین خاں لکھا ہے لیکن ان کا صحیح نام میر محمد حسین عطا خاں تھا جو ان کے دوست امیر اللہ ابوالحسن نے تذکرۂ مسرت افزا میں درج کیا ہے۔ 'نوطرز مرصع' کے قدیم ترین نسخوں میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ داستان کے مرتب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے بھی [مقدمہ میں] اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔'' دیکھیے، اردو کی نثری داستان، ص: 206 اور ایک دوسرے مرتب مولوی عبدالحق نے بھی اپنے مقدمہ کے صفحہ 5 پر ان کا نام میر محمد حسین عطا خاں تخلص بہ تحسین بتایا ہے۔
(4) بحوالہ مقدمہ 'نوطرز مرصع' از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ص: 23
(5) باغ و بہار، مرتبہ: مولوی عبدالحق، مطبع انتظامی کانپور، 1931، مقدمہ، ص: 7
(6) ایضاً، ص: 6-5
(7) اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، ص: 212
(8) باغ و بہار، مرتبہ: مولوی عبدالحق، مطبع انتظامی کانپور، 1931، مقدمہ، ص: 5
(9) بعض لوگوں کا خیال ہے 'قصہ چہار درویش' امیر خسرو کی کتاب ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیق اس کی مکمل تردید کرتی ہے۔ وہ اپنے دلائل اور حقائق سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قصہ چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف نہ ہو کر محمد علی معصوم کی تصنیف کردہ کتاب ہے۔ پروفیسر گیان چند جین اپنی کتاب 'اردو کی نثری داستانیں، ص: 265 میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''چار درویش کی تحقیق میں پروفیسر محمود شیرانی کا نام ہمیشہ درخشندہ رہے گا۔ انھوں نے حتمی طور پر ثابت کیا کہ امیر خسرو کو اس قصے سے دور کا تعلق نہیں۔ ان کے دلائل کا خلاصہ درج ذیل ہے:
- اس کا کوئی فارسی مخطوطہ بارہویں صدی ہجری سے پیشتر کا نہیں۔ نہ اس سے قبل کسی تحریر میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے۔
- فارسی نسخے میں متعدد اشعار خسرو سے بعد کے شعرا مثلاً حافظ، عرفی اور ظہیر کے ہیں۔
- قصے میں تومان اور اشرفی کا ذکر ہے جو خسرو کے عہد میں رائج نہیں ہوئی تھیں۔ نیز ایسے متعدد عہدہ داروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو دورِ مغلیہ کی اختراع ہیں۔ مثلاً قورچیاں، کشک چیاں، اشک آقایاں، وکیل السلطنت، خزانہ دار امیر آمورخور۔
- امیر خسرو کی نثر بڑی مرصع، دقیق اور صنائع بدائع سے پُر ہوتی ہے۔ چار درویش کے کسی متن کا اسلوب ایسا نہیں ہے۔
(10) بحوالہ محمود خاں شیرانی، مضمون: چار درویش، مشمولہ' کارواں' لاہور، 1933
(11) اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ ص: 279
(12) ایضاً، ص: 531
(13) ایضاً
(14) ایضاً، ص: 507
(15) اردو کی داستانیں، وقار عظیم، ص: 35-234
(16) اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، ص: 539
(17) دیکھیے، رانی کیتکی کی کہانی، انشاء اللہ خاں انشا
(18) ایضاً، ص:
(19) ایضاً، ص:
(20) دیکھیے، آرائش محفل، شیر علی افسوس

■

Saud Alam
B.114, Ist Floor. R.No 05
Okhla Main Market, Jamia, Nagar
New Delhi - 110025
Mob: 8076495936

خان محمد رضوان

اردو مثنوی: تعارف اور تفہیم

اردو شاعری میں مثنوی نگاری کا فن فارسی سے آیا ہے۔لفظ 'مثنوی' گرچہ عربی زبان سے ماخوذ ہے مگر عربی ادب میں اس صنف پر کوئی خاص کام نہیں ہوا۔فن مثنوی میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے دیگر فنون لطیفہ کے مقابلے میں بہت زیادہ وسعت ہے۔ بلکہ غزل کے بعد شعرا نے مثنوی میں سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں داستان حیات بیان کرنے کے ہزار امکانات موجود ہیں۔اور شاعر انسانی سماج و معاشرہ کے تمام کیف و کم کی عکاسی اس فن میں بہ آسانی کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میدان شاعری میں اسے بے پناہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''قصیدہ، غزل اور مرثیہ کے برخلاف اس کا موضوع ہمہ گیر اور لامحدود ہے۔ ایک مثنوی میں جنگ و جدل کی کڑک، حسن و عشق کے گیت، پیری کا پند نامہ اور ماورا کے اسرار بیان کیے جاسکتے ہیں۔''

(اردو مثنوی شمالی ہند میں جلد اول، ص68، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، 1986)

یہ حقیقت ہے کہ مثنوی بیانیہ شاعری کی معراج ہے، اس میں شاعر اپنے عہد، سماج، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو زبانی اور خوش کلامی سے ظاہر کرتا ہے۔ ظاہراً دیومالائی قصوں کی داستان ہوتی ہے، مگر اس کا تار و پود اس عہد کی سماجی زندگی کے خام مواد سے وجود میں آتا ہے۔ اس میں صرف واقعات کا بیان یا خارجی مناظر کی ہی عکاسی نہیں ہوتی ہے بلکہ انسانی جذبات و کیفیات اور احساسات کا بھی عکس نمایاں ہوتا ہے۔ اگر مثنوی کی شہرت بام عروج کو پہنچی اور خوب پھلی پھولی اور ادب میں اس کا ایک اہم مقام طے پایا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ صنف سہل ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ صنف کارآمد ہے اور اس میں شاعر ہر قسم کے جذبات و واقعات اور مناظر کو بہ آسانی پیش کرسکتا ہے۔ شاعر انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و ثقافت کی داستان کو جس خوبی سے اس میں پیش کرسکتا ہے کسی اور صنف میں نہیں کرسکتا۔ اس تعلق سے الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''مثنوی، اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بہ کارآمد صنف ہے۔ کیونکہ غزل یا قصیدے میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیے کی پابندی ہوتی ہے، ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ ..... جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں، ان میں کوئی صنف، مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل، مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ عربی کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہوسکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں بظاہر ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جاسکتی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں۔ اسی لیے عرب، شاہ نامے کو قرآن العجم کہتے ہیں۔ اور اسی لیے مثنوی معنوی کی نسبت ''ہست قرآن در بیان پہلوی'' کہا گیا ہے۔''

(مقدمہ شعر و شاعری، ص202، 203، خواجہ الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ دہلی، 2013)

اس صنف کی مقبولیت، افادیت اہمیت اور وسعت موضوع اور بیان کی وجہ سے اردو کے تقریباً بیشتر کلاسیکی غزل گو شعرا نے مثنوی کہی ہے، جب کہ دکن کے زیادہ تر شعرا اپنی شناخت مثنویوں کی وجہ سے ہی رکھتے ہیں۔ جیسے نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ'، سے لے کر سراج اورنگ آبادی کی 'بوستان خیال' تک کئی مثنویاں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ وجہی کے علاوہ غواصی، مقیمی، ملک، خوشنود، نصرتی، ابن نشاطی، طبعی، جنیدی، فائز اور ہاشمی وغیرہ کی شناخت مثنویوں ہی کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح شمالی ہند میں افضل کی 'بکٹ کہانی' سے مثنوی کی تاریخ کی ابتدا ہوتی ہے۔ مگر جب اٹھارہویں صدی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے تو بیشتر شعرا مثنوی لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فائز، حاتم اور آبرو کے بعد سودا، میر اور میر حسن صنف مثنوی کی تاریخ نو رقم کرتے ہیں۔ اگر ہم اٹھارہویں اور انیسویں صدی پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ شعرا کی ایک بڑی تعداد نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے ان میں مصحفی، انشا، جرأت، میر اثر، رنگین، نسیم، مومن اور مرزا شوق اہم ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہی رہی ہے کہ صنف مثنوی میں اظہار کی بے پناہ گنجائش ہے۔ اس تعلق سے مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہوسکتے ہیں۔ جذبات انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخیل ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔ مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ

یا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آجاتے ہیں۔"

(مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، عبداللطیف اعظمی، شبلی اکادمی، قرول باغ، دہلی، مئی 1945، ص 303)

مولانا حالی نے صنف مثنوی کو کارآمد اور مفید اسی لیے کہا ہے کہ مثنوی کا حقیقی یا غیر حقیقی بیان اس عہد کی تاریخی اور تہذیبی قدروں کی خوبصورت جھلک پیش کرتا ہے۔ داستان خواہ منظوم ہو یا منثور اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ پیش کرتی ہے۔ اگر ہم اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی مثنویوں کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان مثنویوں میں لکھنوی اور دہلوی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ باغ و بہار ہو کہ فسانہ عجائب، انہی کی طرح سحر البیان اور گلزار نسیم میں بھی ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور تمدن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ میر ہوں یا کہ مصحفی کی مثنویاں یا مرزا شوق کی زہر عشق ان تمام مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور اقدار کا گہرا عکس نمودار ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ صنف شاعری میں مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں مضامین اور موضوعات کا تنوع، مربوط بیانیہ اور خیالات کے مفصل بیان کی گنجائش ہوتی ہے۔

امداد امام اثر نے لکھا ہے:

"مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہے، ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں...... یہ وہ صنف شاعری ہے جس میں شاعر شاعری کا کمال حسب مراد دکھلا سکتا ہے۔"

(مومن خاں مومن (مونوگراف)، ص 19، مصنف، ڈاکٹر تنویر احمد خاں، ناشر: اردو اکادمی دہلی، 2011-2007)

بہر طور ہماری مثنویاں تہذیب و ثقافت اور کلچر کی عکاس ہوتی ہیں۔ مثنوی کے لیے جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور محاکات جز و لازم ہیں۔ جس کے سہارے شاعر تہذیب کی دل پذیر مرقع کشی کرتا ہے۔

اردو شعر و ادب میں انیسویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ انیسویں صدی کے بیچ کا حصہ اردو شاعری کا نقطۂ عروج تھا۔ یہ دور اردو شعر و شاعری کا وہ سنہرا دور ہے جس میں ذوق، مومن اور غالب جیسے صاحب فن شعرا جمع ہو گئے تھے اور یہ سچ ہے کہ اسی عہد میں اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ ملا۔

ان کے علاوہ مظہر جان جاناں، درد، نظیر، میر، سودا، ذوق، آتش، ناسخ، انیس، دبیر، میر حسن، شوق، مصحفی، انشا، جرأت خاص تھے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مغلیہ عہد میں ایک سے ایک انمول رتن پیدا ہوئے۔ یہ بات دہلی اور دہلی والوں کے لیے باعث فخر ہے کہ گوہر نایاب ان کے دامن میں پناہ گزیں تھے۔

شیخ ابراہیم ذوق (15/ **اکتوبر** 1854-1788)

ذوق نے شاعری میں وہ شہرت کمائی کہ آسمان بھی رشک کرے۔ آپ کی زبان صاف، شستہ اور سبک تھی اسی لیے سب محسوس کرتے ہیں کہ ذوق کی شاعری رائے عامہ کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری صناعی کی لاجواب مثال ہے۔ ذوق کی شعری عظمت اور شہرت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ان کی کلیات میں غزلیں، قصائد اور رباعیات موجود ہیں اور دیگر کتب میں بھی ان اصناف کے حوالے سے خوب گفتگو کی گئی ہے۔ تعریفیں بھی کی گئی ہیں اور نقائص کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ ادبا نے ایک ایک چیز کی جانب نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی شاعری میں کیا خوبیاں ہیں اور یہ بھی بتایا کہ خامیاں کیا ہیں، مگر ادبا نے اپنی تحریروں میں یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ ذوق کا مثنوی کے تعلق سے کیا رجحان تھا۔ آیا انھوں نے مثنوی کہی یا نہیں کہی اور اگر نہیں کہی تو اسباب کیا تھے۔ اور اگر کہی ہے تو کس حد تک کہی ہے ایسا کسی نے ذکر نہیں کیا ہے۔ کلیات ذوق (اردو) مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مقدمہ صفحہ 39 میں ذوق کی مثنوی کے صرف 30 تیس اشعار کا ذکر کیا ہے۔ اور ان تیس اشعار کو 'اشعار مثنوی' کے عنوان سے اسی کلیات کے صفحہ 271 اور 272 میں شامل کردیا ہے۔ باقی پوری کلیات میں مثنوی کے اشعار کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذوق نے مثنوی کے صرف تیس اشعار کہے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی خاص زبان کا استعمال ان اشعار میں بھی کیا ہے چوں کہ وہ اہل زبان تھے لہٰذا زبان دانی کا جادو اس میں بھی انھوں نے دکھایا ہے۔ اس مثنوی کے اشعار سے کئی رنگوں کا عکس نمایاں ہوتا ہے آغاز کے چند اشعار سے ایسا لگتا ہے کہ حمد اور نعت کے اشعار میں چند اشعار میں رنگ غزل ابھرتا ہے اور آخر کے باقی اشعار میں محرومی اور محبوب کی بے وفائی کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔

ہم ان اشعار کو کسی بھی رنگ میں دیکھیں یا اس کا جو عکس بھی ہم محسوس کریں ان تمام عکسوں میں ہماری ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کا عکس ہی جھلکتا ہے۔

مومن خاں مومن (1852-1800)

مومن طبعاً ذہین واقع ہوئے۔ وہ بیک وقت طبیب، شاعر، عاشق، نجوم اور رمل کے جان کار اور موسیقی کے دل دادہ تھے۔ اور شطرنج تو ان کے ذوق جمال کا خاص حصہ تھا۔ وہ باذوق انسان تھے۔ وہ ہر فن مولی تھے۔ کسی شاعر یا ادیب میں بیک وقت اتنی خوبیوں کا پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ مگر مومن ان تمام فنون پر کمال حاصل کرنے کے ساتھ عشق و عاشقی میں بھی کمال رکھتے تھے اور کئی عشق بھی کیے۔ مومن کے عقیدے کے تعلق سے شکوک و شبہات ظاہر کیے جاتے ہیں جب کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اسی طرح مومن اردو شاعری میں اپنے کمال فن سے جانے جاتے ہیں۔ مومن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پہلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے صداقت پسندی کو فروغ دیا اور فرسودہ روایات کو توڑا۔ انھوں نے غزل کو حسن و صداقت سے بہرہ مند کیا اور واردات قلبی کو سچائی اور جرأت کے ساتھ پیش کیا۔ اس بات کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبا نے مومن کی شاعری کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیے ہیں مگر کسی نے ان کی شاعری کے حالات درج نہیں کیے ہیں کہ انھوں نے

شاعری کب کیسے اور کس طرح شروع کی اور ابتدا میں کیسی شاعری کی کیونکہ ان کے اجداد اطبا تھے اور وہ بھی نسخہ بنایا کرتے تھے تو آخر شاعر کب بنے یہ ضرور لکھنا چاہیے تھا کیونکہ محمد حسین آزاد کو جو حالی نے مومن کے تعلق سے کوائف دیے ہیں اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی گلشن بے خار میں نواب مصطفی خاں شیفتہ نے اس تعلق سے کچھ لکھا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مان لینا چاہیے کہ ان کے پاس شاعری کا فن صرف محنت و ریاضت سے نہیں یعنی کسی طور پر نہیں آیا تھا بلکہ وہبی تھا، فطرت میں خدا نے شاعری شامل کر رکھی تھی تو مومن نے غزل، قصیدہ اور مثنوی جیسی صنف میں کمال پیدا کیا، تمکین کاظمی نے اس تعلق سے لکھا ہے کہ:

''یہ ماننے کے بعد کہ وہ وہبی شاعر تھے، یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انھوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کی ہوگی کیوں کہ جو شخص آٹھ نو سال کی عمر میں عاشقی کر سکتا ہے وہ شاعری بھی کر سکتا ہے۔''

(حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے حالات اور کلام کا تعارف، ص34، مصنف: تمکین کاظمی، ناشر: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، حیدرآباد، سنہ ندارد)

دراصل غزل میں عشق کا جو معیار ہے یہیں سے مثنوی میں بھی آیا ہے۔ بہت کم ہی مثنویاں ایسی ہوں گی جن میں عشق کے معاملات کا ذکر نہ ہو۔ جب کہ فراق صاحب کے اس بیان سے حیرت ہونا فطری ہے کہ ''مومن کی کوئی مثنوی یا ان کا قصیدہ عشقیہ نہیں۔'' جب کہ مومن مولوی سید احمد بریلویؒ سے بیعت تھے باوجود اس کے انھوں نے کئی عشق کیے اور جس طرح سے مومن سے اپنی شاعری میں واردات قلبی اور واقعات عشق و محبت کو برتا ہے شاید ہی کسی نے برتا ہو، اور ان کی مثنویوں میں عشق کی روداد طلب کی متقاضی ہے۔ کلیاب مومن میں چھوٹی، بڑی، بارہ مثنویاں ہیں۔ ان مثنویوں میں سات مثنویاں تو ایسی ہیں جن میں صرف عشقیہ آپ بیتی بیان کی گئی ہے۔ ان مثنویوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

(1) شکایت ستم، 1231ھ (2) قصہ غم، 1235ھ (3) قول غمیں، 1236ھ (4) تف آتشیں، 1241ھ (5) حنین مغموم 1244ھ، (6) آہ وزاری مظلوم، 1246ھ، یہ چھ مثنویاں وہ ہیں جو بے حد مقبول ہیں، ساتویں مثنوی کے دو جز ہیں۔ جز واول در حمد، جز و دوم نعت اور مناجاب عاشقانہ کل 308 شعر، مگر نول کشور پریس لکھنؤ کے کلیات مومن میں آخر الذکر کو دو مثنویاں تصور کیا ہے۔ جز واول کا عنوان مثنوی ناتمام ہے اور جز و دوم کو علاحدہ مثنوی مانا ہے۔ جب عبادت بریلوی نے جو کلیات مومن ترتیب دی ہے اس میں انھوں نے اسے ایک مکمل مثنوی مان کر 'بقیہ مثنوی' کے عنوان سے درج کیا ہے۔ مومن کی مثنوی کے تعلق سے ڈاکٹر گیان چند نے اپنے ایک مضمون 'مثنویات مومن' میں لکھا ہے:

''اردو مثنوی نگاری کی تاریخ میں مومن کی اہمیت ان چھ مثنویوں کی وجہ سے ہے جس میں انھوں نے معاملات عشق کی عمدہ شرح کی ہے۔''

(یادگار مومن، صفحہ 138، شائع کردہ اردو مجلس حیدرآباد، مطبوعہ: انتخاب پریس جواہر لال نہرو روڈ، سنہ ندارد)

یہ سچ ہے کہ مومن کی مثنوی کی سب سے زیادہ اہم اور قابل لحاظ خصوصیت ان کی حقیقت نگاری ہے۔ انھوں نے واقعات عشق کا بیان نہ صرف جرأت مندی سے کیا ہے بلکہ خوبی اور خوبصورتی بھی غضب کی ہے۔ اگر ان کی مثنویوں کی شہرت اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے تو اس میں قصور صرف اور صرف ان کی بوجھل زبان کا ہے۔ کہیں کہیں تو واقعہ عشق کے بیان کو اس قدر طول دیتے ہیں کہ اصل قصہ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ویسے جذبات نگاری میں انھوں نے جس خوبی کا مظاہرہ کیا ہے شاید ہی کسی مثنوی نگار نے کیا ہو۔ مومن کی مثنویوں کے مختلف پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی خوبیوں کو آشکار کرتے ہوئے ڈاکٹر سید رفیع الدین نے اپنے مضمون 'مومن کی شاعری میں مذہبی عناصر' میں لکھتے ہیں:

''مومن نے مثنویاں مختصر اور عشقیہ لکھی ہیں۔ ان میں واردات قلبی کا بیان زیادہ ہے جو حقیقت حال کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحیح جذبات کی ترجمانی اور محاکات کی نادر مثالیں جو مومن کی مثنوی میں ملتی ہیں وہ نہایت بدیع ہیں اور مومن کی مثنوی نگاری کا یہ پہلو نمایاں اور روشن ہے۔''

(یادگار مومن، ص 162، شائع کردہ اردو مجلس حیدرآباد، مطبوعہ: انتخاب پریس جواہر لال نہرو روڈ، سنہ ندارد)

یہ سچ ہے کہ مومن کی مثنویاں ادبی اور زمانی دونوں اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں ان میں ہر جگہ اس عہد کا منظر نامہ عشق کی داستان اور تہذیبی و لسانی عکس دیکھنے کو نظر آتا ہے۔ مثلاً 'شکایت ستم' یہ مثنوی 1231ھ میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کو مومن خاں مومن نے محض سترہ سال کی عمر میں تصنیف کیا جس میں 594 اشعار ہیں۔ اس عمر میں ایسی پختہ مثنوی لکھنا صرف کمال فن ہی نہیں بلکہ اعجاز فن بھی ہے۔ اس میں وہ کسی نازنین کے گیسو کے اسیر ہو گئے تھے اس کا مفصل بیان ہے۔ اس مثنوی میں عشق کا خوبصورت انداز پیش کیا گیا ہے۔ چوں کہ اس میں انھوں نے شادی کے موقع سے آئی محبوبہ سے چھپ چھپا کر ملنے کی عجیب و غریب داستان کو نظم کیا ہے۔ اگر اس کے بیان میں مومن، آسان، سادہ زبان استعمال کرتے اور ثقالت سے گریز کرتے تو ان کا کلام اور زیادہ موثر ہوتا جاتا، باوجود اس کے اس میں جذبات نگاری کمال کی ہے۔ ہجر کی سینہ کاوی، مستورات کے اندیشے، رسوائی کا کھٹکا، طرح طرح کے معاملے اور پھر گھر والوں کا ڈر ان باتوں کو تو دلکش اور اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

داغ دہلوی (1803-1908)

داغ دہلوی کا شمار تیرہویں صدی کے نصف اول کے ان اہم شعرا میں ہوتا ہے جس میں مومن، ذوق، غالب اور شیفتہ پیدا ہوئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں اردو شاعری کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔ داغ جنھیں مثنوی سے فطری ربط تھا اس جانب خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صرف ایک مثنوی 'فریاد داغ' کے نام سے 54 برس کی عمر میں 1882 میں تخلیق کی جو نہایت

دلچسپ اور حسن وعشق کی واردات کا خوبصورت بیانیہ ہے۔

’’مثنوی فریادِ داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتہ کی ایک مشہور طوائف منی بائی حجاب کے ساتھ ان کو تھا اور رام پور کا بے نظیر کا میلہ دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی اور روانی وعمدگی ان کی قابل داد ہے۔ علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔‘‘

(تاریخ ادب اردو، ص 370، مصنف: رام بابو سکسینہ، مترجمہ، مرزا محمد عسکری، مطبع منشی نول کشور، واقع لکھنؤ، 1929)

داستان عشق کا بیان داغ کی مثنوی میں کوئی پہلا بیان نہیں ہے، یا یہ پہلی مثنوی نہیں ہے، جس میں عشق واقعات، عشق اور داستان عشق کے علاوہ وہ انجام عشق کا احاطہ کرتی ہو، بلکہ اس سے قبل درجنوں مثنویاں لکھی گئی ہیں، جن میں اس موضوع پر اپنے اپنے طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً صفیر بلگرامی کی فتنۂ عشق کو لے لیجیے، تسلیم سہسوانی کی سعدین کو دیکھیے، جنوں رامپوری کی مثنوی مرقعہ ناز کو پڑھیے، مظہر لکھنوی کی ریاض عشق، عروج کی عروج الفت، سید محمد خان حسرتی کی مثنوی نیرنگ الفت اور جعفر کی ولولۂ عشق، احسن لکھنوی کی جذبات عشق، ازل لکھنوی کی سحر عشق، مرزا فدا علی خنجر لکھنوی کی مثنوی انجام عشق قابل ذکر ہیں۔ ان مثنویوں کا اگر بغور اور تاریخی مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کسی نے کسی کا قصہ لیا تو کسی نے اپنی ذہانت وذکاوت کو بروئے کار لاکر کامیاب تقلید کی۔ یہ تمام مثنویاں فرد واحد کے عشق کا داستانی بیانیہ ہیں۔ اور ان سب کا امتیاز اور وصف شستہ اور بامحاورہ زبان ہے۔ مگر داغ کی مثنوی عشق کی ذاتی داستان تو ضروری ہے مگر اس عشق کا علاقہ ہماری تہذیبی روایت سے جا ملتا ہے۔ ساتھ ہی یہ مثنوی زبان کے اعتبار سے بھی ہماری تہذیب کا آئینہ ہے۔ اس بات پر تقریباً مصنفوں کا اتفاق ہے کہ داغ کی یہ مثنوی ان کی اپنی داستان ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا سچا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ دراصل یہ واقعہ اس عہد مغلیہ کا ہے جس میں وہ ایک طوائف پر عاشق ہوئے۔ اس طوائف کا نام منی بائی اور تخلص حجاب تھا۔ داغ نے اس میں اپنی واردات قلبی اور عشق کے سچے واقعے کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ اس عہد کی مکمل تہذیب اور روسا کا وطیرہ اس طور پر بغیر کسی تعجب کے ذہن میں آجاتا ہے کہ ایک عجیب قسم کی طلسماتی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ داغ کے بیان نے اس واقعہ میں عجیب وغریب لطف پیدا کردیا ہے۔ جس سے اس عہد بالخصوص دلی اور رامپور کی زبان دانی کا تہذیبی مرقع بھی سامنے آجاتا ہے۔

مثنوی گلزار نسیم (1811-1843)

پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی، گلزار نسیم اردو کی چند اہم مثنویوں میں سے ایک ہے۔ اردو میں جو داستانی مثنویاں لکھی گئی ہیں ان میں قبول عام کا شرف صرف دو مثنویوں میر حسن کی 'سحر البیان' اور دیا شنکر نسیم کی 'گلزار نسیم' کو حاصل ہے۔ اس مثنوی کی داستان اور قصے کے تعلق سے مختلف باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ یہ نہ ایرانی داستان ہے اور نہ ہندوستانی بلکہ اس میں بیان کیے گئے قصے کا تعلق ہند ایرانی روایتوں سے ہے۔

اس قصے کا تعلق دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی میل جول کے اثرات سے وجود میں آنے والے قصوں اور داستانوں سے ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کا قصہ 'گل بکاولی' کے نام سے معروف ہے۔ یہ قصہ نسیم کا طبع زاد نہیں بلکہ قدیم داستانوں کو اردو میں نظم کیا گیا ہے۔ دیا شنکر نسیم نے 1254ھ (39-1838) میں اس داستان کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ نسیم اردو میں جب اس قصے کو نظم کر رہے تھے تو اپنے سامنے 'مذہب عشق' از نہال چند لاہوری 1217ھ کو پیش نظر رکھا یہ عزت اللہ بنگالی کے فارسی نسخے سے ترجمہ ہے۔ 1260ھ میں مطبع میر حسن رضوی سے پہلی دفعہ یہ مثنوی ترمیم وتصحیح کے بعد بمطابق 1844 میں شائع ہوئی۔

بال مکند بے صبر(1820-1890)

بال مکند بے صبر قادر الکلام اور پر گو شاعر تھے۔ ان کے یہاں وسعت بیان بھی ہے اور قدرت زبان بھی، وہ غالب کے شاگرد تو ضرور تھے اور غالب نے ان کی مثنوی پر اصلاح بھی دی مگر اس میں خیالات کی بلندی نہیں پائی جاتی ہے۔ تہہ داری اور احوال بھی اس طرح کے نہیں بیان کیے گئے ہیں جو اعلیٰ شاعری کی پہچان ہوتی ہے۔ باوجود اس کے علامہ عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

’’محاورات پر یہ عبور، روزمرہ پر یہ قدرت، بیان کی یہ سلاست، کیا ہر شاعر کے نصیب میں ہوتی ہے؟‘‘

(تلامذہ غالب: مالک رام، طبع دوم، مکتبہ جامعہ دہلی، 1984)

ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ اگر کسی تخلیق میں تمام خامیوں کے باوجود کم خوبیاں ایسی ہیں جس کی بنیاد پر وہ تخلیق، تخلیق کے زمرے میں آرہی ہے اور یہ خوبی اس کو زندہ رکھنے اور ہمارے عہد کے لیے لائق اعتنا ہے تو اسے قبول کرلینا چاہیے۔

> ’’مثنوی فریاد داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتہ کی ایک مشہور طوائف منی بائی حجاب کے ساتھ ان کوتھا اور رام پور کا بے نظیر کا میلہ دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی اور روانی وعمدگی ان کی قابل داد ہے۔ علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیاگیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔‘‘

اسی طرح بے صبر کی ’’مثنوی لخت جگر‘‘ بہت ساری خامیوں کے باوجود اہمیت کی حامل ہے۔ اور ایک کامیاب مثنوی ہے اور تقریباً تمام ادباء و محققین نے اس کی ادبی اور زمانی اہمیت کو تسلیم بھی کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مثنوی کے زندہ رہنے اور اسے یاد رکھنے کے لیے یہی کافی ہے۔

'مثنوی لخت جگر' منشی بال مکند بے صبر کی واحد یادگار تخلیق ہے، بے صبر 1810 میں پیدا ہوئے اور 1885 میں ان کی وفات ہوئی۔ بال مکند بے صبر بدیع البدائع، نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے۔ ان کے بیٹے برہما سروپ نے اس رسالے کے آغاز میں سوانح عمری مصنف کے عنوان سے بے صبر کی ولادت، وفات اور تعلیم وغیرہ کے تعلق سے یہ عبارت لکھی ہے۔

’’جناب منشی بال مکند صاحب بے صبر، ساکن سکندر آباد ضلع بلند شہر، 1810 میں بمقام سکندر آباد پیدا ہوئے اور پچھتر برس کی عمر میں 13/ فروری 1885 شیوراتری کو بمقام میرٹھ رحلت فرمائی۔ سولہ برس کی عمر میں فارسی، عربی میں لیاقت کامل حاصل کی اور علوم ریاضی ونجوم وہیئت، منطق اور ویدانت، صوفیہ مت میں بھی دستگاہ بہم پہنچائی۔ بوجہ موزونیت طبیعت خداداد اور بہ صحبت مرزا منشی ہرگوپال تفتہ، کہ ماموں بہ جناب موصوف کے تھے۔ شوق شعر وسخن دامن گیر ہوا۔ آخر کو زانوے ادب بہ خدمت نواب اسداللہ خاں صاحب مرزا نوشہ غالب دہلوی کے تہ کیا۔‘‘

(ہندوستانی قصوں سے ماخوذ، اردو مثنویاں، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، دسمبر 2001)

جب کہ مالک رام کے تلامذہ غالب میں اور کالی داس گپتا رضا نے ’’غالب کا ایک مشاق شاگرد: بالمکند بے صبر میں 1869 بکرمی کو 13-1812 کے مطابق لکھا

ہے اور تقویم کے مطابق یہ درست بھی ہے۔ اب یہ کنفیوژن برقرار ہے کہ آیا برہما سے لکھنے میں غلطی ہوئی یا کاتب سے خطا ہوئی۔ ویسے بے صبر کی تاریخ ولادت اور وفات مختلف محققین نے مختلف لکھی ہے۔

یہ مثنوی 1837 میں لکھی گئی تھی۔ اس کا اول ایڈیشن 1871 میں سہارنپور کے مطبع خورشید جہاں تاب نے شائع کیا تھا، اس کے بعد یہ مثنوی نایاب ہے۔

بال مکند بے صبر اپنے ماموں ہرگوپال تفتہ کے توسط سے مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ بے صبر کو اس بات پر نہ صرف فخر تھا بلکہ غرور بھی تھا کہ وہ غالب کے بلا واسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ہرگوپال تفتہ کی معرفت سے شاگرد ہیں جس کا انھوں نے اپنی شاعری میں اعلانیہ ذکر بھی کیا ہے۔ اور رسالہ ''بدیع البدائع'' میں غالب کے تلمذ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بندۂ نیاز مند بال مکند، المتخلص بہ بے صبر، قوم کا یستھ، رہنے والا قصبہ سکندرآباد علاقہ ضلع بلندشہر کا عرض کرتا ہے کہ بعد تحصیل علم درسی ورسمی کے مجھ کو شوق، انشا پردازی اور سخن طرازی کا دامن گیر ہوا اور زانوے تلمذ خدمت حضرت استاذی مولانا مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دہلوی تہہ کر کے مدتوں خون جگر کھایا۔''

(مثنویات شوق، مرتب رشید حسن خان، طباعت، انجمن ترقی اردو ہند، سنہ اشاعت 1998)

بے صبر نے ''درشان مجمع کمالات صوری ومعنوی حضرت استاذی جناب مولانا اسد اللہ خاں صاحب غالب دہلوی'' کے عنوان سے نوشہ غالب کی تعریف میں چند اشعار نقل کیے ہیں۔ اس میں بھی بے صبر نے غالب سے شاگردی کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی تذکرہ ہے کہ میں تفتہ کے سبب سے صاحب رتبہ ہوا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں ؎

میں بھی ہوں فن شعر ے گرد
شاگردوں کا اس کے ہوں میں شاگرد
آپ اس نے ہی، ہوں میں جس کا مداح
دیوان کو میرے دی ہے اصلاح
تفتہ کے سبب بہ خواہش دل
رتبہ یہ ہوا ہے مجھ کو حاصل
غالب کا ہی وہ بھی خوشہ چیں ہے
میں ہوں، کہیں اور وہ یہیں ہے

کمال یہ ہے کہ بے صبر نے مستعار اجزا اور قصوں کو اس طور پر خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ بیانیہ کا نیا انداز قائم ہو گیا ہے۔ اور قصے کا پرانا پن ظاہر نہیں ہوتا۔ اس طور پر یہ پورا قصہ ہندوستانی قصوں اور کہانیوں کے ضمن میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یا اس سلسلے کی اہم کڑی ضرور کہا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ غالب نے اس پر اصلاح دی ہے، اس طور پر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ غالب کی نظر سے مثنوی کے گزر جانے کے بعد اب کسی طرح کی کمی کا احساس نہیں ہونا چاہیے یا زبان و بیان کی خامیوں کا شائبہ بھی مناسب نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ غالب کی شاگردی اور مرزا تفتہ کی صحبت میں بے صبر کی زبان بھی فارسی زدہ ہو گئی تھی۔

خاص بات یہ تھی کہ بے صبر کا تعلق اس معاشرے سے تھا جو تہذیبی قدروں کا امین تھا۔ ان کا خاندان اور خاندان کے بیشتر لوگ اسی قدیم تہذیب کے پیروکار تھے۔

علامہ شبلی نعمانی (1857-1914)

شبلی نعمانی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ بیک وقت ادیب ونقاد، مترجم ومورخ اور سوانح نگار تھے۔ ماہر تعلیم اور مصلح تعلیم تھے، مستند سیرت نگار اور شاعر بھی تھے۔ شبلی نے مثنوی، 'مثنوی صبح امید' مسدس، تماشائے عبرت یعنی قومی مسدس، قصائد، قصیدہ اردو، تہنیت شادی جسٹس محمود مرحوم، قصیدہ اردو اور قصیدہ مدح سلطان عبدالحمید خاں کہے ہیں۔ اسی طرح جدید مذہبی اور اخلاقی نظمیں کہی ہیں۔ اسی کے ساتھ سیاسی نظمیں، شذراتی نظم اور مرثیہ بربادی خانمان شبلی، کہی ہیں۔ شبلی کا یہ شعری سرمایہ گوکہ کمیت کے لحاظ کم ہے مگر کیفیت اور زمانی ومکانی قدر وقیمت کے اعتبار سے بے حد اہم اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ شبلی کی دیگر تخلیقات کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شبلی نے کم وبیش ادب کے ہر میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ خواہ ادب اور دینیات کا میدان ہو کہ تاریخ وسوانح کا میدان یا کہ تنقیدات، انھوں نے ان میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ بلکہ جدید طرز تصنیف سے اردو کو آشنا بھی کرایا۔ اس تعلق سے مہدی افادی لکھتے ہیں:

''آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز اور فوقیت حاصل ہے، جو ان کے ہم عصروں کے حصے میں نہیں آیا۔ ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ بعضوں نے موضوع سخن ایسا اختیار کیا کہ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو زیادہ جیتے معلوم ہوتے، نذیر احمد اپنی لائق رشک عربیت کے ساتھ بھی کچھ یونہی سے رہے...... حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ شعر وشاعری اور حیات جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانہ کر لیا۔ شبلی قطعاً غیر فانی ہیں۔ آج ہزار صفحے متعدد جلدوں میں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں اور جس پر جو کچھ لکھا گیا ہے کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعہ خیال موجود نہیں۔''

(مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، عبداللطیف اعظمی، شبلی اکادمی، قرول باغ، دہلی، مئی 1945)

یہ سچ ہے کہ مولانا شبلی نے کبھی اپنے شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مگر یہ غلط ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ شاعر نہ تھے یا صرف تفریح طبع کے لیے شاعری کرتے تھے۔ مولانا نے یہ ثبوت عملی طور پر دیا کہ وہ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ ان کی طبع موزوں ہے اور وہ فطری شاعر ہیں۔ جس کی شہادت کلیات شبلی ہے۔ اگر وہ صرف دل بہلانے کے لیے شاعری کرتے تو ان کے مجموعے میں شامل مثنوی، قصیدہ، نظمیں اور وہ خوبصورت غزلیں نہ ہوتیں جو کہ ہیں۔ ایک آدھ غزل کہہ لیتے یا زیادہ سے زیادہ ایک دو نظم کہہ کر مطمئن ہو جاتے۔ مگر نہیں۔ انھوں نے جو بھی کہا، جتنا کچھ بھی کہا، بہت عمدہ، معیاری اور قابل فخر سرمایہ ہے۔ مولانا شبلی نے جو کچھ بھی شعری سرمایہ چھوڑا ہے وہ گراں قدر تحفہ ہے گوکہ وہ کمیت میں کم ہے۔ چوں کہ ان کی جولانی طبع میں کوئی کمی نہیں تھی ان کی فکر اور ان کا خیال کسی اچھے شاعر سے کمتر نہ تھا۔ فنی پختگی بھی فنکاروں سے کم نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ فطری شاعر تھے اور کم وبیش شاعری کی ہے اور ان کا پورا شعری سرمایہ کلیات شبلی بہ اہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی میں محفوظ ہے ان کی مثنوی 'صبح امید' کے اشعار کو اگر ہم بغور دیکھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ واقعی شبلی فطری اور پیدائشی شاعر تھے۔

■

یہ سچ ہے کہ مولانا شبلی نے کبھی اپنے شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مگر یہ غلط ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ شاعر نہ تھے یا صرف تفریح طبع کے لیے شاعری کرتے تھے۔ مولانا نے یہ ثبوت عملی طور پر دیا کہ وہ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ ان کی طبع موزوں ہے اور وہ فطری شاعر ہیں۔ جس کی شہادت کلیات شبلی ہے۔

Md. Rizwan Khan
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9810862283

اردو ریڈیائی ڈراما

منظر پس منظر

پاکیزہ اختر

ریڈیو کے ذریعے کہانی یا افسانہ سننے سنانے کا رواج تقریباً ثلث صدی پر محیط ہے۔ دنیا کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ برصغیر میں خاص طور پر آل انڈیا ریڈیو اپنے مختلف اسٹیشنوں سے مختلف زبانوں میں کہانیاں نشر کرتا رہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے اب تک نہ صرف دنیا کی مختلف زبانوں میں باقاعدہ افسانے بلکہ قسط وار ناول بھی براڈ کاسٹ ہوتے رہے جن میں اردو کے کئی بڑے ناولوں کے نام فخر کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً: مرزا ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا، پریم چند کا ناول گئودان اور رتن ناتھ سرشار کا ناول 'فسانۂ آزاد' وغیرہ قسط وار نشر ہوئے۔ ریڈیو پر کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کی نشریات کے ذخیرے کو وسعت دینے میں اردو کے اکثر مصنفین و فکشن نگاروں کا اہم کردار رہا ہے۔ اردو کے کئی اہم کہانی کاروں نے باضابطہ اردو سے وابستہ ہوکر ریڈیو کے لیے مختلف النوع تحریریں، کہانیاں اور ڈرامے وغیرہ لکھے اور بعض نے مستقل وابستگی نہ رکھنے کے باجود ریڈیو کے لیے ڈرامے اور افسانے تخلیق کیے۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک اردو کے وہ فکشن نگار ہیں جنھوں نے باقاعدہ ریڈیو میں ملازمت اختیار کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے سے ریڈیائی اصناف کو وسعت بخشی۔

ہندوستان میں ریڈیائی ڈرامے کی روایت کا آغاز انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کے قیام کے بعد ہوا اور 1928 سے ریڈیو ڈرامے پابندی سے نشر کیے جانے لگے۔

1930 تک ریڈیائی ڈراموں کی مقبولیت کی رفتار دھیمی رہی مگر اس کے بعد بتدریج ریڈیو ڈراموں کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ سامعین نے بھی ان ڈراموں کی سماعت میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ڈرامہ نگاروں نے بھی اس طرف بھرپور توجہ مرکوز کی۔ آج آل انڈیا ریڈیو کے سبھی مراکز سے ڈرامے نشر کیے جاتے ہیں۔

جہاں تک اردو ادب میں ریڈیائی ڈرامے کی ابتدا کا سوال ہے تو اس کی شروعات 1936 میں آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے ساتھ عمل میں آئی۔ ابتدائی دور میں اردو کے جو ڈرامے ریڈیو پر نشر ہوئے، وہ دوسری زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ تھے۔ اس دور کے مترجمین میں حکیم شجاع، سید علی عابد، فضل الحق قریشی، محمد حنیف، محمد عمرو نورالٰہی غیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو کا پہلا نثری ڈراما جھبرو داس چٹرجی کے بنگالی ڈراما 'من توش' کا اردو ترجمہ تھا جس کو حکیم احمد شجاع نے اردو میں کیا اور ذوالفقار علی بخاری نے اس ڈرامے کو پروڈیوس کیا۔ محمد عمر و نورالٰہی نے مولیئر کے ڈرامے کا ترجمہ 'راگ ڈانٹ' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ ان کے اردو میں ترجمہ کیے ہوئے جو ڈرامے ریڈیو پر نشر ہوئے ان میں تین ٹوپیاں، جان ظرافت، بگڑے دل، ظفر کی موت، چپ کی داد، قزاق اور روح سیاست کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ عابد علی عابد نے انگریزی اور بنگالی ڈراموں کے ترجمے میں دلچسپی لی۔ انھوں نے ٹیگور کے ڈراموں مالن کا چاد یوا پانی، قربانی اور لپناسی کا بھی ترجمہ کیا۔ ان کے اکثر ترجمہ شدہ ڈرامے ریڈیو پر نشر ہوئے۔

اس کے بعد اردو میں براہ راست ریڈیائی ڈرامے لکھے جانے لگے اور ریڈیو پر اردو کے بہت سے ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے نشر کیے جانے لگے۔ جن ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے ریڈیو پر نشر ہوئے، ان میں سے چند اہم نام اس طرح ہیں: امتیاز علی تاج، آغا حشر، میاں لطف الرحمن، عشرت رحمانی، انصار ناصری، انتظار حسین، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، چودھری سلطان، کرتار سنگھ دگل، ابوبکر، رفعت سروش، محمد حسن، محمد خالد عابدی، جاوید اقبال، یوسف ظفر، قیوم نظر، انور جلال، کمال احمد رضوی، شیر محمد اختر، ناصر الدین شمس، صالحہ عابد حسین، عاشق بٹالوی، فیاض محمود، باسط سلیم، غلام عباس، ہاجرہ مسرور، ممتاز مفتی، ضمیر جعفری، بلونت گارگی اور زماں حبیب وغیرہ۔ اردو کے بعض ادیب تو باضابطہ اردو ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور انھوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے جو وقتاً فوقتاً ریڈیو سے نشر ہوتے رہے۔

ریڈیو سے وابستہ اردو کے بڑے ادیبوں میں کرشن چندر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ کرشن چندر باضابطہ ریڈیو میں ملازم تھے۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے بہت سی تحریریں لکھیں جن میں ڈرامے بھی شامل ہیں۔ کرشن چندر کے ممبئی میں قیام کے دوران جو ڈرامے پروڈیوس ہوئے، ان میں 'مس بیلا باٹلی والا'، 'کتاب کا کفن' اہم ڈرامے ہیں۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'دروازہ' کے نام سے شائع ہوا جس میں چھ ڈرامے ہیں: (1) قاہرہ کی ایک شام (2دروازہ (3) حجامت (4) بیکاری (5) نیل کنٹھ (6)

سرائے کے باہر۔

سعادت حسن منٹو کی شناخت اگرچہ افسانہ سے قائم ہے، لیکن وہ ایک اچھے ڈراما نگار بھی تھے۔انھوں نے کئی ڈرامے آل انڈیا ریڈیو کے لیے لکھے جنھیں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ بقول عشرت رحمانی:

''سعادت حسن منٹو 1937 میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ملازم ہوکر آئے اور نثری تکنیک کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے لگے۔ متعدد کامیاب ڈرامے لکھے اور اچھوتی آواز میں اپنے کمالات سے ریڈیو ڈرامہ کو نیا اسلوب بخشا۔ ان کے نثری ڈرامے یہ ہیں۔ کروٹ، ماچس کی ڈبیا، اتوار، خودکشی، نیلی رگیں، رندھیر پہلوان۔ تین موٹی عورتیں، آؤ، مسلسل خاکے، محبت کی پیدائش، نپولین کی موت، قلوپطرہ کی موت، ڈراموں کے مجموعے، منٹو ڈرامے اور جنازے وغیرہ۔''[1]

منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا پہلا مجموعہ 'آؤ' ہے۔ یہ ڈرامہ انھوں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران تخلیق کیا تھا۔ اس مجموعے کے سبھی ڈرامے سیریل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 'آؤ کھوج لگائیں'، 'آؤ چوری کریں'، 'آؤ کہانی لکھیں' اس مجموعے کے مشہور ڈرامے ہیں۔ منٹو کا ایک اور ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل مجموعہ 'تین عورتیں' ہے۔ ان ڈراموں میں عورت کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں پانچ ڈرامے ہیں۔ تین خوبصورت عورتیں، تین موٹی عورتیں، تین صلح پسند عورتیں، تین خاموش عورتیں اور تین بیمار عورتیں۔ ان ڈراموں کو پڑھ کر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ منٹو عورتوں کے مسائل، مزاج اور نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔

راجندر سنگھ بیدی بھی اردو کے وہ ادیب ہیں جنھوں نے ریڈیو کی ملازمت اختیار کی اور ریڈیو کے لیے افسانے، ڈرامے اور مختلف النوع تحریریں لکھیں۔ ریڈیو کے لیے لکھے گئے ان کے ڈراموں کا مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے، جس کا نام 'بے جا چیزیں' ہیں۔ اس مجموعے میں (1) کار کی شادی (2) ایک عورت کی نا (3) روحِ انسانی (4) اب تو گھبرا کر (5) بے جان چیزیں (6) خواجہ سرا، شامل ہیں۔ مجموعے کے پہلے ڈرامے کا نام 'کار کی شادی' ہے۔ اس کے کردار شفیق محمود، بتول، فرحت، زینت، حمید اور اکرم، ابّا جان، اماں جان اور کریمن ہیں۔ اس ڈرامے کا موضوع اگرچہ عام ہے، لیکن خارجی اور داخلی کیفیات کے درمیان ایک توانا فکری کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ اس ڈرامے میں ایک جوڑے کی محبت کی داستان ہے، البتہ اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے محبت سے بڑھ کر دولت اہم ہوتی ہے۔ گویا اس میں دولت مند لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ بیدی کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ 'سات کھیل' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کی فہرست اس طرح ہے: خواجہ سرا، چانکیہ، تلچھٹ، نقل مکانی، آج، رخشندہ، پاؤں کی موچ۔

ریڈیائی تحریروں اور ڈراموں کے حوالے سے شوکت تھانوی کا نام ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ وہ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ میں ملازم رہے۔ اس دوران ان کے قلم سے بہت سی عمدہ تحریریں نکلیں۔ انھوں نے 'منشی جی' کے نام سے ایک سیریز نشر کرائی۔ اس سیریز میں جو ڈرامے نشر ہوئے وہ اس طرح تھے: (1) منشی جی نے کہانی کہی (2) منشی جی نے چائے بنائی (3) منشی جی نے خط لکھا (4) منشی جی نے دواپی (5) منشی جی نے صفائی کی (6) منشی جی نے تصویر کھنچوائی (7) منشی جی سودا لائے (8) منشی جی نے سبق پڑھایا (9) منشی نے سفر کیا (10) منشی جی نوکر ہوگئے (11) منشی جی نے مکان بدلا۔ شوکت تھانوی کا دوسرا ڈراموں کا مجموعہ 'کھی کھی' بھی خاصا مشہور ہوا۔ اس میں بھی گیارہ ریڈیائی ڈرامے ہیں۔ جیسے: پہلی تاریخ، پارٹی کے بعد، تین سو چھیاسٹھ، دریا، جہاں پناہ، آم اور جامن، نقش ونگار، مرقع، مرقع وہی، ڈاکٹر صاحب، دوزخ۔ ان کے 'سنی سنائی' مجموعے میں بارہ ریڈیائی ڈرامے ہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں۔ مگریاں، برلن کا اسپتال، لاٹری کا ٹکٹ، سچ، ماں باپ کا، زندگی بنام زندہ دلی، خدا حافظ، چھوٹا خواب، پارٹی کے بعد، ملازمہ کی تلاش، انتیس کا چاند، سال گرہ۔ مجموعہ 'مجھے خرید لو' میں دس ریڈیائی ڈرامے شامل ہیں: برکھوا، میر صاحب کی عید، اتوار کو ایک ملازم کس طرح مصروف ہوتا ہے، کون جیتا، مقروض، جنوری، رات گئے، سمجھوتہ، الٹ پھیر، خدانخواستہ۔

شوکت تھانوی اپنے ڈراموں میں طنز کا بھی استعمال کرتے ہیں اور مزاح کا بھی لیکن مزاح ان کے ڈراموں پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے ڈراموں کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں نے ریڈیو ڈرامے کے لیے جس قدر بھی تمثیلیں لکھی ہیں۔ ان سب میں اپنے مزاج کا رنگ غالب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ کہیں ریڈیو کے حدود نے مجھ کو کھل کر کھیلنے سے باز رکھا ہے۔''[2]

ریڈیائی ڈراموں کی تاریخ اوپندر ناتھ اشک کے تذکرے کے بغیر ادھوری سی لگتی ہے۔ لاہور ریڈیو اسٹیشن میں قیام کے دوران اشک کا پہلا ڈراما 1938 میں ریڈیو پر نشر ہوا۔ اس ڈرامے کا نام 'پاپی' تھا۔ وہ ریڈیو سے ایک عرصے تک وابستہ رہے۔ انھوں نے ریڈیو میں ملازمت کے دوران متعدد ڈرامے لکھے۔ وہ عورتوں کے مشہور پروگرام 'باجی' کے لیے ہر مہینے ریڈیائی ڈراما لکھتے تھے۔ پاپی نام سے اشک کے ڈراموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل آٹھ ڈرامے شامل کیے گئے ہیں جن کے عنوان اس طرح ہیں: دیوتاؤں کے سائے تلے، بیسوا، حقوق کا محافظ، پاپی، کراس ورڈ، لکشمی کا سواگت، باہمی سمجھوتہ، جوتک۔ ان ڈراموں میں اشک نے سرسید احمد خاں کی طرح سوتے ہوئے لوگوں کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی اور لوگوں کو ان ڈراموں کے ذریعے طنزیہ انداز سے مخاطب کیا۔ بقول اشک:

''جہاں تک معلوم ہے اردو میں سب سے پہلے میں نے ہی ایک بابی ڈرامے لکھے اور سب سے زیادہ تقریباً پچاس ایکٹ کے ڈرامے لکھے جن میں سے دو ایک کو چھوڑ کر سب کے سب نہ صرف ملک بھر کے اسکولوں، کالجوں کے شوقیہ منچوں پر کھیلے گئے۔ ریڈیو پر نشر ہوئے نصاب میں پڑھائے گئے، کچھ دوردرشن پر دکھائے گئے بلکہ جاپان، روس، امریکہ اور انگلستان میں بھی کھیلے گئے۔''[3]

'پاپی' کے علاوہ اشک کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ 'چرواہے' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس مجموعے کے ڈراموں میں زیادہ تر علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ علامتوں کے ذریعے بسا اوقات بات کا اثر بھی بڑھ جاتا ہے اور معنویت بھی۔ اکثر یہ علامتیں دبیز پردوں میں چھپی ہوتی ہیں اور ان کے جلو میں بہت سارے اسرار ہوتے ہیں۔ یہ مجموعہ ان سات ڈراموں چرواہے، میمونہ، مقناطیس، معجزے، چلمن، کھڑکی، سوکھی ڈالی جیسے ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اشک کا ایک اور ڈراموں کا مجموعہ 'پکا گانا' ہے۔ اس میں بھی سات ڈرامے ہیں۔ اس طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اشک نے استقلال کے ساتھ ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھ کر ریڈیائی ڈراموں کے ذخیرے میں کس قدر اضافہ کیا۔

ریڈیائی ڈرامہ نگاروں میں ایک اور نام چودھری سلطان کا ہے جنھوں نے مسلسل ریڈیائی ڈرامے اور فیچر لکھے۔ اس حوالے سے چودھری سلطان کی اپنی پہچان ہے۔ جیسا کہ رسالہ 'آواز' کے 1941 کے شمارے کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

''چودھری سلطان آل انڈیا ریڈیو کے دیہاتی پروگرام میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ ہنسی ہنسی میں بہت سی ایسی کام کی باتیں بتا جاتے ہیں جو دیہاتیوں کے

لیے نہایت فائدہ مند ہوتی ہیں، خصوصاً حالات حاضرہ پر ان کی نکتہ چینی ایسی پر لطف ہوتی ہے کہ اس کے باعث دیہات کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے۔ جب چودھری سلطان کی نوک جھونک غلام محمد یا پنڈت جی سے ہوتی ہے تو اس وقت کا پروگرام سننے کے قابل ہوتا ہے۔ دیہاتی ان کی پر لطف باتیں سننے کے ایسے مشتاق رہتے ہیں کہ جوں جوں شام کا وقت قریب آتا جاتا ہے، ان کا شوق اور بڑھتا جاتا ہے۔''[4]

چودھری سلطان کا ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'سلطان کے ڈرامے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے ڈرامے اپنے سامعین یا قارئین کو تاریخ کی طرف مائل کرتے ہیں، کیونکہ ان کے زیادہ تر ڈرامے تاریخی نوعیت کے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے مذکورہ مجموعے کے ڈراموں کے عنوانات سے کیا جاسکتا ہے جو اس طرح ہیں: راجہ بکرماجیت، شہنشاہ ظہیرالدین بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر، شہنشاہ جہانگیر، قلعے کی سیر، رستم وسہراب، پڑھائی کی عینک، افیم کی ترنگ۔

چودھری سلطان کے یہ ڈرامے وقتاً فوقتاً مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں۔ ان ڈراموں میں بادشاہ ظہیرالدین بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر کے کردار ادا کیے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے نشریات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان ڈراموں میں مکالمہ نگاری اور کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

عشرت رحمانی کا نام بھی نشریاتی ادب کے فروغ کے حوالے سے اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھے اور ڈراموں کی تنقید بھی۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'دکھیا سنسار' مندرجہ ذیل چھ ڈراموں پر مشتمل ہے: دکھیا سنسار، پریم دان، نذرانہ، ایک مصنف، غریب محبت کے لیے، دام خیال۔ جب ہم ریڈیائی ڈراما نگاروں کی بات کرتے ہیں تو اس سلسلے میں کرتار سنگھ دگل کا نام بھی ہمیں بہت اہم نظر آتا ہے۔ ان کا ریڈیو سے براہِ براست تعلق تھا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ کرتار سنگھ دگل کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'اوپر کی منزل' 2012 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ان کے دس ڈرامے شامل ہیں جن کی ترتیب اس طرح سے ہے: کہانی کیسے بنی، بے نور، پائل میں سوئے نغمے، اوپر کی منزل، اپنی اپنی کھڑکی، دومرد اور ایک ماں، امانت، انار کے دوپٹے، اللہ میگھ دے، جھوٹے ٹکڑے۔ 'دیا بجھ گیا' کرتار سنگھ دگل کا مشہور ڈراما ہے جس کے حوالے سے پروفیسر محمد حسن نے کرتار سنگھ دگل کی ڈراما نگاری پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کا ڈراما 'دیا بجھ گیا' فن کا اچھا نمونہ نہیں ہے لیکن 'شور اور سنگیت'، 'میٹھا پانی' اور چند اور ڈرامے کامیاب ڈرامے ہیں اور وہ مختلف سماجی اور نفسیاتی مسائل کو فن کارانہ سلیقے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ 'میٹھا پانی' ایک ایسی عورت کی داستان ہے جو تقسیم ہند کے بعد کے ہنگامے میں بھگائی گئی تھی اور جسے بازیافت کیا جاتا ہے۔ اس داستان کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے پنجاب کی پوری فضا سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح 'شور اور سنگیت' میں گھر کے غسل اور شور کی نفسیاتی توجیہ ہے۔ کس طرح یہ شور ایک ایسی نوجوان عورت کے لیے نفسیاتی الجھن کا سبب بن جاتا ہے جسے ماں بننے کا ارمان تھا اور پھر کس طرح بچہ ہونے پر یہی شور سنگیت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ دگل چھوٹے چھوٹے مکالموں سے بڑا کام لیتے ہیں اور ان کے یہ ڈرامے یقیناً اس دور کے اچھے ڈراموں میں شمار کیے جائیں گے۔''[4]

محمد حسن کا شمار ریڈیو، اسٹیج اور ٹیلی ویژن کے ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ڈرامے خود اسٹیج کیے اور دوسروں کے بھی۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ادارہ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ سے 'میرے اسٹیج ڈرامے' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں محمد حسن کے چھ ریڈیائی ڈرامے شامل ہیں۔ ان ڈراموں کی فہرست اس طرح ہے: ریہرسل، محل سرا، میر تقی میر، موم کے بت، فٹ پاتھ کے شہزادے، گوشۂ عافیت۔ محمد حسن کی ریڈیائی تحریریں، ریڈیو کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تحریر ہوئی ہیں۔ انھوں نے ریڈیو ڈراموں میں لمبے لمبے مکالموں سے گریز کیا اور ان تمام ریڈیائی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ ان ریڈیائی ڈرامہ نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت سے ڈرامہ نگاروں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے۔ ایسے ڈرامہ نگاروں میں رفعت سروش، محمد خالد عابدی، ابوبکر آوارہ، عشرت رحمانی، شوکت تھانوی وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

بعض ادیبوں نے باضابطہ ریڈیو میں ملازمت نہ کرنے کے باوجود ریڈیو کے لیے تسلسل کے ساتھ ڈرامے لکھے یا ان کے ڈرامے ریڈیو پر نشر ہوتے رہے، ایسے ادیبوں میں ایک معتبر نام عصمت چغتائی کا ہے۔ اگرچہ ان کا نام آتے ہی ہمارا ذہن ناول اور افسانے کی طرف جاتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عصمت چغتائی نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور خاص طور پر ریڈیو کے لیے بھی لکھے ہیں۔ ریڈیائی نشریات پر مشتمل ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'شیطان' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مجموعی طور پر چھ ڈرامے ہیں۔ (1) شیطان (2) خواہ مخواہ (3) تصویریں (4) دلہن کیسی ہے (5) شامتِ اعمال (6) دھانی بانکپن۔ عصمت چغتائی کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ 'کلیاں' ہے۔ اس میں افسانے اور ڈرامے دونوں شامل ہیں۔ جن کے عنوان اس طرح ہیں: انتخاب، سانپ، فسادی، ڈھیٹ، بنجے۔ مذکورہ ڈرامہ نگاروں کے علاوہ جن ادیبوں نے ریڈیائی ڈرامے لکھے ان میں میاں لطیف الرحمٰن، رفیع پیرزادہ، سید انصار علی ناصری، مرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، اشتیاق حسین قریشی، حفیظ جاوید، یوسف ظفر، مختار صدیقی، عمیق حنفی، رفعت جمالی، حیات اللہ انصاری، عابد علی عابدی، شمیم حنفی، فضل حسین، وارث احمد خاں، قمر جمالی وغیرہ اہم ہیں۔

ریڈیو ڈرامے پر سیر حاصل گفتگو کا تقاضا ہے کہ ریڈیو ڈرامہ کے فن کو بھی سامنے رکھا جائے اور اس کی تعریف، اقسام، تکنیک، ہیئت وغیرہ کا جائزہ لیا جائے، ساتھ ہی اس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے کہ ریڈیو ڈرامہ اور اسٹیج ڈرامہ کے مابین کیا مماثلت ہے اور کیا تفاوت۔

ریڈیائی ڈرامہ لکھنا ایک فن ہے۔ جو ڈراما نگار

ریڈیو کے لیے ڈرامے تیار کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مائیکروفون کی اہمیت اور اس کی گونا گوں صلاحیت سے بھی واقف ہو۔ ریڈیو ڈرامے فنی نقطۂ نظر سے تکنیکی نقطۂ نظر اور پیش کش کے نقطۂ نظر سے بھی اپنا انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ ریڈیو ڈرامہ چونکہ اسٹیج ڈرامے سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً ریڈیو ڈرامے میں آواز کا سہارا لیا جاتا ہے، پانی کی آواز، سیلاب کی آواز وغیرہ۔ آوازوں کے اس کھیل میں مائیکروفون ساتھ دیتا ہے۔ مائیکروفون ایک ایسا ساتھی اور دوست ہوتا ہے جو آرٹسٹ کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کے متعلق ہریش چندر کھنہ تحریر کرتے ہیں:

''ریڈیو ڈرامے کی تعمیر نشری اسٹوڈیو کی خصوصیات کو ذہن میں رکھ کر کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں ریڈیو کے لیے لکھی گئی کہانی کو اس شکل میں ہونا چاہیے کہ وہ الفاظ صوت اور موسیقی کے ذریعہ پیش ہوسکیں۔''[6]

ریڈیو ڈرامہ ایک نازک فن ہے۔ ڈرامے کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ڈرامہ پروڈیوسر پر ہوتا ہے۔ ڈرامہ پروڈیوسر کا ریڈیو ڈرامہ کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے جب اسے تمام چیزوں سے واقفیت ہوگی تبھی وہ ایک اچھا ڈرامہ پروڈیوس کرسکتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کے درمیان فرق ہے۔ اس لیے کہ ریڈیو کے تقاضے اسٹیج کے تقاضوں سے بہت حد تک مختلف ہوتے ہیں۔ اسٹیج میں سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے جب کہ ریڈیو ڈرامے کا تعلق سماعت سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ریڈیو ڈرامے میں نظر کام نہیں کرتی اور کہانی کا اظہار الفاظ، صوت اور موسیقی کی مدد سے کیا جاتا ہے، اس لیے بیان یا اشارہ نظر نہیں آسکتا۔ ریڈیو ڈرامے میں کہانی کا اظہار اور تعمیر وتشکیل میں دیکھنے اور سننے کے فرق کو اولیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ ریڈیائی ڈرامے اپنی الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی بہت حد تک دونوں کا میدان الگ الگ ہوتا ہے۔ ریڈیو آواز کی دنیا ہے۔ آواز انسانوں کی، سازوں کی، موسموں کی، خوفناک درندوں کی، پرندوں کی اور آندھیوں اور سناٹوں کی وغیرہ۔ صرف آوازوں کے اتار چڑھاؤ اور بہاؤ سے ہی ریڈیائی ڈرامے مرتب کیے جاتے ہیں۔

اسٹیج کی دنیا میں اداکاروں کے وجود اور مکالموں کے علاوہ اسٹیج کی سجاوٹ، مناسب روشنی اور پھر اداکاروں واداکاراؤں کی حرکات وسکنات، نشست وبرخاست، ان کا میک اَپ، ہدایت کار اور سب سے بڑھ کر ڈرامے کے تماش بیں ضروری ہیں۔ مگر ریڈیائی ڈراموں میں ان سب کے بدلے آواز کام کرتی ہے۔ اسٹیج پر جس ضرورت کے تحت مخصوص لباس زیب تن کیا جاتا ہے، میک اَپ کیا جاتا ہے۔ اس ضرورت کو آرٹسٹ صرف اپنی آواز سے پورا کرتا ہے۔ وہ اپنے لہجے کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ کردار کی پوری عکاسی کرسکے۔ ضرورت کے مطابق اسے آواز بدلنی پڑتی ہے۔ ڈراما پروڈیوسر حسب ضرورت پس منظر میں موسیقی کا جادو جگاتا ہے اور بھیڑ بھاڑ مثلاً بازار، ریلوے اسٹیشن یا کھیل کے میدان کا مخصوص شور ان مخصوص آوازوں کی ریکارڈنگ کے سہارے اس طرح پیش کرتا ہے کہ سامعین کو سب کچھ وقوع پذیر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ریڈیو ڈراما نظارے سے محروم رہتا ہے، اس لیے وہ اسٹیج ڈرامے کی طرح تین چار گھنٹے کی مدت پر مشتمل نہیں ہوتا۔ اگرچہ بی۔بی سی سے ڈھائی گھنٹے کا ریڈیو ڈراما نشر ہو چکا ہے۔ پھر بھی ریڈیو ڈرامے زیادہ تر پندرہ منٹ سے لے کر ایک گھنٹے تک کے لکھے جاتے ہیں۔ ریڈیو ڈرامے میں دوہرے پلاٹ کی گنجائش ہے مگر .زیادہ کردار طویل مکالموں، عمل کے وسیع پھیلاؤ اور کہانی کی کشادگی کے متحمل نہیں ہوسکتے، اس لیے کم کردار، اکہرے یا دوہرے پلاٹ مگر کم پیچیدگی کے ساتھ، مختصر، جامع اور گھٹے ہوئے مکالمے، کہانی کی کشمکش اور تصادم کا فوری اظہار ریڈیو ڈرامے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

مختصر طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ ریڈیو ڈراما 'سماعتی فن' اور اسٹیج ڈراما 'نظری فن' کے تابع ہے۔ فن کے اختلاف سے دونوں کی تکنیک اور اسلوب میں بنیادی فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ تین ہزار سال سے ڈرامے کی جو روایت چلی آرہی ہے، وہ بیسویں صدی میں نئی شکلوں میں سامنے آئی ہے۔ بہرکیف ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں، دونوں، کا مقصد انسان کی زندگی کی تشریح وتعبیر ہے۔ ان دونوں ڈراموں نے علم وفن کے بدلتے ہوئے افکار و خیالات کو اپنے قالب میں جگہ دی ہے۔ زندگی کو مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے اور سامعین وناظرین کو اپنے فن سے لطف اندوز کیا ہے۔

معروف ناقد احتشام حسین ریڈیو ڈرامے کو مکمل ڈراموں کی راہ کی رکاوٹ قرار دینے کے باوجود اس کی انفرادیت واہمیت کے قائل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ریڈیو کی ضروریات کے لیے ریڈیو ڈرامے کی شکل میں بنیادی تبدیل ہوئی اور لکھنے والوں کی تکنیک کے معاملے میں خاص طرح کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔''[7]

ریڈیائی ڈرامہ نگاروں نے اپنے ڈراموں میں زندگی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ یہ ڈرامے نشر بھی ہوئے اور اسٹیج بھی اور ساتھ ہی ساتھ شائع بھی ہوئے۔ یہ ڈرامے نصیحت آموز ہیں اور ان میں طنز ومزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ڈرامے مکالمہ نگاری کے حوالے سے کامیاب ہیں۔ میری ذاتی رائے کے مطابق ان ڈراموں سے اردو ادب کو بے حد فائدہ پہنچا۔ سامعین ان ڈراموں کو دلچسپی سے سنتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ دھیرے دھیرے ریڈیو کا چلن کم ہوا تو ان کی مقبولیت میں بھی کمی واقع ہوئی۔ ریڈیائی ڈرامے مقررہ وقت پر سنے جاتے تھے اور پھر دوبارہ سامعین ان کو سن نہیں سکتے تھے، لیکن جب یہ ڈرامے کتبی صورت میں شائع ہوئے تو قارئین نے اس بات کو محسوس کیا کہ اب تو کسی بھی وقت ان ڈراموں کو پڑھا جاسکتا ہے اور چونکہ ریڈیو پر جو ڈرامے نشر ہوا کرتے تھے تو ڈراما نگاروں کو کم وقت میں پورا ڈراما پیش کرنا ہوتا تھا، اس لیے ان ڈراموں میں طویل مکالموں سے گریز کیا جاتا تھا اور کرداروں (تعداد) کی پیش کش بھی کم ہوتی تھی۔ بہرحال ان تصانیف کی اہمیت ومقبولیت اگلے زمانوں میں بھی رہے گی اور انھیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

ریڈیائی ڈرامہ نگاروں نے اپنے ڈراموں میں زندگی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ یہ ڈرامے نشر بھی ہوئے اور اسٹیج بھی اور ساتھ ہی ساتھ شائع بھی ہوئے۔ یہ ڈرامے نصیحت آموز ہیں اور ان میں طنز ومزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ڈرامے مکالمہ نگاری کے حوالے سے کامیاب ہیں۔ میری ذاتی رائے کے مطابق ان ڈراموں سے اردو ادب کو بے حد فائدہ پہنچا۔ سامعین ان ڈراموں کو دلچسپی سے سنتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔

حواشی:

(1) اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید عشرت رحمانی ص244
(2) نشریات تاریخ، اصناف اور پیش کش از زبیر شاداب، ص 252-253
(3) نشریات، تاریخ، اصناف اور پیش کش از: زبیر شاداب، ص243
(4) اردو میں نشریاتی ادب، از ڈاکٹر محمد شکیل اختر ص168
(5) رسالہ آج کل ڈراما نمبر جنوری 1959ء دہلی، ص26
(6) ریڈیو نشریات آغاز وارتقاء۔ حسن مثنیٰ، ص202
(7) جدید اردو ڈراما اور اس کے بعض مسائل، از: احتشام حسین۔ آج کل ڈراما نمبر، 1959، ص8

■

Ms. Pakeeza Akhtar
Marazigund Rafiabad
Baramulla Kashmir - 193303 (J&K)

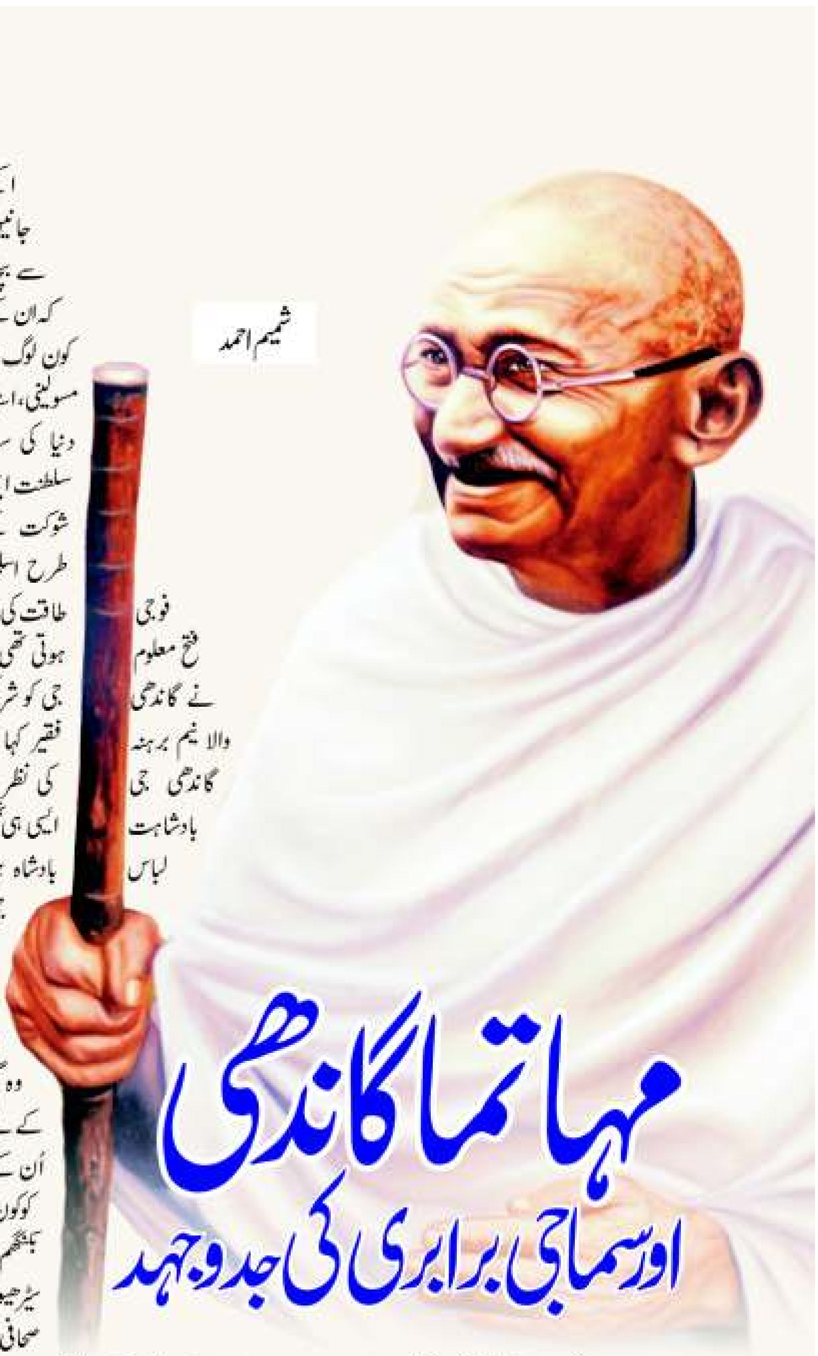

مہاتما گاندھی

اور سماجی برابری کی جدوجہد

شمیم احمد

موہن داس کرم چند گاندھی کی زندگی اوران کا پیغام برصغیر کی روح میں اسی طرح رواں دواں ہے جیسے مصفّی دریائے گنگا رواں ہے۔ ان کے تصورات اور سرگرمیوں نے کبھی نہ منقسم ہونے والی ہماری لہروں کی طرح کئی افراد اور جمعیتوں کو متاثر کیا ہے۔ ہماری معاصر دُنیا میں کوئی شخص کس طرح اس انتہائی غیر معمولی روشنی کا صحیح احساس کرسکتا ہے جس نے دنیا بھر کو منور کیا۔ ایک ایسی شمع جس نے منکسر المزاجی کو فروغ دیا اور دُنیا کے روشن ترین شہروں میں جگمگائی؟ یہ پیار، اُمید اور امن کی شمع تھی۔

گاندھی جی کی شخصیت بیسویں صدی کا حقیقی معجزہ تھی۔ ایک ایسی صدی جس کے ابتدائی پچاس سالوں میں سات کروڑ سے زیادہ لوگوں کی جانیں تلف ہوئیں اور شاید یہ کہ گاندھی نے اپنی روحانی طاقت کے استحکام سے اکیلے ہی مزید جانیں ضائع ہونے سے بچالیں۔ غور کیجیے کہ ان کے معاصرین میں کون لوگ شامل تھے، ہٹلر، مسولینی، اسٹالین، اور ماؤ اور دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ پوری طرح اسلحہ سے لیس اور فوجی طاقت کی حامل، جو ناقابل فتح معلوم ہوتی تھی۔ ونسٹن چرچل نے گاندھی جی کو شرانگیزی پھیلانے والا نیم برہنہ فقیر کہا تھا۔ جب کہ گاندھی جی کی نظر میں چرچل کی بادشاہت ایسی ہی تھی جیسے کوئی بے لباس بادشاہ ہو۔ لیکن گاندھی جی نے اسے اتنی ناشائستگی سے ادا نہیں کیا۔

1932 میں جب وہ گول میز کانفرنس کے لیے لندن میں تھے اُن کے اُس مشہور تبصرہ کو کون بھول سکتا ہے؟ بکنگھم پیلیس کی سیڑھیوں پر ایک انگریز صحافی نے اُن سے پوچھا ''مسٹر گاندھی، کیا آپ عظیم الشان سلطنت کے عظیم بادشاہ سے ملنے کے لیے ایک ادھ ننگے فقیر کی صورت میں جارہے ہیں؟''

گاندھی جی نے جواب دیا ''میرے دوست تم گھبراؤ نہیں حکمراں بادشاہ اتنے کپڑے پہنے ہوگا کہ وہ ہم دونوں کے لیے کافی ہوں گے۔''

موہن داس کرم چند گاندھی ہم میں سے زیادہ تر کی طرح ایک عام سے طالب علم تھے۔ وہ ایک شرمیلے اور منکسر المزاج وکیل بن گئے۔ اپنے اہل خاندان کی مدد کے لیے انہوں نے جنوبی افریقہ میں چھوٹے ہندوستانی تاجروں، مشروط مزدوروں اور وہاں کی افریقی آبادی کے درمیان وکالت کرنے کا فیصلہ کیا۔ 23 سال کی عمر میں، جب انہیں ناتل میں ایک چھوٹا کیس ملا تو وہ بذریعہ جہاز بمبئی سے ڈربن کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ وہاں مختصر مدت کے لیے گئے تھے لیکن تقریباً 21 برس رہے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کی تاریخ بدل ڈالی اور دنیا میں ہر جگہ کے مردوزن کو سیاسی آزادی سے بڑھ کر سماجی برابری کی جدوجہد کی تحریک دی۔

گاندھی جی نے اختیار سے محروم لوگوں کو با اختیار بنایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انسانی روح خدا کا عطا کردہ سب سے قوی تحفہ ہے۔ شاید انسانی تاریخ میں سب سے بڑھ کر انھوں نے انسانی روح کی قوت کو سمجھا۔ ایک ایٹم میں چھپی طاقت کی طرح، انھیں روح کی لافانی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ جو اپنی تمام تابانی کے ساتھ رہا ہونے کی منتظر ہے۔

انھیں یہ غیر معمولی تصورات اپنے مطالعے سے ملے۔ وہ گہری تخلیقیت کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ کوئی انسانی فکر اُن کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ صرف 19 سال کی عمر میں جب وہ لندن میں تھے انھوں نے مغربی کلچر کے عظیم ادیبوں، رسکن، ٹالسٹائی اور تھورو کا مطالعہ کرلیا تھا۔ لندن میں اُن کے قیام نے ہندوستانی تمدن پر کتابوں کے مطالعہ نے اُن کے طبعی میلان کو اور ہوا دی۔ انھوں نے سب سے پہلے بھگوت گیتا کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ ان کی والدہ، ان کا ماحول اور بچپن کے کچھ دوستوں کی صحبت سے اُن کے جوان احساسات کی تربیت ہو ہی چکی تھی۔ حضرت عیسیٰ کے مشہور زمانہ پہاڑی وعظ اور لاطینی، یونانی نیز انگریزی کی کتابوں نے ان کی بالغ فکر کی تشکیل کی۔

23 / برس کی عمر میں ایک نوجوان وکیل کے طور پر جب وہ جنوبی افریقہ گئے تو اُن کی یہ روشن خیالی سب سے زیادہ قابل حصول قوت حیات بن گئی۔ ہر نسل و ذات کے لوگ اُن کے دوست بن گئے، یہودی، عیسائی، مسلمان، پارسی، ہندو- اُمرا اور مزدور، مبلغین واساتذہ، سیاستداں و دانشور، کلرک اور مذہبی رہنما۔ انھوں نے کہا، اور زور دے کر کہا کہ اگر تم انصاف چاہتے ہو تو دوسروں کے ساتھ انصاف کرو۔ اُن کی دنیا میں کسی کے اخراج کا کوئی جواز نہیں تھا۔ زندگی سب کی شمولیت کا نام ہے۔

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ 7 جون 1893 کی ایک سرد رات میں انھیں ریل گاڑی کے فرسٹ کلاس کے ڈبے سے اس وقت باہر نکال دیا گیا جب وہ وکیلوں کے خوش وضع لباس میں ڈربن سے پریٹوریا جارہے تھے۔ وہ گارڈ جس نے انھیں انتہائی غیر مہذب طریقے سے نکال باہر کیا شاید ہی اپنے بے سوچے سمجھے اور سخت گیر رویے کے اتنے غیر معمولی اور دور رس نتائج کا اندازہ کرسکا ہوگا۔ اگلے پچاس سال کے اندر عظیم الشان سلطنت ٹوٹ

چھوٹ کر رہ گئی اور نسلی تفریق کی ایک ایسی بیماری کے طور پر تشخیص ہوئی جس کا علاج ضروری تھا۔ اور یہ بالخصوص مہاتما گاندھی کی وجہ سے ہوا۔

ہندوستان کی ایک اہم صورتِ حال جس نے گاندھی جی کو اندر تک جھنجوڑ ڈالا، وہ چھوت چھات کا رواج تھا، وہ ورن شرم، یعنی پیشہ ورانہ اعتبار سے سماج میں کی جانے والی تقسیم پر تو یقین رکھتے تھے لیکن اس اصل فکر کی جگہ ذات پات کے سخت گیر نظام کو انھوں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ انھوں نے لکھا کہ ''نہ صرف یہ کہ چھوت چھات ہندو مذہب کا نہ حصہ ہے نہ اس کی دین بلکہ ایک وبا ہے، اور ہر ہندو پر لازمی فرض ہے کہ وہ اس کا قلع قمع کرے۔''

گاندھی جی کا ماننا تھا کہ اس سماجی نابرابری نے ہندوستان کو اقتصادی طور پر تاراج کر دیا۔ اچھوتوں کی حالت سے گاندھی جی کو سخت صدمہ پہنچا، ان لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کی انتہا یہ تھی کہ انھیں کوڑھ کے مریض کی طرح خود سے دور کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ ذات کے افراد انھیں چھوتے نہیں تھے اور اگر بھولے سے وہ کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس غریب کو بری طرح پیٹا جاتا تھا۔ دوسری ضروریات کا تو ذکر ہی کیا اچھوتوں کو پانی کے لیے بھی ہاتھ پھیلانے پڑتے تھے کیونکہ گاؤں کے کنویں سے انھیں پانی لینے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مندروں میں قدم رکھ نہیں رکھ سکتے تھے۔ لوگوں نے اس خدائی حکم کو بھلا دیا تھا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اسی لیے گاندھی جی نے چھوت چھات کے خاتمے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ انھوں نے اچھوتوں کو ہری جن نام دیا یعنی خدا کی مخلوق۔ انھوں نے سماجی برابری کے قیام کے لیے اچھوتوں کے ساتھ راتیں گزاریں۔ ان کے گھروں میں قیام کیا، مندروں میں انھیں داخل کرانے کے لیے فاقے کیے اور اپنی پوری زندگی سماجی مساوات کے لیے وقف کر دی۔

ان کا خیال تھا کہ بھوک مری اور غریبی کی بڑی وجہ وہ مٹھی بھر امیر لوگ ہیں جنھوں نے سماجی نابرابری کو ہوا دے رکھی ہے۔ جب تک چند امیروں اور لاکھوں بھوکوں کے درمیان موجود خلیج ختم نہیں ہوتی، عدم تشدد پر مبنی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ سماجی برابری اور استحکام کے لیے انھوں نے دان یا ٹرسٹ بنانے کے نظام کی تلقین کی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امیر لوگ اپنی دولت اپنے پاس ہی رکھیں لیکن صرف اس قدر جس سے اُن کی ذاتی ضروریات خاطر خواہ حد تک پوری ہو جائیں اور باقی دولت وہ ایک ٹرسٹی کی طرح سماج کے باقی افراد کے لیے خرچ کریں تاکہ سماجی برابری کا نظام قائم ہو سکے۔

سماج اور بالخصوص ہندوستانی سماج میں عورتوں کے ساتھ نابرابری کا رویہ بھی گاندھی جی کو کسی طور پر قبول نہیں تھا۔ خواتین کے حقوق کی حصولیابی کے لیے وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ عورتیں مردوں کی ساتھی ہیں۔ جنھیں وہی ذہنی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو مردوں کو ملی ہیں۔ انھیں سماج کے تمام کاموں میں حصہ لینے کا پورا پورا حق ہے اور ساتھ ہی انھیں آزادی کا یکساں حق بھی حاصل ہے۔ گاندھی جی کی ستیہ گرہ کی تحریک نے ہندوستانی خواتین کو برابر کا موقع عطا کیا کہ وہ مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر تحریک میں حصہ لے سکیں۔ احتجاج میں شریک ہوسکیں اور اگر قربانی دینے کا وقت آئے تو اپنی جان بھی نچھاور کر سکیں۔

سماجی برابری کی اس جدوجہد میں گاندھی جی نے سب سے زیادہ تاکید اس بات پر کی کہ سماج میں سب کو تعلیم کا حق ہونا چاہیے۔ حصول تعلیم کے ذریعے اچھوتوں اور عورتوں کو اپنے حقوق کا علم ہوگا۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم کی کمی نے سماج کے ان پسماندہ طبقوں کو سماجی و سیاسی اقتدار سے ہی نہیں علم کی طاقت سے بھی محروم رکھا ہے۔ اسی لیے نہ صرف یہ کہ انھوں نے ان سبھی محروم طبقوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کی وکالت کی بلکہ میونسپل کمیٹیوں پر دباؤ ڈالا کہ اسکولوں میں داخلے کے وقت سب کو برابر کا موقع دیا جائے۔ انھوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ سب کے لیے آمدنی کے یکساں مواقع کی پرزور سفارش کی۔ سماج کے کسی بھی فرقے یا طبقے کو مذہب کے نام پر، ذات پات کے نام پر، جنس کے نام پر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ سب کو برابری کا حق حاصل ہے۔ ہندو مسلم، سکھ عیسائی ہندوستان کے رہنے والے سبھی باشندوں کو اپنی زندگی گزارنے اور اسے بہتر بنانے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ اپنی معاش، اپنے روزگار کا انتخاب خود کر سکتے ہیں۔ انھیں اپنے سیاسی لیڈروں کے انتخاب کا حق بھی حاصل ہے۔ جمہوری نظام میں وہ ووٹ دے کر اپنے نمائندے چن سکتے ہیں اور ان کی کارگزاری بہتر نہ ہونے کی صورت میں ان کا بدل بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔

گاندھی جی کو حق و صداقت پر بے پناہ یقین تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سچائی کے قیام کے لیے جدوجہد جاری رکھنی چاہیے لیکن یہ جدوجہد عدم تشدد پر مبنی ہے۔ ان کے فکری اور عملی نظام میں تشدد کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ انھوں نے لکھا ہے ''جب میں عدم تشدد پر نظر کرتا ہوں، حق کہتا ہے، اسے میرے وسیلے سے تلاش کرو، جب میں حق پر نظر کرتا ہوں، عدم تشدد کہتا ہے اسے میرے وسیلے سے تلاش کرو۔'' حق اور عدم تشدد میں اپنے بے پناہ عقیدے کے ساتھ وہ سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کو عوامی تحریکات کا روپ دینے میں کامیاب ہوئے اور یہی وہ تحریکات تھیں جسے انھوں نے ستیہ گرہ کا نام دیا۔

انسانی توقیر اور جدوجہد کے تصور پر ستیہ گرہ کا قیام عمل میں آیا۔ لفظ ستیہ یعنی حق سنسکرت کے لفظ 'ست' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ہستی یا ازلی اور ابدی طور پر موجود ہونا اور آگرہ کے معنی ہیں جدوجہد اور استقامت سے ڈٹے رہنا۔

سادہ، شریف النفس اور دھان پان سے نظر آنے والے مہاتما گاندھی نے آزادی اور انسانی حقوق کے عظیم مقاصد کے لیے ایک فرد کے طور پر خود کو قربان کر دیا۔ اپنی شہادت سے وہ صداقت اور عدم تشدد کے ان اصولوں کی علامت بن گئے جن کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ حالاں کہ وہ گہرے غور و فکر میں ڈوبے رہنے والے انسان تھے۔ لیکن برقی توانائی کی حامل ان کی شخصیت نے انھیں ایک عملی آدمی بنا دیا تھا۔ اسی توانائی نے انھیں عداوت، مخالفت اور ترش روئی سے پیدا ہونے والے احتجاج کا سامنا کرنے کا حوصلہ دیا۔ انھوں نے کہا تھا، ہم جس تبدیلی کے خواہش مند ہیں پہلے ہمیں خود میں وہ تبدیلی لانی چاہیے۔'' گاندھی جی نے اپنے کردار اور شخصیت سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف کوئی نظریہ پیش کرنے والے نظریہ ساز نہیں ہیں بلکہ عمل سے ثابت کر دکھانے والے ایک عظیم مصلح ہیں۔ ان کی زندگی پر غور کیجیے۔ سماجی برابری کے قیام کے لیے انھوں نے وہی طرز زندگی اختیار کی جو محروم افراد کا طرزِ زندگی تھا۔ انھوں نے وہی لباس پہنا جو عام ہندوستانی کا لباس تھا۔ وہی سادہ سی کاشتکاروں والی زندگی اختیار کی۔ آشرم قائم کیے۔ ایسے آشرم جہاں سبھی ہندوستانی بلا امتیازِ رنگ و نسل و مذہب مل جل کر رہتے تھے۔ جہاں سب کو اپنے خدا کو اپنے طور پر یاد کرنے کا حق حاصل تھا۔ کوئی کسی سے بڑا نہیں تھا اور کوئی کسی سے نیچے نہیں تھا۔ گاندھی جی نے اپنے ہر عمل سے ثابت کر دکھایا کہ سماجی برابری کے تصور کو کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔

ان کا ماننا تھا کہ ''کسی بات میں یقین کرنا اور اپنی زندگی میں اس پر عمل نہ کرنا بے ایمانی ہے۔'' گاندھی جی نے ایمان داری کے اسی راستے کو منتخب کیا جس بات پر یقین کیا اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آج بھی ان کا یہ پیغام گہری معنویت کا حامل ہے۔ اسی پر عمل پیرا ہو کر ملک میں حقیقی سماجی مساوات قائم ہو سکتی ہے۔

■

Dr. Shamim Ahmed
Head, Dept of Urdu and Persian
St. Stephen's College
Delhi University
Delhi - 110007

تعلیمی بیداری اور سرسید احمد خاں

محمد خالد ظہیر

دنیا جب سے وجود میں آئی اور انسانی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا، جب سے اب تک کروڑوں لوگ اس دنیا میں آئے۔ کتنوں کے نام ونشان مٹ گئے اور نسلیں کی نسلیں ختم ہوگئیں لیکن انھی کروڑوں لوگوں میں کچھ ایسی شخصیات بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا میں مبعوث کیں، جنھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور اپنے انمٹ نشان اس دنیا میں چھوڑ کر ایک تاریخ مرتب کر گئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تاریخ شخصیتیں پیدا کرتی ہے، لیکن کچھ شخصیات تاریخ آفریں ہوتی ہیں اور اپنے کارناموں سے پہچانی جاتی ہیں۔ ایسی ہی شخصیات کے بارے میں علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گوہر نایاب سرسید مرحوم ایسی ہی شخصیت کا نام ہے، جن کے کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ یہاں ہم ان کے ایک بڑے کارنامے 'تعلیمی بیداری' کی بات کرنے سے پہلے ان عوامل پر اجمالی بحث کریں گے جنھوں نے سرسید کو اس طرف راغب کیا اور ان میں تعلیمی شعور بیدار ہوا، قوم کا درد اور فکر پیدا ہوئی۔

در اصل اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور چھوٹی چھوٹی علاقائی سلطنتوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ انگریز جو کہ موقعے کی تلاش میں تھے انہوں نے ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو اپنی کمال ہوشیاری سے اپنی حکومت میں ضم کر لیا۔

1838 میں قحط کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائی تبلیغی مشنریوں نے ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے بہانے ہندوستانیوں کو بالواسطہ عیسائی مذہب اختیار کرانے کی مہم شروع کر دی۔ اس مہم میں انگریز سرکار نے عیسائی مشنریوں کا خفیہ طور پر پورا تعاون کیا۔ ہندوستانی قوم یعنی ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب کی حفاظت کرنے کے راستے تلاش کرنے لگے۔ مسلم قوم اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ نہیں تھی۔ وہ سماجی، مذہبی، علمی اور معاشی طور پر ہر طرح سے روبہ زوال تھی۔ مذہب صرف برائے نام تھا، بنیادی عقائد کا تصور بدلنے لگا تھا، تو ہم پرستی نے اپنی جڑیں جمالی تھیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں انتشار اور بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی۔ 1857 کی جنگ آزادی جس کو انگریز غدر کا نام دیتے ہیں، جس کی شروعات میرٹھ سے ہوئی تھی۔ اس میں بھی مسلمانوں کا جانی و مالی اور علمی یعنی ہر طرح سے بڑا نقصان ہوا تھا۔ کیوں کے انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی، لہٰذا انگریزوں کے مظالم مسلمانوں پر زیادہ ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بڑی بڑی اذیت ناک سزائیں دیں۔ ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ ہزاروں علما اور مسلمانوں کو تختۂ دار پر چڑھا دیا اور ان کی جائدادیں قرق کر لیں۔ سرسید نے یہ حالات اپنی نظروں سے دیکھے تھے۔ یہی وہ عوامل ہیں جن کی وجہ سے سرسید کا دردمند دل تڑپ اٹھا اور اپنی قوم کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کی فکر پیدا ہوئی۔ خدا شناس اور قوم کے نباض مرد مجاہد سرسید مرحوم جب قوم کی بھلائی کی طرف رجوع ہوئے اس وقت مسلمانوں کی حالت بہت زار تھی۔

انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی بیزاری کا یہ عالم تھا 'حیات جاوید' میں مولانا حالی رقم طراز ہیں کہ:

''کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ

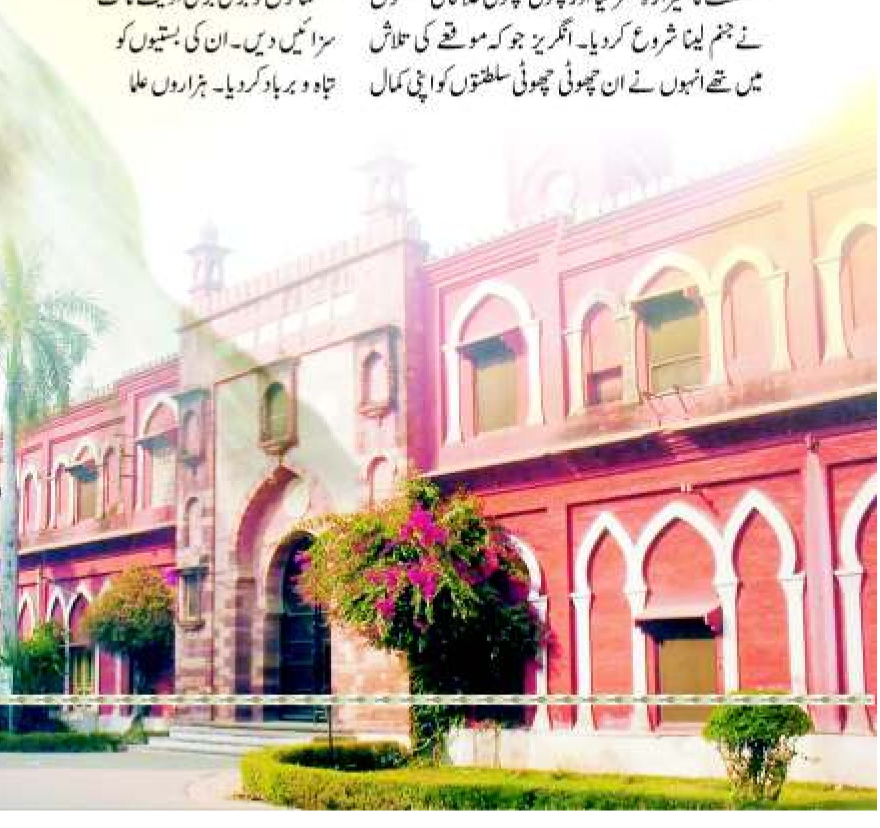

گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے۔ اس درخواست کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔'' (حیاتِ جاوید، ص 427)

اس بات میں کافی سچائی تھی۔ ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمان مذہب کے معاملے میں زیادہ حساس اور سخت گیر تھے۔ انگریزی اسکولوں میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بھلا مسلمان قوم اس کو کیسے برداشت کرتی۔ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ خود سرسید ان باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بذاتِ خود انھوں نے اس کے خلاف بار بار آواز اٹھائی اور ایجوکیشن کمیشن کے رو بہ رو شہادت دیتے ہوئے اس طرزِ تعلیم کی مذمت کی۔ ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرسید نے انگریزی اور جدید تعلیمی نظام کا منصوبہ تیار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اپنی قوم کو دوسری قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا اور ترقی کرنا ہے تو انگریزی اور جدید علوم کا حاصل کرنا لازم ہے۔ لہٰذا انھوں نے علی گڑھ کو تعلیمی مرکز بنایا اور جدید تعلیم کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے مراد آباد میں ایک انگریزی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا۔ اس کے بعد ایک مدرسے کی غازی پور میں بنیاد رڈالی۔ غازی پور میں ہی 9/ جنوری 1863 میں ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی جو آگے چل کر 'سائنٹیفک سوسائٹی' کے نام سے مقبول ہوئی۔ اس سوسائٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جتنی بھی نایاب اور جدید علوم کی کتابیں ہیں انھیں شائع کیا جائے اور انگریزی و دیگر علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ جدید علوم تک ہندوستانی قوم کی رسائی ممکن ہو سکے۔ یہ 'سائنٹیفک سوسائٹی' بعد میں مستقل طور پر علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام علومِ جدید کی تقریباً چالیس کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

1866 میں 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' قائم کی، جس کا مقصد انگریز حکومت سے اپنے جائز حقوق لینا تھا۔ چنانچہ اسی انجمن کے توسط سے 1867 میں حکومت برطانیہ سے ورنا کیولر یونیورسٹی کی مانگ کی تھی۔

1866 میں ایک ہفتہ وار اخبار 'دی علی گڑھ گزٹ' جاری کیا جس میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کالم ہوتے تھے۔

یکم اپریل 1866 میں ولایت کا سفر کیا یہ سفر سرسید اور ہندوستانی قوم کے لیے سودمند ثابت ہوا۔ سرسید ایک

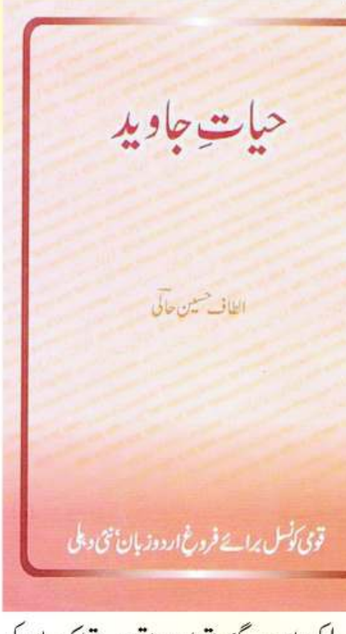

مقصد لے کر ولایت گئے تھے اور وہ مقصد یہ تھا کہ وہاں کی تعلیمی ترقی اور سرگرمیوں کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا جائے۔ ان کے تعلیمی اصولوں اور قدروں کو سمجھ کر اس روشنی میں ہندوستانی قوم کے لیے ایک ایسا تعلیمی نصاب تیار کیا جائے جس کے ذریعے مشرقی و مغربی علوم کے اقدار کا امتزاج پیدا ہو سکے اور رجعت پسندی کو دور کیا جا سکے۔ مسلمانوں میں ایک نئی طرزِ فکر پیدا ہوا۔ ان کا ذہن بیدار ہوا اور ان کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہو جائیں۔ سرسید چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم ہو جس میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مغربی علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ ان میں ایک نئی سوچ و فکر پیدا ہو، قوم میں بالغ نظری اور ذہنی بیداری پیدا ہو سکے۔ یہ قوم اپنی صلاحیتوں کے ذریعے سرخ روئی حاصل کر سکے اور مختلف میدانوں میں ترقی کر کے ملک و قوم کا نام روشن کر سکے۔ سرسید اچھی طرح جانتے تھے کہ صرف مذہب اور فلسفہ کی تعلیم زندگی گزارنے کے لیے کافی نہیں، اگر ترقی کرنی ہے، تو جدید علوم، سائنس و ٹکنالوجی اور معاشیات کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ تبھی ہم دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چل سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سرسید نے برطانیہ میں بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ وہاں کے تعلیمی نظام کا گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ کیا، خاص طور پر 'کیمبرج یونیورسٹی' کے طریقۂ تعلیم اور اس کے نظم و نسق کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا، بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان میں اس طرح کی یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ کیا۔

2/ اکتوبر 1870 کو ہندوستان واپس آئے اور اپنے مشن میں جان و مال اور دل سے لگ گئے۔ ان کو شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ علما نے کفر کا فتویٰ لگایا، لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ سرسید نے اپنے مقصد کو واضح کرنے اور مخالفتوں کو ختم کرنے کے ارادے سے ایک معیاری اخبار 'تہذیب الاخلاق' کا اجرا کیا۔ اس بارے میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ:

''اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو کامل درجے کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔ اس تہذیب سے مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت، تمدن اور طریقۂ تمدن اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت ہی خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے۔ تمکنت و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''

(سرسید کی تعلیمی مہم اور اس کا پس منظر، ڈاکٹر ارشاد علی، ص 207، مطالعہ سرسید احمد خاں، عبدالحق)

26 دسمبر 1870 میں بنارس میں 'کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان' قائم کی۔ اس کمیٹی کے زیرِ اہتمام ایک انعامی اشتہار جاری کیا گیا کہ لوگ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مضامین لکھیں۔ اشتہار کے جواب میں صرف 32 مضامین موصول ہوئے تھے۔ ان مضامین کا

سر سید اچھی طرح جانتے تھے کہ صرف مذہب اور فلسفہ کی تعلیم زندگی گزارنے کے لیے کافی نہیں، اگر ترقی کرنی ہے ،تو جدید علوم، سائنس و ٹکنا لوجی اور معاشیات کا علم ہونا بہت ضروری ہے ۔تبھی ہم دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چل سکتے ہیں۔ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سر سید نے برطانیہ میں بڑی بڑی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ وہاں کے تعلیمی نظام کا گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ کیا، خاص طور پر 'کیمبرج یونیورسٹی' کے طریقۂ تعلیم اور اس کے نظم و نسق کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا، بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان میں اس طرح کی یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ کیا۔

خلاصہ 'پائنیر اخبار' میں شائع ہوا تھا۔ جس میں مختلف رائے پیش کی گئی تھیں اور ان مضامین کو سامنے رکھ کر تین نکاتی رپورٹ تیار کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ (1) مسلمان جدید تعلیم کو اپنے بچوں کے لیے مضر خیال کرتے ہیں۔ (2) سرکاری اسکولوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ناقص ہے۔ (3) ضروری ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کا بندوبست خود کریں۔ یہ تعلیم ایسی ہو جس میں ان کے مذہب اور تہذیب کا لحاظ رکھا گیا ہو اور یہ رپورٹ حکومتِ ہند کو پیش کی گئی۔

24 مئی 1875 میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی جس میں سرسید کے تین مقاصد تھے۔

اول مقصد ایک انگریزی مدرسہ قائم کرنا جس میں انگریزی ذریعۂ تعلیم ہو اور تمام انگریزی علوم و فنون پڑھائے جائیں۔ یہ مدرسہ ایک ایسی جماعت تیار کرے جس میں سائنس و ٹکنالوجی جیسے علوم پر اعلیٰ درجے کا عبور اور فہم ہو سکے، یعنی جدید علوم سے استفادہ کیا جا سکے۔

دوم ایسا مدرسہ جس میں سارے علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان میں ہو۔ سرسید خود اس بات سے اتفاق رکھتے تھے کہ تعلیم مادری زبان میں ہو۔ کیوں کہ مادری زبان میں تعلیم سہل اور فہم دونوں میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ برطانیہ میں تعلیم وہاں کی زبان میں ہوتی ہے۔ اس لیے وہاں کے لوگوں کی طرز فکر، سوچ اور فہم اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ تعلیم کا مادری زبان میں ہونا بہت ضروری ہے۔

سوم مقصد یہ تھا کہ عربی و فارسی مدرسہ قائم کیا جائے تا کہ انگریزی اور اردو کے فارغ طلبا عربی و فارسی علوم و فنون سے واقف ہوں اور ہماری اسلامی تہذیب و تمدن اور قدریں محفوظ رہ سکیں۔

سرسید کے ان مقاصد سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید چاہتے تھے کہ میری قوم نہ صرف یہ کہ مغربی اور جدید علوم و فنون سے واقفیت رکھے بلکہ انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم و فنون اردو زبان میں منتقل ہو جائے۔ تا کہ اردو جدید علوم و فنون سے روشناس ہو سکے۔ سرسید کا تعلیمی منصوبہ منظم اور ہمہ گیر قدروں پر مشتمل تھا۔

دراصل جب کوئی نئی تحریک وجود میں آتی ہے تو اس کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ مالی تعاون اور افرادی تعداد و قوت کا ہوتا ہے۔ شروعات میں لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ سرسید انگریزی مدرسہ کھول کر قوم کو عیسائیت کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا قوم نے سرسید کا کسی بھی طرح تعاون نہ کیا۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرسید نے مدرستہ العلوم کا خیال دل سے نکال دیا اور ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی۔ اس کے لیے انھوں نے چندا اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ راتوں کو رو رو کر اللہ سے دعائیں کیں۔ گھر گھر جا کر بھیک مانگی، اپنی کتابیں بیچیں، ڈرامے کھیلے۔ اگر کوئی دعوت کرتا تو اس سے دعوت میں خرچ ہونے والے پیسے لے لیتے اور دعوت ترک کر دیتے۔ چندے میں سب سے پہلی رقم ایک مولوی صاحب نے دی جو کہ ایک روپیہ دو پیسے تھے۔ چندہ جمع کرتے رہے اور جب ایک خطیر رقم یعنی ساڑھے تین لاکھ روپئے جمع ہو گئے تو 24 مارچ 1875 میں مدرسے کی سنگِ بنیاد رکھی۔ شروعات میں طلبا کی تعداد صرف گیارہ تھی۔ اس کے بعد تعداد بڑھتی گئی اور تین ماہ کے اندر پچاس سے ساٹھ تک ہو گئی۔ یہ مدرسہ موجودہ مسلم یونیورسٹی کے پاس ایک کھپریل میں شروع کیا گیا تھا۔ بعد میں سرسید پر لوگوں کو پوری طرح بھروسہ ہو گیا کہ یہ مشن جو سرسید نے شروع کیا ہے وہ پوری طرح مخلصانہ اور قومی ہمدردی کا باعث ہے۔ لوگوں نے سرسید کی مالی امداد بھی کی اور ہر طرح سے تعاون کیا۔ اس طرح سرسید کے ارادے اور مستحکم ہو گئے۔ انھوں نے مدرسے کو کالج بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح 8/جنوری 1877 کو لارڈ لٹن وائسرائے نے کالج کی بنیاد رکھی اور اس کالج کا نام 'محمڈن اورینٹل کالج' رکھا گیا۔ جو آگے چل کر 1920 میں 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' کے نام سے موسوم ہوا۔

1886 میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' قائم کی جس کا بعد میں نام تبدیل کر کے 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' رکھا گیا۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی تعلیم اور جدید علوم کا شوق پیدا کرنا تھا۔ سرسید کی منشا یہ تھی کہ اس کانفرنس

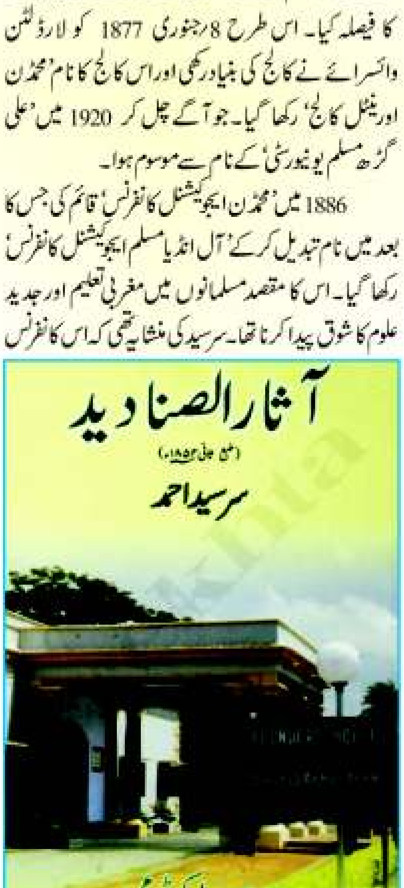

کی شاخیں پورے ہندوستان میں پھیل جائیں۔

سرسید نے قوم کی رہنمائی بڑے خلوص سے کی اور مختلف میدانوں میں کام کیا۔ اردو کے فروغ میں بالخصوص نثری ادب میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا حالی ایک مضمون 'سرسید اور تعلیم' میں رقم طراز ہیں:

''ایک شریف اور لائق انگلش مین نے جب کہ سر سید حیات تھے ہمارے سامنے ذکر کیا کہ یوروپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فرد کامل ہیں اور جن کی نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسی جامع حیثیات اشخاص جیسے کہ سرسید احمد خاں ہیں وہاں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔''

(ص 152، مطالعہ سرسید احمد خاں، عبدالحق)

مردِ پیر سرسید کو 24/مارچ 1898 میں احتباس بول کا عارضہ لاحق ہو گیا اور 27/مارچ 1898 کو علی گڑھ میں وفات پائی، وہیں سپرد خاک ہوئے۔ سرسید کی وفات کے بعد ان کے رفقا اور شاگردوں نے ان کے مشن کو قائم رکھا۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں انھیں کی کاوشوں اور محنت کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے قوم کو ظلمات سے روشنی کی طرف گامزن کیا۔ سرسید کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے محسن الملک (سید مہدی علی خاں) نے فرمایا تھا کہ:

''تم جس کو چاہتے تھے اپنی ذات کے لیے کسی چیز کا خواہاں نہ ہوا بلکہ خود اپنا مال تم پر قربان کیا اور اپنی کمائی تمھارے کاموں میں لگائی یہاں تک کہ نہ ایک جھونپڑا چھوڑا نہ کفن کے واسطے ایک گز کپڑا جو کچھ تم سے لیا تمھارے ہی کاموں میں لگا یا۔ اس کی آرزو تھی کہ تمہاری بھلائی کا جو کام اس نے شروع کیا تھا اس کے مرنے کے بعد وہ پورا ہو۔''

(ص 32، محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک، نورالحسن نقوی)

اکبر الہ آبادی جو جدید علوم کے سخت مخالف تھے اور سرسید پر طنز کرتے تھے لیکن بعد میں وہ بھی ان کے حامی اور معترف ہو گئے تھے، فرماتے ہیں:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے اور کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

■

Dr. Mohd Khalid
S/o Dr Zaheer Ahmad Khan
H.N0 1172 ,Ward N0 4, Mohalla Islamabad
Shyampur Road, Kithore
Meerut - 250104 (UP)
Mob.:8445727800/9412473222

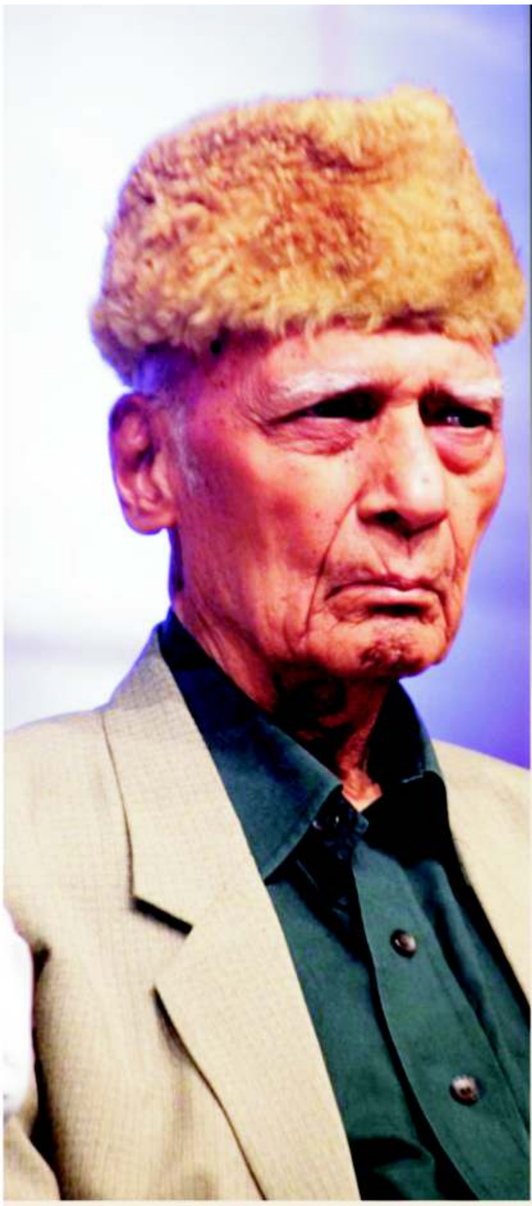

صدر عالم گوہر

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا

(خیام کی یاد میں)

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

میں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل میری کہانی ہے

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا بارات پھولوں کی

دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجیے
بس ایک بار میرا کہا مان لیجیے

زندگی جب بھی تیری بزم میں لاتی ہے ہمیں
یہ زمیں چاند سے بہتر نظر آتی ہے ہمیں

ان لازوال نغموں کے موسیقار خیام صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ 19/اگست 2019 کو 92 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس عطا کرے۔ آمین۔

ان کا پورا نام محمد ظہور ہاشمی خیام تھا۔ وہ بہت دنوں سے بیمار چل رہے تھے۔ خیام صاحب کو سرکاری اعزاز کے ساتھ 21 گن کی سلامی دے کر ممبئی کے اندھیری چار بنگلہ قبرستان میں نم آنکھوں سے سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی اہلیہ جگجیت کور جو کہ خود بیمار ہیں۔ وہیل چیئر پر قبرستان پہنچیں اور کئی بار بیہوش ہوگئیں۔ خیام صاحب کو جاوید اختر، سونو نگم، اداکار سنجے خان، سریش واڈیکر، تبسم، پونم ڈھلن کے علاوہ فلمی دنیا کے موسیقاروں، گلوکاروں، نغمہ نگاروں اور اداکاروں نے خراج عقیدت پیش کی۔

صدر جمہوریہ آر این کووند، وزیراعظم نریندر مودی، مہاراشٹر کے وزیر اعلی دیویندر فڑنویس، بھارت رتن لتا منگیشکر اور اداکار امیتابھ بچن نے بھی تعزیت پیش کی۔

خیام صاحب کو 2007 میں سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ اور 2011 میں پدم بھوشن سے نوازا گیا تھا۔ جب کہ فلم کبھی کبھی اور فلم امراؤ جان کے لیے انھیں فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا تھا۔

ان کی مشہور فلموں میں سے ہیں۔ فٹ پاتھ، شعلہ اور شبنم، آخری خط، کبھی کبھی، ترشول، نوری، رضیہ سلطان، بازار، امراؤ جان، تھوڑی سی بیوفائی اور آہستہ آہستہ وغیرہ۔

خیام صاحب کی اتنی بڑی کامیابی، بہت سے ایوارڈ، پدم بھوشن، فلم فیئر، اور سنگیت ناٹک اکادمی وغیرہ جتنی بھی فتوحات ہیں ان کے پیچھے ایک دردبھری داستان بھی ہے۔ خیام صاحب نے جہاں بہت اچھے دن دیکھے ہیں وہاں وقت کی گردش کا ایک لمبا دور بھی دیکھا ہے۔ اسٹرگل کا ایک بڑا وقفہ بھی مستقل مزاجی کے ساتھ گزارا ہے۔ دکھوں کے پہاڑ کا بھی سامنا کیا ہے۔ ندا فاضلی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

اردو دنیا میں جب میرے ذریعے لیا گیا خیام صاحب کا انٹرویو شائع ہوا، تو میں اردو دنیا کے اس شمارے کو دینے کے لیے خیام صاحب کے گھر گیا۔ گو کہ میرا انٹرویو مکمل تھا ہر زاویے سے۔ مگر پھر بھی کچھ سوال رہ گئے تھے میرے ذہن میں اور کچھ اردو دنیا کے خیام صاحب والے شمارے کے بعد جو قارئین کے خطوط میں کچھ سوال کیے گئے تھے۔ اس کے بارے میں جاننے کی خواہش میرے دل میں تھی۔ خیام صاحب سے پھر ملنا ضروری اس لیے ہوگیا تھا کہ ان سوالوں کا جواب میں اپنی کتاب فلمی ہستیوں کے انٹرویوز میں شامل کر سکوں۔ کچھ سوال تو بڑے دلچسپ تھے۔ جس پر سے پردہ اٹھنا ضروری تھا۔ جیسے کہ ندا فاضلی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ فلم 'کبھی کبھی' کی موسیقی کے لیے پہلے لکشمی کانت پیارے لال کو لیا گیا، کچھ سیٹینگ وغیرہ بھی ہوئی تھی۔ مگر پھر یہ فلم خیام صاحب کو ملی تو کیسے ملی اس کے پیچھے جو واقعہ ہے اس میں کتنی سچائی ہے۔ اس تعلق سے مجھے کچھ باتیں کرنی تھیں۔

پھر لکشمی کانت پیارے لال سے انٹرویو کے دوران پیارے لال جی نے ایک سوال کے بارے میں بتایا تھا کہ کمال امروہی صاحب کی ایک فلم میں کر رہا تھا۔ مگر کمال امروہی صاحب کا جو طریقہ تھا کام کرنے کا وہ بڑا شاہانہ طریقہ تھا۔ پیارے لال جی نے کہا تھا کہ ہم لوگ بہت فاسٹ کام کرنے والے تھے۔ کیونکہ ہمارے پاس

کام بہت زیادہ تھا۔ اور زیادہ کام ہونے کی وجہ سے ہمیں اپنی رفتار بھی تیز کرنی پڑتی تھی اور ہمیں جلدی جلدی کم وقتوں میں نغمہ لکھنے والا نغمہ نگار چاہیے تھا۔ جو ہمارے پاس تھا آنند بخشی کی شکل میں۔ آنند بخشی بیٹھے بیٹھے باتوں باتوں میں گانا لکھ لیتے تھے۔ ہم لوگ خود فاسٹ کام کرنے والے تھے اور ہمارا گیت کار بھی بہت فاسٹ تھا۔ ایسے میں مجھے کمال امروہی صاحب کی فلم ملی ہم لوگوں کی بھی بڑی تمنا تھی کمال امروہی صاحب کے ساتھ کام کریں لیکن کمال صاحب کے کام کرنے کا جو انداز تھا۔ اس سے ہم لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ اگر ان کے ساتھ کام کریں گے تو بہت سی دوسری فلمیں چھوڑنی پڑیں گی۔ ہم لوگ سیٹنگ پر بیٹھ جاتے تھے اور کمال صاحب کو فون کرتے تو وہ اپنی شاہانہ چال میں اپنے گھر سے نکلتے۔ معلوم ہوتا کہ گھر سے نکل چکے ہیں۔ ابھی غالباً آدھے راستے پر ہوں گے۔ اسی طرح وہ اپنی شاہی چال سے چلتے ہوئے پہنچتے۔ آتے ہی جب سیٹنگ ہوتی۔ گانوں پر گفتگو ہوتی تو بولتے اس کو تھوڑا اور نیچے سے لیجیے پھر کہتے تھوڑا اور اوپر کیجیے۔ اس طرح ہر گیت پر کافی وقت لگتا تھا۔ آخر تھک ہار کر ہم لوگوں نے وہ فلم چھوڑ دی۔ حالانکہ اس کا ایک نغمہ بھی ہم لوگوں نے تیار کیا تھا۔ وہ نغمہ تھا۔

اپنے آپ راتوں میں چلمنیں سرکتی ہیں
چونکتے ہیں دروازے سیڑھیاں دھڑکتی ہیں

جس فلم کی بات پیارے لال جی کر رہے تھے وہ فلم تھی 'شنکر حسین'۔ بعد میں اس فلم کی موسیقی خیام صاحب نے ترتیب دی۔ اس سلسلے میں بھی بات کرنی تھی۔ کیونکہ خیام صاحب کی موسیقی میں فلم 'شنکر حسین' کے نغمے بہت مقبول ہوئے تھے جس میں رفیع صاحب کی آواز میں یہ نغمہ بہت مقبول ہوا تھا۔

کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی
بہت خوبصورت مگر سانولی سی
مجھے اپنے خوابوں کی بانھوں میں پاکر
کبھی نیند میں مسکراتی تو ہوگی
اسی نیند میں کسمسا کسمسا کر
سرہانے سے تکیے گراتی تو ہوگی
کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی

سو میں نے خیام صاحب سے ان سب باتوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کرنے پہنچا۔ معلوم ہوا تھا کہ فلم 'کبھی کبھی' پہلے لکشمی کانت پیارے لال کو دی گئی تھی۔ لیکن لکشمی کانت پیارے لال نے کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے، کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے۔ اس کے بارے میں پوچھا تھا کہ اس کا راگ کون سا ہوگا۔ یا اس کی دھن کون سی ہوگی۔ اس پر ساحر لدھیانوی صاحب بہت خفا ہو گئے اور گھر آ کر خیام صاحب کو فون کیا کہ خیام صاحب آپ میرے ساتھ ایک فلم کر رہے ہیں جس کا نام ہے 'کبھی کبھی' اور اس طرح یہ فلم خیام صاحب کو ملی تھی۔

جب میں نے خیام صاحب کے یہاں جانے کی بات ایک موسیقار کو بتائی تو وہ ضد کرنے لگے کہ آپ مجھے بھی خیام صاحب کے یہاں لے چلیے۔ میں ان کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ وجہ یہ تھی کہ خیام صاحب بہت ریزرو رہتے تھے۔ ہر کسی سے ملتے نہیں تھے کیونکہ تھوڑا بیمار بھی تھے ان دنوں۔ میں نے ایک دو بار ان کو منع کیا لیکن جب وہ نہیں مانے تو میں نے اپنے ساتھ ان کو بھی لے لیا۔ جب میں خیام صاحب کے یہاں پہنچا تو میں نے سلام کیا اور ہمارے ساتھی موسیقار نے ان کے چرن اسپرش کیے۔ اور ان کے پیروں میں ہی بیٹھے رہے۔ جب تک ہم لوگ وہاں تھے۔ خیام صاحب کے تئیں موسیقاروں کی اتنی عقیدت اور عزت دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں خوش قسمت ہوں۔ اور خیام صاحب سے ملنا کوئی بڑی بات نہیں سمجھتا ہوں جبکہ البم اور فلموں میں موسیقی دینے والے موسیقار خیام صاحب سے ملنا بہت بڑی بات سمجھتے ہیں۔ میں نے اردو دنیا کا وہ شمارہ خیام صاحب کو دیا۔ خیام صاحب کی شریک حیات جگجیت کور بھی تھیں۔ انھوں نے کہا یہ پرچہ مجھے بھی ڈاک سے آ گیا ہے۔ اس پرچے میں خیام صاحب اور ان کی شریک حیات جگجیت کور دونوں کی ایک ساتھ ایک اچھی تصویر شائع ہوئی تھی۔ جگجیت کور جی نے پوچھا آپ کو ہماری یہ تصویر کہاں سے ملی۔ میں نے کہا یہ تصویر میں نے نہیں دی تھی اردو دنیا والوں نے تلاش کر لگائی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ پھر خیام صاحب، میں اور جگجیت کور جی کی موبائل سے ایک تصویر لی گئی۔ وہ تصویر اب بھی میرے پاس ایک بہت ہی قیمتی یادگار کے طور پر محفوظ ہے۔ پھر چائے وغیرہ کے بعد میں نے جو کچھ میرے سوالات تھے ان کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔

سب سے پہلے میں نے فلم 'کبھی کبھی' کا ذکر چھیڑا کہ کیا یہ فلم پہلے لکشمی کانت پیارے لال کو دی گئی تھی اور لکشمی کانت پیارے لال نے ٹائٹل سانگ کے راگ کے بارے میں ساحر صاحب سے پوچھا تھا کہ یہ کس راگ میں ہوگا اور اس پر خفا ہو کر انھوں نے ان سے یہ فلم لے کر آپ کو دی تھی؟ اس کے جواب میں خیام صاحب نے کہا کہ فلم 'کبھی کبھی' مجھے ملنے سے پہلے باہر کیا ہوا تھا یہ مجھے نہیں معلوم مگر ہاں ایک فلم کا قصہ اسی طرح ہے۔ یش چوپڑہ نے فلم 'کبھی کبھی' کے بعد مجھے کہا کہ دو فلمیں بنانے جا رہا ہوں۔ ایک فلم آپ کریں گے اور دوسری فلم ایک دوسرے موسیقار کو جائے گی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ دونوں کے نغمے ساحر لدھیانوی ہی لکھ رہے تھے۔ (یہ بتاتے چلیں کہ بی آر چوپڑہ اور یش چوپڑہ کی فلموں کے نغمے ساحر لدھیانوی ہی لکھا کرتے تھے۔) خیام صاحب نے بتایا کہ میں نے یش چوپڑہ سے کہا کہ ٹھیک ہے آپ جو فلم چاہیں مجھے دے دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پہلے انھوں نے جو فلم دی اسے میں نے قبول کر لیا۔ مگر پتہ نہیں باہر کیا ہوا کہ ایک دن یش چوپڑہ آئے اور کہا کہ آپ وہ فلم چھوڑ دیجیے اور یہ دوسری فلم کیجیے اور اس دوسری فلم کا ایک نغمہ دیا اور کہا کہ اس کی دھن کمپوز کیجیے۔ ساحر صاحب کا لکھا وہ نغمہ بہت مشکل نغمہ تھا۔ اس کی دھن بنانی مجھے بہت مشکل لگ رہی تھی۔ خیام صاحب کی شریک حیات جگجیت کور بھی ساتھ میں ہی بیٹھی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب کوئی مشکل دھن ہوتی ہے تو خیام صاحب بہت پریشان سے گھر میں ٹہلتے رہتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں۔ پھر جب اس نغمے کی دھن بن جاتی ہے تو خیام صاحب بولتے ہیں وانی آ گئی۔ اس نغمے کے ساتھ

یادیں

بھی ایسا ہی ہوا۔ بہت مشکل سے اس کی دھن بنی اور جب دھن بن گئی تو خیام صاحب خوشی سے جھوم اٹھے اور کہا وانی گئی۔ اب میرا تجسس بڑھ گیا کہ وہ فلم کون سی تھی اور نغمہ کون سا تھا۔ سو میں نے بڑی بے صبری سے پوچھا کہ وہ فلم کون سی تھی تو خیام صاحب نے کہا، وہ فلم تھی 'ترشول'۔ رپھر میں نے پوچھا وہ نغمہ کون سا تھا تو انھوں نے کہا بلکہ سنایا بھی 'تو میرے ساتھ رہے گا منّے ۔تا کہ تو دیکھ سکے...

پھر مجھے سمجھتے دیر نہ لگی دو فلموں میں سے ایک فلم تھی ترشول' اور دوسری فلم تھی 'کالا پتھر'۔ اور یہ کہ پہلے کالا پتھر خیام صاحب کو دی گئی تھی مگر فلم ترشول کے اس نغمے 'تو میرے ساتھ رہے گا منّے' کی وجہ سے کالا پتھر دوسرے موسیقار یعنی موسیقار راجیش روشن کو اور فلم ترشول موسیقار خیام صاحب کو۔ لیکن خیام صاحب نے نہ راجیش روشن کا م لیا نہ ہی ان کے بارے میں کوئی کمنٹ کیا۔ یہ ان کی شرافت اور انسانیت تھی۔

خیام صاحب اپنی شریک حیات جگجیت کور کو بہت چاہتے تھے اور ان کی عزت بھی بہت کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ میں جو کچھ بھی ہوں س کے لیے پہلے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے عزت بخشی مجھے نوازا۔ مگر اس کے بعد میں اپنی شریک حیات کا ممنون ہوں۔ یہ نہ ہوتیں تو آج میں اس مقام پر نہیں ہوتا۔ میری ترقی اور خوشحالی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ بڑے گھر کی ہیں۔ محلوں والی بگھیوں والی ہیں۔ مگر میرے ساتھ انھوں نے بہت سارے دکھ برداشت کیے۔ میری جدوجہد کے دنوں میں ٹرینوں میں بسوں میں میرے ساتھ سفر کیا مگر زبان پر کبھی اف تک نہ آنے دیا۔ نھوں نے میرے لیے اپنا کریئر چھوڑ دیا۔ یہ بڑی اچھی گلوکارہ ہیں مگر میرے لیے انھوں نے گلوکاری چھوڑ دی۔ صرف میری فلموں میں ہی انھوں نے گلوکاری کی۔ میرے گانے کمپوز کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ فلموں کی موسیقی میں یہ ہمیشہ میرا ساتھ دیتی ہیں۔ میں جو کچھ ہوں سب انھیں کی بدولت ہوں۔ میری فلم کا ایک نغمہ ہے۔

تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو
کوئی دن کے لیے اپنی نگہبانی مجھے دے دو

انھوں نے نہ صرف اس نغمے کو اپنی آواز دی بلکہ اس نغمے کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ ہمارے سارے دکھوں کو، ساری پریشانیوں کو انھوں نے ہم سے لے لیا۔ فلم امراؤ جان میں میں نے امیر خسرو کا کلام ان سے گوایا۔

کاہے کو بیاہی بدیس   او لکھیا بابل مورے

اس کلام میں انھوں نے جو سوز پیدا کیا وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔

زندگی نے خیام صاحب کو بڑے صدمے دیے۔ بہت سی تمنائیں بہت سی خوشیاں چھین لی۔ غم کی ایک تصویر بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ یہ خیام صاحب ہی تھے جو اتنے دکھوں کو سہ گئے۔

میں جب پہلی دفعہ خیام صاحب کے یہاں گیا تھا تو ان کے بیٹے پردیپ خیام نے دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت گھر میں خیام صاحب، ان کی شریک حیات جگجیت کور جی، پردیپ خیام اور باورچی خانے میں کسی خاتون کی کچھ آواز سنائی دی تھی۔ میں نے سوچا کہ خیام صاحب کی بہو یعنی پردیپ خیام کی بیوی باورچی خانے میں ہوں گی۔ کیونکہ میں نے دیکھا نہیں تھا صرف باہر سے نسوانی آواز سنی تھی۔ شاید چائے وغیرہ تیار تھی جس کے تعلق سے کچھ گفتگو تھی۔ لیکن میرے ذہن میں ایک بات آئی تھی کہ ندا صاحب نے مجھے ایک بار پوچھا تھا کہ تمہاری شادی ہو گئی تو میں نے کہا تھا نہیں۔ اس پر انھوں نے کہا تھا کہ جلدی شادی کر لو نہیں تو شادی نہیں ہوگی۔ شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس کے بعد شادی ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی بات پر ندا صاحب نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا خیام صاحب کے بیٹے پردیپ کا۔

ندا صاحب نے کہا کہ خیام صاحب نے مجھے کہا کہ ندا صاحب پردیپ کی کہیں شادی کروا دیجیے۔ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں کوئی مناسب لڑکی دیکھتا ہوں۔ پھر میں نے ایک لڑکی سے بات کی اور پھر پردیپ کو کہا کہ فلاں ہوٹل میں جاؤ وہاں ایک لڑکی تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ اس سے ملو، اچھی طرح سے دیکھ لو اگر پسند ہو تو بتلاؤ۔ تمہاری اس سے شادی کروادوں گا۔ پردیپ اس لڑکی سے ملا دونوں نے ساتھ لنچ کیا۔ اچھی طرح سے ایک دوسرے کو دیکھ سمجھ لیا۔ پھر دونوں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ بعد میں میں نے پردیپ سے پوچھا کہ لڑکی پسند ہے بات آگے بڑھاؤں تو پردیپ نے کہا جی ٹھیک ہے۔ پھر میں نے لڑکی سے پوچھا تو اس نے کہا لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔ اور اس طرح پردیپ کی شادی نہیں ہو سکی۔

لیکن میں نے جب گھر میں تین فرد کے علاوہ کسی چوتھی خاتون کی آواز سنی تو سمجھا تھا کہ پردیپ کی شادی بعد میں ہو گئی اور یہ ان کی بیوی ہو گی مگر وہ تو کام کرنے والی کوئی خاتون تھی جو کھانا بنانے آئی تھی۔ پردیپ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں پردیپ ہیرو بننے کی جدوجہد کر رہے تھے جس میں کامیابی تو نہیں ملی مگر عمر نکل گئی۔ پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ پردیپ کا انتقال ہو گیا تب مجھے کافی دکھ ہوا کہ خیام صاحب اور جگجیت کور کے جینے کا ایک ہی سہارا پردیپ ہی تو تھے۔ جسے دیکھ دیکھ کر وہ دونوں جی رہے تھے۔ زندگی کی ساری خوشی وہی تھے۔ جینے کا مقصد وہی تھے۔ مگر قدرت کے بے رحم ہاتھوں نے پردیپ کو بھی ان سے چھین لیا۔ میں پردیپ کے انتقال کے بعد گیا تھا مگر میں ان بزرگوں کے غم کو اور بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بات نکل ہی آئی۔ دونوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پردیپ سے متعلق کچھ باتیں ہوئیں۔ جگجیت کور جی نے بتلایا، لتا جی (لتا منگیشکر) نے بھی بڑے دکھ کا اظہار کیا تھا۔ بڑی تسلی دی تھی۔ پردیپ کے علاوہ دنیا میں ان دونوں کا تھا ہی کون؟ سو دونوں اور ٹوٹ گئے اور پھر ان دونوں نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ اپنی کڑوروں کی دولت غریب، مجبور، بے کس فنکاروں کے لیے ایک ٹرسٹ بنا کر وقف کر دی۔ دولت کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس واقعے سے خیام صاحب اور جگجیت کور کے تئیں لوگوں کے دلوں میں عزت، احترام و عقیدت اور بڑھ گئی۔

■

Sadre Alam Gauher
Vill+Po-Pursaulia,
Distt.: Madhubani-847226 (Bihar)
Cell-771598014
Email-gauhersadre@gmail.com

ضامن علی حسرت

طنز و مزاح کا ایک روشن چراغ

حضرت غوث خواہ مخواہ

طنز و مزاح کے نامور شعرا طالب خوندمیری اور فرید انجم کی موت کا غم ابھی پوری طرح سے ہمارے دلوں سے مٹنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت غوث خواہ مخواہ کی موت کی خبر نے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ طنز و مزاح کا ایک اور چراغ بجھ گیا۔ ایک عظیم شاعر اور ایک بہترین انسان ہم سے بچھڑ گیا۔ غوث خواہ مخواہ کی موت کو ذہن و دل قبول کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور اپنے مزاحیہ اشعار سُنا کر ہمیں لوٹ پوٹ کر رہے ہیں۔ مگر سچ تو پھر سچ ہے۔ بھلا موت سے کوئی بچا ہے لیکن ہاں وہ مر کر بھی زندہ رہیں گے اپنے فن کی بدولت اپنی شگفتہ شاعری کی بدولت۔ مسلسل (68) برسوں تک غوث خواہ مخواہ کی طنزیہ و مزاحیہ ادب پر حکمرانی رہی۔ اُن کا شمار طنز و مزاح کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا تھا۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک انھوں نے طنز و مزاح کی ایسی بے لوث خدمت کی ہے جسے بُھلایا نہیں جا سکتا۔ طنز و مزاح کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ مزاح نے تو جیسے ان کی زبان پر ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ ہر لفظ مزاح کی چاشنی میں نہایا ہوا ہر جملے میں طنز کے تیر پوشیدہ ہوا کرتے تھے۔ عاجزی ملنساری اور خلوص کا پیکر تھے خواہ مخواہ۔ طنز و مزاح کی بنجر زمین میں خواہ مخواہ قہقہوں کے گُل ساری عمر کھلاتے رہے۔

زندگی سے تھکے ہارے لوگوں میں فراخ دلی کے ساتھ مسکراہٹیں اور قہقہے تقسیم کرنے والا زندہ دل انسان دبے پاؤں موت کی آغوش میں سما گیا اور اپنے چاہنے والوں کو ایک ایسا غم دے گیا جسے وہ تا عمر بُھول نہیں پائیں گے۔ راقم نے غوث خواہ مخواہ کے فن و شخصیت پر اپنا مقالہ پیش کر کے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ڈگری لی ہے۔ خاکسار کے غوث خواہ مخواہ سے قریبی مراسم تھے۔ اکثر اُن سے کبھی گھر پر تو کبھی مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ ایک دنیا ان کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی قائل تھی۔ دورانِ گفتگو جب بھی موت کا تذکرہ نکلتا تو مسکرا کر کہتے ”حسرت میاں اَب زندگی کی گاڑی اتار پر ہے اور بریک بھی فیل ہو چکے ہیں۔ میں اوپر والے کا شکر گزار ہوں اس نے دولت عزت اور شہرت سے خوب نوازا ہے۔ سچ کہوں تو مجھے امید سے کہیں زیادہ ملا ہے میں نے زندگی جی ہے، گزاری نہیں۔ تم دیکھنا میں اپنی موت کو بھی ہنستے ہنستے گلے لگا لوں گا۔“ اور ایسا ہی ہوا وہ کب موت کی آغوش میں چلے گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ موت سے متعلق کبھی اُنھوں نے یوں کہا تھا

بُزدل ہے وہ جو جیتے جی مرنے سے ڈر گیا
ایک میں ہی تھا جو کام ہی کچھ اور کر گیا

جب موت آ کے میرے کو کرنے لگی سلام
میں وعلیکم سلام بولا اور مر گیا

موت سے سلام کلام کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ غوث صاحب کو مشکل کاموں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اُن کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ اُن سے ایک بار کوئی ملتا تو وہ بار بار اُن سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ ہر ملنے والے سے نہایت خلوص اور پیار سے ملتے تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی ہے۔ اُن کی پیشانی پر کبھی بل نظر نہیں آیا۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ کبھی انھیں غصہ بھی آتا ہوگا یا نہیں؟ ایک دفعہ ان کے ایک دوست نے ان سے ان کی تندرستی اور سدا بہار جوانی کا راز پوچھا تو خواہ مخواہ نے مسکراتے ہوئے اپنے یہ شعر پڑھے

میری آنکھوں کو کسی پل سونے نہیں دیتی
پیار کا ایک بھی لمحہ کھونے نہیں دیتی
اپنی چاہت سے سدا مجھ کو جواں رکھتی ہے
میری بیگم مجھے بوڑھا ہونے نہیں دیتی

ایک دفعہ ایک مشاعرے میں کلام سنا رہے تھے۔ ایک لڑکا ہوٹنگ کے موڈ میں تھا۔ اپنے مُنہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا۔ جس کی وجہ سے مشاعرہ کا توازن بگڑ رہا تھا۔ خواہ مخواہ کلام سناتے سناتے رک گئے اور دھیرے سے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا ”کس نے آپ کی

دُم پر پاؤں رکھا ہے بیٹے''؟ یہ سننا ہی تھا کہ ہوٹنگ بند ہوگئی اور مشاعرہ گاہ میں سناٹا چھا گیا۔ خواہ مخواہ کی حاضر جوابی بھی غضب کی تھی۔ پی ایچ ڈی کے مواد کے سلسلے میں اکثر اُن کے مکان پر جانا پڑتا تھا۔ ایک ملاقات میں انھوں نے پوچھا ''ضامن بابا آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کب تک مل جائے گی میں تمھارے ہاتھوں میں وہ ڈگری دیکھنے کا خواہشمند ہوں''؟ میں نے کہا ''چاچا ایک سال اور لگ جائے گا ڈگری ملنے تک'' میرے جواب پر وہ مسکرا دیے اور کہا ''میاں تب تک تو ہماری برسی بھی ہوجائے گی'' ان کے اس مزاحیہ جملے پر میں بھی ہنس پڑا۔ وقت گزرتا گیا اور اللہ کے کرم سے مجھے (Ph.D.) کی ڈگری ایک سال کے اندر ہی مل گئی۔ میں سب سے پہلے اپنی ڈگری کو لے کر خواہ مخواہ صاحب کے گھر پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوش ہوگئے۔ گھر کے اندر بلایا اور پوچھا ''کہاں رہ گئے آپ کافی دنوں بعد آئے ہو'' جواب میں میں نے اپنی Ph.D کی ڈگری اُن کے ہاتھوں میں تھما دی۔ ڈگری دیکھ کر اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا فوراً مجھ سے لپٹ گئے اور کہا ''ضامن تم نے کمال کردیا میری زندگی کے آخری دنوں میں تم نے مجھے جو خوشی دی ہے میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ مجھے جب یہ ساری باتیں یاد آنے لگتی ہیں تو میری آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔ آج میرا مقالہ (Thesus) کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔ میں ایک کاپی خواہ مخواہ صاحب کو دینے کے لیے حیدرآباد جانے والا ہی تھا کہ 3/مئی 2017 کو یہ منحوس خبر ملی کہ خواہ مخواہ صاحب اِنتقال کرگئے اس خبر نے میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ خواہ مخواہ صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ میں نے اپنی زندگی میں خواہ مخواہ جیسے شفیق، ہمدرد، مخلص، نرم دل اور محنتی لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ اس موقع پر مجھے اُن کے دو شعر یاد آرہے ہیں جو اُنھوں نے موت سے متعلق کہا تھا۔

موت آکر مرے بدن کو جب زیست کی قید سے چھڑائے گی
زندگی تب مری جدائی میں دیکھنا کیسے پھڑ پھڑائے گی
دیکھنا بھی اگر نہ چاہیں تو خواہ مخواہ دیکھ لینا وہ منظر
جب مری لاش دفن ہونے تک' زندگی کی ہنسی اُڑائے گی

موت کے ذکر پر میں نے کئی لوگوں کو گھبراتے ہوئے سٹپٹاتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن خواہ مخواہ صاحب موت کے تذکرہ پر نہ گھبراتے تھے اور نہ سٹپٹاتے تھے۔

بلکہ مسکراتے ہوئے اپنے ہی کچھ شعر سناتے تھے۔ انھیں شاید زندگی کے فلسفے کی حقیقت کا اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ آدمی سو (100) سال تک بھی جی لے تو اُسے ایک دن مرنا ہے۔ پھر موت سے گھبرانا اور ڈرنا کیسا؟

بہت ساری باتیں ہیں جو ان کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں لیکن چند صفحات میں یہ کام بڑا مشکل ہے۔ البتہ چند باتیں ان کے ادبی سفر سے متعلق ضرور لکھنا چاہوں گا ورنہ یہ مضمون اپنے ادھورے پن کا گلہ کرے گا۔ غوث خواہ مخواہ کا پورا نام 'غوث محی الدین احمد' تھا۔ والد کا نام 'یوسف احمد' تھا۔ والدہ 'فاطمہ النساء بیگم' کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ غوث خواہ مخواہ کے دو بڑے بھائی تھے اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ سنہ 1930 میں یہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسہ تحتانیہ یاقوت پورہ سے حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ملازمت مل گئی۔ غوث صاحب کے آبا و اجداد ضلع محبوب نگر کے ایک چھوٹے سے قصبے 'چٹوال' کے رہنے والے تھے۔

1948 میں اچانک ملک کا بٹوارہ ہوگیا اور غوث صاحب کی ملازمت بھی چلی گئی۔ انھیں مجبوراً تلاش روزگار کے سلسلے میں بمبئی کا رُخ کرنا پڑا۔ کافی جد و جہد کے بعد بھی انھیں بمبئی میں ملازمت نہیں ملی۔ یہ دوبارہ بمبئی سے اپنے وطن حیدرآباد لوٹ آئے اور جے جے اِسکول آف آرٹس، حیدرآباد سے ڈرافٹ مین کا ڈپلوما حاصل کیا۔ پھر انھیں (1956) میں محکمہ تعمیرات میں ملازمت مل گئی اور زندگی کی گاڑی پٹری پر آگئی۔ کچھ عرصہ بعد اِن کا تبادلہ حیدرآباد سے اورنگ آباد (مہاراشٹرا) کردیا گیا اور پھر وہاں سے انھیں بمبئی بھیج دیا گیا۔ جہاں ایک نئی زندگی، نام و نمود، ادب و شہرت سب کچھ اِن کے منتظر تھے۔ بمبئی میں روزنامہ انقلاب میں 'خالی پیلی' کے عنوان سے ہر ہفتہ ایک مزاحیہ مضمون لکھا کرتے تھے۔ جو کافی مشہور ہوا۔ نظم کے ساتھ ساتھ غوث خواہ مخواہ کی نثر بھی بے حد شاندار تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ ادب کے آل راؤنڈر تھے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں سے ہر کام کر گذرتے تھے۔ ناممکن کو ممکن بنانے والے ہی تاریخ کا حصہ بن پاتے ہیں۔ غوث خوامخواہ ناممکن کو ممکن بنانے کے ہنر سے خوب واقف تھے۔ مزاحیہ ادب کی تاریخ کا مورخ اِن کا نام یقیناً سنہری حرفوں سے لکھے گا۔ انھوں نے طنز و مزاح کو بہت کچھ دیا ہے اپنی آخری سانس تک۔ آج غوث خواہ مخواہ کے مزاحیہ کلام کی اُن کی ہمہ گیر شخصیت کی دھوم ساری اُردو دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اِن کا کلام آنے والی نسل نو کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ دوسروں کی خوشی میں اپنی خوشی تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ غوث صاحب تمام عمر دوسروں کی مسرتوں میں اپنی خوشیاں تلاش کرتے رہے اور اپنے احساسات کو یوں لفظوں کا جامہ پہناتے ہیں۔

یہی توفیق کیا کم ہے کہ روتوں کو ہنسا کر میں
دکھوں کا بوجھ کم کرکے غموں کو بانٹ سکتا ہوں
خلیج بغض و نفرت گر دلوں میں ہوگئی پیدا
اِسے میں خواہ مخواہ ہنستے ہنستے پاٹ سکتا ہوں

بمبئی میں غوث خواہ مخواہ کو اچھا ادبی ماحول مِلا نوشاد علی (عظیم موسیقار)، رویندر جین (مشہور موسیقار)، نواب منصور علی خاں پٹودی و دیگر صفِ اول کی ادبی شخصیتوں نے ان کی ادبی صلاحیتوں کو پہچانا، یہ لوگ اپنے ساتھ خواہ مخواہ کو مشاعروں میں لے جایا کرتے تھے۔ ابتدا میں غوث صاحب سنجیدہ کلام سُناتے تھے۔ کلام مرصع ہوا کرتا تھا اور داد بھی ملتی تھی لیکن پھر بھی خواہ مخواہ کو ایک ادھورے پن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن وہ سوچنے لگے کہ اَب ایسا کیا کرنا چاہیے جس سے ان کا جوہر کُھل کر دنیا کے سامنے آئے۔ اسی دوران اُن کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری تھا وہ نواب پٹودی کی خواہش پر اُن کے بچوں سیف علی خان اور سوہا علی خان کو عربی پڑھانے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ غوث صاحب اب پوری طرح سے بمبئی کے ہوکر رہ گئے تھے۔ تعطیلات میں حیدرآباد آجایا کرتے تھے۔ اور یہاں کی مزاحیہ ادبی محفلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ کبھی محفل لطیفہ گوئی میں لطیفے سنا کر داد حاصل کرتے تو کبھی مزاحیہ مضمون سنا کر اپنی ادبی ظرافت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ پھر انھیں یہ خیال آیا

کہ کیوں نہ مزاحیہ شاعری کا آغاز کیا جائے۔ سنجیدہ شاعری وہ کرتے تو تھے لیکن اُن کے اندر کا شاعر مطمئن نہیں تھا۔ ان کی چھٹی حس بار بار ان سے کہہ رہی تھی کہ اب سنجیدہ کلام اپنے شعری مجموعوں کے لیے اُٹھا کر رکھنا چاہیے اور مزاح کے میدان میں کود پڑنا چاہیے۔

سنجیدہ شاعری میں خواہ مخواہ کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا ان کی تو رگ رگ میں ظرافت کے شرارے دوڑ رہے تھے۔ پھر انھوں نے طنز و مزاح کو اپنی شاعری کا وسیلہ بنایا۔ نہایت ہی کم عرصہ میں یہ مشہور ہوگئے۔ جس مشاعرے میں بھی جاتے دونوں ہاتھوں سے داد لوٹ کر لے آتے، آہستہ آہستہ ان کی شہرت کا گراف بڑھنے لگا اور ملک میں منعقد ہونے والے کل ہند مشاعروں میں انھیں مدعو کیا جانے لگا شہرت کی دیوی ان پر پوری طرح سے مہربان ہوچکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے غوث خواہ مخواہ مزاحیہ مشاعروں کی ضرورت بن گئے۔ اب ان کی شہرت ملک کے حدود سے نکل کر بیرونی ممالک میں بھی پھیل چکی تھی، چنانچہ انھوں نے لندن، آسٹریلیا، کینڈا، امریکہ، جدہ، دوبئ، قطر، جرمنی و دیگر بیرونی ممالک میں شرکت کرتے ہوئے اپنی مزاحیہ شاعری کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اپنے وطن حیدرآباد، وطن ثانی بمبئی اور اپنے ملک کا نام دنیا بھر میں مشہور کردیا۔ جب تک صحت ساتھ دیتی رہی مشاعرے پڑھتے رہے۔ صحت نے ساتھ چھوڑا تو مشاعروں میں شرکت کرنے سے معذرت کرلی اور گھر پر ہی آرام کرتے تھے۔ غوث خواہ مخواہ کے تین شعری مجموعے (1) 'بہ فرض محال' (ستمبر 1992) (2) 'حرف مکرر' (جولائی 1999) اور تیسرا شعری مجموعہ 'کاغذ کے تیشے' (نومبر 2004) منظرِ عام پر آئے جنھیں ادبی دنیا میں خوب شہرت ملی۔ تیسرے مجموعہ 'کاغذ کے تیشے' کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ تینوں شعری مجموعوں میں طنزیہ و مزاحیہ کلام کے ساتھ ساتھ سنجیدہ کلام بھی موجود ہے۔ غوث خواہ مخواہ کی دیرینہ ادبی خدمات کے عوض دوحہ قطر میں ان کے اعزاز میں 'جشن غوث خواہ مخواہ' کے عنوان سے یادگار بین الاقوامی مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں دنیا بھر سے طنز و مزاح کے شعراء نے حصہ لیا۔ بقول خواہ مخواہ کے میری اس قدر گلپوشی اور شال پوشی کی گئی کہ میرا سارا وجود پھولوں اور شالوں کے پیچھے دفن ہوچکا تھا۔ آیئے چند اہم باتیں غوث خواہ مخواہ کے خاندان کے بارے میں کریں۔ غوث خواہ مخواہ بڑے خوش نصیب تھے خدا نے انھیں بہترین خاندان بخشا ہے۔ 1955 کو سیدہ بدرالنساء بیگم کے ساتھ غوث خواہ مخواہ کی شادی ہوئی، ان کے تین لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ بڑے صاحبزادے کا نام 'عارف احمد' ہے جو کینڈا میں مقیم ہیں۔ دوسرے لڑکے کا نام 'عابد احمد' ہے جو پیشہ سے ایک ڈاکٹر ہیں اور جدہ میں مقیم ہیں۔ تیسرے فرزند کا نام 'عظیم احمد' ہے جو پیشہ سے انجینئر ہیں اور آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ لڑکی کا نام 'زاہدہ بیگم' ہے جو حیدرآباد میں ہی مقیم ہے۔ غوث خواہ مخواہ کے بے شمار دوست ہیں۔ سبھی سے خوشگوار تعلقات ہیں، لیکن معروف مزاحیہ شاعر 'حمایت اللہ' ان کے سب سے قریبی دوست ہیں۔ میرے کرم فرما محمود سلیم اور قاری نصیر الدین المنشاوی بھی آج میرے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ گو اُن کی ملاقاتیں خواہ مخواہ صاحب سے بہت کم ہوئیں ہیں لیکن یہ دونوں غوث صاحب کے زبردست مداح ہیں۔ اکثر مجھ سے ان کے اشعار سُنا کرتے تھے۔ اتنے بڑے نامور شاعر کو راقم نے جب بھی اپنے مشاعرے (نظام آباد) میں مدعو کیا۔

(1)

بجھتی شمع لے کر سیاہی ڈھانپنے نکلا ہوں
اپنے حصے کی خوشیاں بھی سب میں بانٹنے نکلا ہوں
خواہ مخواہ فرہاد نہیں میں لیکن وہ دیوانہ ہوں
کچھ کاغذ کے تیشے لے کر پتھر کاٹنے نکلا ہوں

(2)

غموں کی کھیر ٹیڑھی ہی نہیں گاڑھی بھی ہوتی ہے
نہ پی جاتی ہے یہ اور نہ اسے میں چاٹ سکتا ہوں
اڑا کر دیکھ لے کوئی پتنگیں اپنی شیخی کی
بلندی پر اگر ہوں تو کنّے کاٹ سکتا ہوں

(3)

دھندلا سا ایک خواب ہے دنیا کی محبت
صحرا میں ایک سراب ہے دنیا کی محبت
وقتِ نزع ہی خواہ مخواہ چل جائے گا پتہ
کتنا بڑا عذاب ہے دنیا کی محبت

(4)

ہماری زندگی میں خواہ مخواہ اتنے جھمیلے ہیں
خوشی کے ساتھ صبح و شام رنج و غم کے میلے ہیں
اگر سمجھو تو ساری بھیڑ میں ہر شخص اپنا ہے
نہیں سمجھو تو اتنی بھیڑ میں بھی ہم اکیلے ہیں

(5)

غم حیات کا اک سلسلہ بس اتنا تھا
جو دل میں ٹھان لیا فیصلہ بس اتنا تھا
غموں کو اپنے چھپاتی تھی اپنے آنچل میں
غریب ماں کا مری حوصلہ بس اتنا تھا

سنجیدہ شاعری میں خواہ مخواہ کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا ان کی تو رگ رگ میں ظرافت کے شرارے دوڑ رہے تھے۔ پھر انہوں نے طنز و مزاح کو اپنی شاعری کا وسیلہ بنایا۔ نہایت ہی کم عرصہ میں یہ مشہور ہوگئے۔ جس مشاعرے میں بھی جاتے دونوں ہاتھوں سے داد لوٹ کر لے آتے، آہستہ آہستہ ان کی شہرت کا گراف بڑھنے لگا اور ملک میں منعقد ہونے والے کل ہند مشاعروں میں انہیں مدعو کیا جانے لگا شہرت کی دیوی ان پر پوری طرح سے مہربان ہوچکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے غوث خواہ مخواہ مزاحیہ مشاعروں کی ضرورت بن گئے۔ اب ان کی شہرت ملک کے حدود سے نکل کر بیرونی ممالک میں بھی پھیل چکی تھی، چنانچہ انہوں نے لندن، آسٹریلیا، کینڈا، امریکہ، جدہ، دوبئی، قطر، جرمنی و دیگر بیرونی ممالک میں شرکت کرتے ہوئے اپنی مزاحیہ شاعری کے جھنڈے گاڑ دیے۔

آخر میں میں اپنے مضمون کا اختتام حضرت خواہ مخواہ (مرحوم) کے اس شعر کے ساتھ کرنا چاہوں گا۔

جب نکل کر میں مکاں سے لامکاں میں آگیا
ذکر میرا تب حدیثِ دیگراں میں آگیا
کہہ نہیں سکتا کہ کتنی دور چل پاؤں گا میں
آبلہ قدموں سے چل کر اب زباں میں آگیا

وہ نہایت خلوص اور اپنائیت کے ساتھ آتے تھے، اُن کی آمد سے مشاعرے کی کامیابی یقینی ہوجاتی تھی۔ غوث خواہ مخواہ نے زندگی میں کبھی نام و نمود اور شہرت کا پیچھا نہیں کیا بلکہ شہرت اور کامیابی ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہا کرتی تھی، تصنع، بناوٹ اور جھوٹی شان سے انھیں سخت چڑھ تھی، سادگی، عاجزی، انکساری اور صاف دلی سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ یہ تمام چیزیں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کے یہ دو شعر دیکھیں جس میں انھوں نے زندگی کے فلسفے کو اپنے ڈھنگ سے کہنے کی کوشش کی ہے۔

وقت کا کام ہے گزرنا گزر جائے گا
بوجھ سینے کا بھی اک روز اتر جائے گا
بس یہی سوچ کے بچا نہیں خود کو میں نے
مرے اندر جو ایک انسان ہے مرجائے گا

■

Dr. Zamin Ali Hasrat
9/16/60, Ahmad Pura Colony
Nizamabad (Telangana)
Mob.: 9440882330

اردو کی ادبی صحافت اور وہاب اشرفی

ابرار احمد اجراوی

اس ذرے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہردم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

پروفیسر وہاب اشرفی (1936-2012) عصر حاضر کے معروف ناقد و ادیب رہے ہیں۔انھوں نے بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کو اپنے تنقیدی نظریات و افکار کی تازگی و تابندگی سے بہت متاثر کیا ہے۔ان کی شخصیت ہشت رنگ تھی۔ادب وتنقید کے ہفت اقلیم کی حکمرانی ان کے حصے میں آئی تھی۔ان کی صلاحیتوں اور کارگزاریوں کا کئی میدان مرکز ومحور بنا رہا۔ وہ تنقید کے حوالے سے آفاقی نقطۂ نظر کے حامل تھے اور تنقید و تحقیق کی دنیا میں جمود وسکوت کو ادب کی صحت کے لیے زہر ہلاہل یقین کرتے تھے۔ وہ کئی حوالوں سے شہرت و ناموری کا عنوان بنے رہے۔ وہ کام یاب معلم و مدرس بھی تھے اور شہرہ آفاق ادیب و ناقد بھی۔ وہ پایے کے محقق و مبصر بھی تھے اور باصلاحیت شاعر وافسانہ نگار بھی۔ان کے افکار ونظریات کی کائنات بھی یک رنگی نہ تھی، بہت بوقلموں، رنگارنگ اور وسیع تھی، جس کے کئی تحریکات اور ادبی رجحانات پر گہرے اثرات ثبت ہیں۔وہاب اشرفی ان سب کے علاوہ ایک منجھے ہوئے صحافی بھی تھے اور اپنے عہد کی مروجہ صحافت خصوصا ادبی صحافت کے بھی ایک اہم ستون رہے تھے۔ان کی زندگی کے اس روشن پہلو پر محققین یا ناقدین نے کم کم توجہ دی ہے۔ جب کہ ان کی ابتدائی تحریری زندگی کا رنگ زیادہ تر صحافتی تحریروں میں ہی کھلتا ہے،ان کی صحافت کا یہ وہ پرآشوب زمانہ تھا،جب وہ تقسیم ہند کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بنگلہ دیش اور بنگال کی سر زمین پر فروکش ہوئے تھے۔

وہاب اشرفی نے آنکھیں بہار کے ایک دور افتادہ گاؤں 'کاکو' میں کھولیں، مگر ان کی تعلیمی اور پھر پیشہ ورانہ صحافتی زندگی کا مرکز شہر آرزو کلکتہ بنا۔ان کی یہ نقل مکانی کسی فیشن یا شوق سیر و سیاحت کا نتیجہ نہ تھی، یہ ہجرت تقسیم ہند کے کرب و آلام کا لازمی ثمرہ تھی۔جب بہار میں حالات زبونی کا شکار ہوگئے،لوگ سر چھپانے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگے کہ فرقہ پرست جنونی خون کی ہولی کھیلنے لگے تھے، تو وہاب اشرفی بھی اپنے وطن سے اپنے بھائی کی معیت میں(1949 میں)بنگال کوچ کر گئے، جب یہاں بھی قدم جمانے میں دقت ہوئی تو بنگلہ دیش چلے گئے، جہاں اردو کے خلاف نفرت کی تحریک ان دنوں زوروں پر تھی، اسی پرتشدد تحریک نے انھیں اپنے قدم واپس کھینچنے پر مجبور کردیا۔ چناں چہ پھر اپنے وطن ہندستان آگئے، اور 1952 میں کلکتہ کو ہی اپنا مستقل مرکز و مستقر بنالیا۔ یہاں انھوں نے انٹر کیا، پھر بی اے کرنے کے لیے سینٹرل کالج کلکتہ (اب مولانا آزاد کالج) میں داخلہ لے لیا۔گریجویشن میں ایک سبجیکٹ انگریزی بھی تھا۔کلکتہ کا قیام ان کے لیے صحافت و اخبار نویسی کی کائنات سے وابستگی کا سنہرا موقع ثابت ہوا۔چونکہ وہ کسی بڑے زمین دار خانوادے کے نہیں، ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے، اس لیے جب انھیں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے اور گزر بسر کے لیے کچھ کرنے کی فکر ستانے لگی،تو پہلے بے تحاشا دن رات ایک کرکے ٹیوشن کیا،پھر مختلف اخبارات و رسائل کے دفاتر ان کی صحافتی کاوشوں کے گواہ بنے۔پہلے روزنامہ 'عصر جدید' اور پھر ایک ایوننگ اخبار 'الحق' میں کام کیا۔ یہ وہ دو اہم اخبارات ورسائل ہیں، جو ان کی صحافتی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ کلکتہ کی تگ و تاز اور بھاگم بھاگ والی زندگی نے ہی انھیں ایک روزنامہ نکالنے کی تحریک وترغیب بھی بخشی اور وہ روزنامہ 'اخوت' کے نام سے کلکتہ کے بام ودر سے نمودار ہوا۔اس کی اشاعت کی کوششوں میں ان کے شانہ بشانہ ناظر الحسینی بھی شامل

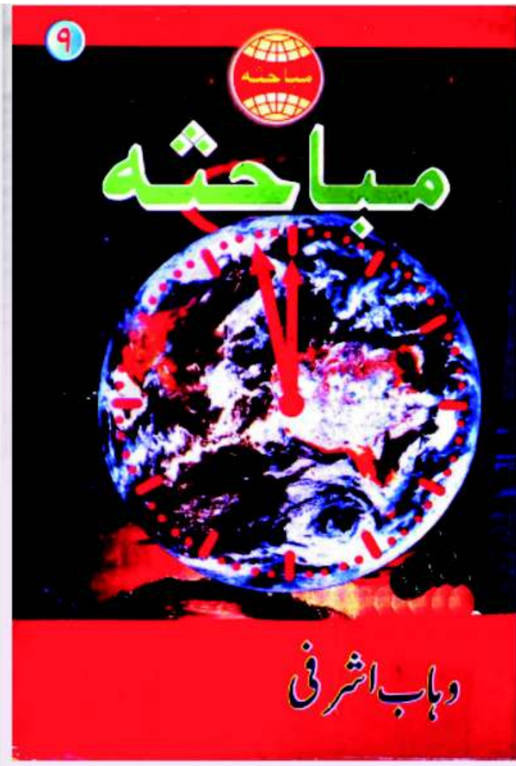

رہے۔ یہ اپنے عہد کا بڑا بے باک، حق گو اور ہنگامہ خیز اخبار تھا۔ جس سے بعد میں ش۔ مظفر پوری جیسے یگانہ روزگار صحافی اور افسانہ نگار بھی وابستہ رہے تھے۔ اشرفی صاحب 'روزانہ ہند' سے بھی وابستہ رہے اور اپنی برجستہ صحافتی تحریروں سے پوری اردو دنیا پر راج کرتے رہے۔ ان اخبارات میں وہ بحیثیت صحافی، خبرنویس اور مترجم کے کام کرتے رہے۔ خود اپنی خودنوشت میں یہ سب احوال رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کلکتے سے کئی اچھے اخبارات نکل رہے تھے 'روزمانہ ہند'، عصر جدید' اور شام کا اخبار 'الحق' وغیرہ۔ میں دوسرے اخباروں کے ساتھ باضابطہ 'الحق' میں کام کرنے لگا۔ اس وقت اردو کی ادبی صحافت کے نام جو چیز تھی وہ اداریہ لکھنے اور انگریزی کی خبروں کے اردو ترجمے پر ختم ہوتی تھی۔ ایجنسیوں سے جو خبریں آتیں ان کی زبان بھی انگریزی ہوتی۔ گویا اخبار کا پیٹ ترجموں کے ذریعے بھرا جاتا۔ آخری خبر رات کے 2 بجے بنائی جاتی یا ترتیب دی جاتی۔ میری ڈیوٹی عام طور سے دیر رات تک ہوتی۔"

(قصہ بے سمت زندگی کا، ص 67، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008)

یہ تو ان کی وہ حسب زمانہ صحافت تھی، جس میں سماج و سیاست اور شہر و قریہ کے روزمرہ کے مسائل زیر بحث رہا کرتے تھے اور ان مسائل کی تان اکثر سیاست دانوں کی تحریری گرفت پر ٹوٹتی تھی۔ اخباری تحریروں میں ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت اپنے حریف اور مدمقابل کی پگڑی اچھالنا ان دنوں عام بات تھی۔ اس کے بعد ان کی صحافت کا وہ عہد شروع ہوتا ہے، جو وہاب اشرفی کی زندگی کا شناخت نامہ بنا اور جس سے ہم یہاں تفصیلی بحث کرنا

صحافت کا شوق وہاب اشرفی کے اندر پہلے سے موجود تھا, وہ امور صحافت اور اس کی باریکیوں اور نزاکتوں پر بھی ماہرانہ اورگہری نظر رکھتے تھے.شعبۂ لائف انشورنس میں ملازم کی حیثیت سے جب کلکتہ سے دار الحکومت پٹنہ منتقل ہوئے, تو یہاں بھی ان کی صحافت کا شوق ماند نہیں پڑا. قیام پٹنہ کے دوران ہی ماہ نامہ 'صنم' 1958 میں جاری کیا, جس کی مجلس ادارت میں وہاب اشرفی کے علاوہ سید رفیع احمد کا نام بھی کندہ رہتا تھا.صنم اس وقت کا نمائندہ ادبی رسالہ تھا, اس وقت پٹنہ سے صرف دو رسالے 'صبح نو' اور 'اشارہ' ہی نکل رہے تھے.

چاہتے ہیں۔ یعنی ادبی صحافت اور ادبی مسائل و مباحث پر مرکوز وہ تحریریں تخلیقات جو رسائل و مجلات کی زینت بنیں۔ ادبی صحافت اور عام قسم کی صحافت کیا ہے، کن بنیادوں پر صحافت اور ادب کے درمیان تفریق کی لکیر کھینچنا ممکن ہے۔ ادبی صحافت کی جمالیات/اساس کیا ہے؟ ادبی صحافت کی شعریات کی تحدید کس طور ممکن ہے؟ ادب اور صحافت میں کافی فرق ہے۔ ادبی صحافت ایک ہمہ گیر متن کی تشکیل کا نام ہے۔ خالص صحافتی تحریروں میں قلم کار اپنے خیالات و احساسات کی پیش کش سے خود کو باز رکھتا ہے، جب کہ ادیب کو داستان دل رقم کرتے ہوئے اپنے خیالات کی آمیزش کرنے کی بھی آزادی ہوتی ہے۔

ادب اور صحافت کے کیا تقاضے ہیں، وزیر آغا لکھتے ہیں:

"بحیثیت مجموعی ادب کسی زمانے کے خارجی حالات و واقعات کی بہ نسبت اس زمانے کے میلانات و رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک تاریخی جائزہ ایک ادب پارے سے اس حد تک مختلف ہے کہ جہاں مقدم الذکر کا دائرۂ عمل واقعات کی ترتیب و تدوین تک محدود ہے، وہاں ادب ان احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو ایک خاص زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں اور جن کے باعث اجتماعی ملکی شعور ایک حد تک مرتب ہوتا ہے..... ادب کی حیثیت مستقل ہے، اور صحافت کی حیثیت محض ہنگامی، لیکن ادب اور صحافت کا فرق مواد اور موضوع تک محدود نہیں۔ در اصل اس کا نمایاں فرق وہ طریق اظہار ہے جو ادب کو ادب اور صحافت کو صحافت کا درجہ عطا کرتا ہے۔"

(اردو ادب میں مزاح، وزیر آغا، ص 309، مکتبہ عالیہ لاہور، 1977)

یہی وجہ ہے کہ ادبی اور صحافتی زبان بھی یکساں نہیں ہوتی۔ ادبی تحریر لکھتے ہوئے نہ وقت کسی کا دامن تھامتا ہے اور کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہونے کی وجہ سے سوچنے اور غور کرنے کی فرصت سے بھی ادیب کو نہیں روکا جا سکتا۔ جب کہ صحافتی دنیا میں وقت کی قلت دامن گیر ہوتی ہے، ذرا سی تاخیر سارے ابلاغی نظام پر پانی پھیر دیتی ہے۔ یہاں نہ زیادہ سوچنے اور غور و فکر کرنے کی فرصت اور نہ اپنی تحریروں کو ادبی چاشنی سے ہم آمیز کرنے کا موقع۔ ادیب ایک خاص اور محدود طبقے کو نظر میں رکھ کر اپنا قلم چلاتا ہے، تو صحافی کا دائرۂ ترسیل لامحدود اور اس کا ریسیور غیر معدود ہوتا ہے۔ عام طور سے اخبار نویس اپنی بات قارئین کے دلوں میں اتارنے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے، تو ادیب اور قلم کار نسبتاً اپنی خلاقانہ صلاحیت اور فن کاری کا نقش دوسروں پر قائم کرنے کے لیے قسمت آزمائی کرتے ہیں۔

صحافت کا شوق وہاب اشرفی کے اندر پہلے سے موجود تھا، وہ امور صحافت اور اس کی باریکیوں اور نزاکتوں پر بھی ماہرانہ اور گہری نظر رکھتے تھے۔ شعبۂ لائف انشورنس میں ملازم کی حیثیت سے جب کلکتہ سے دارالحکومت پٹنہ منتقل ہوئے، تو یہاں بھی ان کی صحافت کا شوق ماند نہیں پڑا۔ قیام پٹنہ کے دوران ہی ماہ نامہ 'صنم' 1958 میں جاری کیا، جس کی مجلس ادارت میں وہاب اشرفی کے علاوہ سید رفیع احمد کا نام بھی کندہ رہتا تھا۔ صنم اس وقت کا نمائندہ ادبی رسالہ تھا، اس وقت پٹنہ سے صرف دو رسالے 'صبح نو' اور 'اشارہ' ہی نکل رہے تھے۔ صنم کو بھی جہان ادب میں بے انتہا مقبولیت ملی۔ یوں تو صنم کے تمام شماروں نے ادبی حلقے کو اپنی جانب متوجہ کیا، مگر اس کے دو خاص شمارے: 'افسانہ نمبر' اور 'بہار نمبر' نے ادبی دنیا میں خاصی ہلچل پیدا کی کہ اس سے ادب کی وہ حاشیائی دنیا انگڑائی لینے پر آمادہ ہوئی جس کو ادب کے چغادری منہ تک نہیں لگاتے تھے۔ یہ وہاب اشرفی کی زمانہ سازی کی صلاحیت ہی تھی کہ انھوں نے اس وقت کے تمام بڑے ادبا و شعرا کو ایک رسالے کے سایے تلے جمع کر دیا تھا۔ کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی بھی اس رسالے کے چاند ستارے بنے رہے۔ اور 'صنم' بہار کے ادبی منظرنامہ کو عالمی شناخت عطا کرنے میں مصروف کار رہا۔

وہاب اشرفی نے کلام حیدری کے ہفتہ وار مورچہ کو بھی اپنی صحافتی تگ و دو کا مرکز بنایا۔ وہاب اشرفی اس رسالہ میں 'میرا صفحہ' کے نام سے ایک ادبی کالم لکھتے تھے، جو کافی مشہور ہوا تھا۔ محمود ہاشمی اور جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کا مشہور زمانہ ادبی معرکہ اسی مورچہ کے صفحات کا گواہ بنا۔ یہ ادبی جنگ جن دنوں چھڑی ہوئی تھی، مورچہ کو علاقائیت کی تنگ نائے سے نکل کر ادب کی وسیع دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے کا موقع ملا۔ جب رانچی یونی ورسٹی سے وابستہ ہوئے تو انھوں نے اس کے شعبۂ اردو سے ایک مجلّہ 'نئی قدریں' کے نام سے نکالا، جو نہ صرف یہ کہ نئے ادب کی تفہیم و ترسیل میں کلیدی حیثیت کا ثابت ہوا، بلکہ اس میں نئے لکھنے والوں کا استقبال بھی ہوا اور ان کی خوب پذیرائی بھی ہوئی۔

یہ سارے رسالے، اخبارات یا مجلات وہاب اشرفی کی صحافت کا مختصر پڑاؤ تھے اور کہنا چاہیے کہ یہاں انھوں نے ادبی صحافت کی ابتدائی منزل ہی طے کی۔ یوں بھی چند شماروں سے کسی صحافی کے جوہر کا پتہ لگانا اور کوئی حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وہاب اشرفی کی چھتنار اور دراز قد صحافیانہ شخصیت کو پھیلنے اور پھولنے کے لیے وسیع و عریض جہان ادب کی ضرورت تھی۔ ان کے پاس عالمی

ادبی نظریات و افکار کا جو وقیع سرمایہ تھا، اس سے جہان ادب کو واقف کرانے اور تازہ ترین ادبی امور و مباحث پر بحث کرنے کے لیے مستقل رسالے کی ضرورت ہنوز باقی تھی۔ اسی لیے انھوں نے نئی صدی کو اپنے لیے ایک سنگ میل تصور کیا، کمر ہمت کس لی اور اکیسویں صدی کے دوسرے سال ہی ایک رسالہ بڑی آن بان اور شان کے ساتھ جاری کیا۔ یہ ایک ضخیم اور دستاویزی رسالہ تھا، جو مباحثہ کے نام سے اگست 2001 میں پٹنہ سے شائع ہوا۔ مباحثہ نے ادب میں نئے ادبی وشعری رجحان کی سرپرستی و پیروی کی، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور خصوصا وہ نسل جو 80 کے بعد اپنے لیے ادبی جہان میں اسپیس کی متلاشی تھی اور جنھیں دانستہ Ignore کیا جارہا تھا، اس کو کھلا ہوا جہان عطا کیا۔ اور انھیں اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے ایک وقیع پلیٹ فارم مہیا کیا۔ گرچہ وہاب اشرفی مابعد جدید عہد کے ناقد و ادیب تھے اور یہ اس زمانے میں کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہ تھی، مگر انھوں نے اپنے رسالے کو اس قسم کی تفریق و تقسیم سے بظاہر بالاتر رکھا اور ہر قسم کی نئی ہواؤں کے استقبال کے لیے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھیں۔ اس وقت بہار و دلی اور اتر پردیش ہی نہیں، ملک کے طول و عرض سے بڑے وقیع ادبی رسائل شائع ہورہے تھے، ایسے میں ایک نئے رسالے مباحثہ کی اشاعت کا جواز اور ہدف کیا تھا، پہلے شمارے کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''رسالہ مباحثہ کی اشاعت کا جواز کیا ہے؟ پہلے ہی اردو میں چھوٹے بڑے رسالے ہندوستان کے مختلف گوشوں سے نکل رہے ہیں ان کی نوعیت ضخامت کے اعتبار سے متنوع ہے۔ بعض تو اتنے ضخیم ہیں کہ انھیں پڑھنے کے لیے خاصا وقت چاہیے اور بعض چار چھ صفحات پر مشتمل۔ مواد اور ترتیب کے اعتبار سے بھی یہ ایک جیسے نہیں ہیں، تو پھر ایک اور رسالہ کیوں؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا جواب جو بھی دیا جائے اس کی حیثیت عذر لنگ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بہر طور میرا جی چاہا کہ میں بھی ایک رسالہ نکالوں۔''

(مباحثہ، شمارہ 1، اگست 2001)

اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اس سے ان کے ادبی صحافتی رویے کی بھی عکاسی ہوتی ہے کہ رسائل و جرائد کی اشاعت کا مقصد اصلی کیا ہونا چاہیے:

''آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آج کی ادبی فضا بڑی وسعت کی حامل ہوگئی ہے۔ ایک طرف ادب کے نئے امکانات تلاش کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ایسے امکانات پر سوالیہ نشانات قائم کیے جارہے ہیں۔ میرے خیال میں دونوں رویے اپنی جگہ پر اہم ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ اگر طرفین میں مجادلے کا انداز پیدا ہوتا جارہا ہے تو یہ بھی امکان کے اندر کا عمل ہے، تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ دلوں کا بخار نکل جاتا ہے تو سکون لازمی نتیجے کے طور پر ابھرتا ہے اور ساتھ ساتھ نئی توانائی اور نئی صحت بھی۔ ہاں کردار کشی نہ کی جائے تو یہ بڑا اچھا حربہ ہے۔'' (ایضا، ش:1، اگست 2001)

وہاب اشرفی صاحب نے اپنے رسالے میں اپنے متعینہ اہداف و مقاصد کی حتی الامکان پیروی کی۔ انھوں نے ادب کے صحت مند نظریہ سے بحث کی اور نئے لکھنے والوں اور 1980 کے بعد ابھرنے والی نسل کی جم کر پیٹھ تھپتھپائی، انھیں جی بھر کر داد دی۔ وہاب صاحب علاقائی تشخص پر اصرار تو کرتے تھے کہ انھوں نے ریاست کے قلم کاروں اور تخلیق کاروں کی پذیرائی کی، مگر اپنے رسالے کو کسی خاص مکتب فکر یا تنظیم و تحریک کا آرگن نہیں بننے دیا، جب کہ ایسا کرنا ناممکن سا لگتا ہے کہ وہ خود مابعد جدید تنقیدی نقطۂ نظر کے طرف دار رہے تھے اور مابعد جدید شعریات کی تفہیم و تعبیر ان کا اصل الاصول بھی رہا تھا۔ انھوں نے مباحثہ میں نئے نئے ادبی کالم کا اضافہ کیا، جن بنیادی کالم یا خاص عنوانات کو مباحثہ میں جگہ ملی وہ کچھ اس طرح تھے۔ افکار، یادیں، زندگی، وسعت زندگی، ساز تخلیق، سوز دروں، فکر تحسین، میرے نقطۂ نظر سے، نکتہ اور نکتہ داں وغیرہ۔ تمام مضامین/تخلیقات کی نوک پلک خود سنوارتے اور تمام نہیں تو اکثر مضامین پر تنقیدی تعارفی نوٹ لکھتے رہے اور اپنے اداریہ میں اس تحریر کے اہم نکات کی جانب قاری کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ تاکہ مصنف و مدیر کا مسلک و منشا واضح ہوجائے اور قاری کہیں گمراہ نہ ہو۔

مباحثہ کے پہلے شمارے کو ادبی حلقوں سے خوب داد ملی کیوں کہ یہ ایک غیر متعصب علمی اور ادبی رسالہ تھا۔ تحسین و تبریک پر مبنی خطوط ملے، جو ان کے کالم نکتہ اور نکتہ داں میں بھی شامل ہیں۔ دوسرے شمارے میں خود ہی لکھتے ہیں، جس میں انھوں نے ادب میں اختلاف و انحراف پر مبنی روش کی ستائش کی ہے، اگر اس کا مقصد کسی کی پگڑی اچھالنا نہ ہو:

''مباحثہ مختلف اذہان کے لوگوں کو متاثر کررہا ہے۔ ایک چیز جو خاص طریقے سے پسند کی جارہی ہے وہ اس کا غیر متعصب ہونا ہے۔ یہ بے حد اہم مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ چند ادبا خصوصاً نقاد خانوں میں منقسم ہو کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ادب کی مٹی پلید کررہے ہیں۔ نقطۂ نظر کا اختلاف کوئی آج کی بات نہیں ہے، ایسا اختلاف ادبی موشگافی نہیں ہوتا بلکہ سوچی سمجھی رائے کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے اور اس میں تعصب کی کوئی فضا نہیں ہوتی، کسی کو فتح کرنے کا گمان نہیں ہوتا، کسی کی شکست کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بس مسئلہ یہ رہتا ہے کہ ادب کی پرکھ، اس کی تفہیم اور اس سے لذت آشنائی کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے۔ یہیں سے اختلاف کا پہلو نکلتا ہے۔'' (مباحثہ، شمارہ 3-2، دسمبر-جنوری 2002)

بعض حلقوں سے رسالہ پر سوالات بھی اٹھائے گئے؟ مدیر کا ادبی مسلک جاننے کی آواز اٹھی۔ کیوں کہ وہ ایک مابعد جدید نقاد کے طور پر اس وقت مشہور و متعارف ہوچکے تھے۔ گرچہ رسالے میں انھوں نے کسی خاص مسلک کی پابندی نہیں کی، مضامین کا معیار اور بحث کا منہاج ہی ان کی نظروں کا محبوب بنا رہا، تاہم وہ خود اس قسم کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے دوسرے شمارے میں لکھتے ہیں:

''ایک بہت اہم سوال اٹھایا گیا کہ اب رسالے کی اشاعت اور اس کے مشتملات سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آخر مرتبین خصوصاً راقم الحروف کا ذاتی ادبی رویہ کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ جملے نقل کرتا ہوں جو میں نے ایک عرصہ پہلے اپنی کتاب 'آگہی کا منظر نامہ' کی پہلی اشاعت میں قلمبند کیا تھا۔ ''میری نگاہ میں ادبی روایات ہمیشہ محترم رہی ہیں چاہے ان کا تعلق کسی بھی دبستان سے ہو لیکن

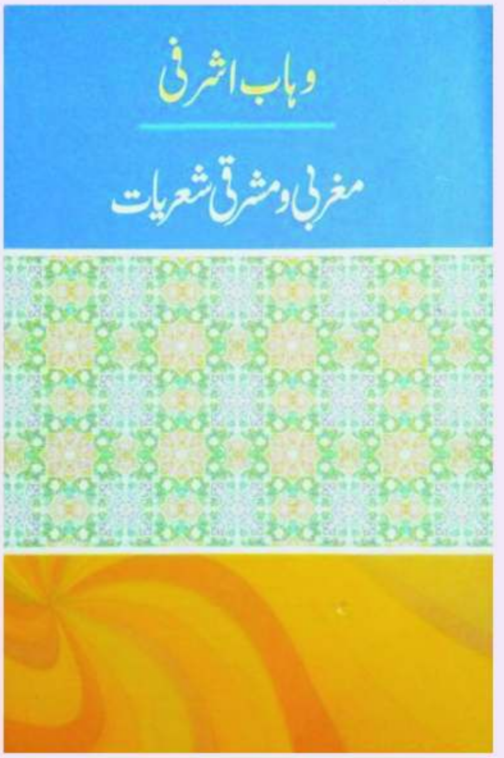

افکار و آرا کے ارتقا میں ادب کی نئی روش ہی کا رول سب سے زیادہ اہم ہے۔ تغیر و تبدل سے گھبرانے والے حقیقتاً ادبی رویوں کو جامد و ساکت باور کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ زمانی تبدیلیاں غور و فکر کی نئی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ ادب کو سڑنا گلنا نہیں تو اس کی تازگی برقرار رکھنا پڑے گی۔'' (شمارہ: 2، 2002، ص 4-5)

مضامین کے انتخاب اور اس کی تزئین کاری میں انھیں بہت دقتوں اور کلفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ رسالہ نکالنا اور مضامین و تخلیقات کا حصول آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے صبر و تحمل کا زہر پینا پڑتا ہے۔ وہ خود ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

''رسالے کی ادارت ایک کل وقتی چیز ہے، محتویات کے انتخاب میں خاصی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ متون کا براہ راست مطالعہ کیجیے پھر ان پر رائے زنی، دونوں ہی وقت طلب اور دقت طلب ہیں۔''

(ج:8، ش:29، 2008)

وہاب اشرفی کے یہاں قدیم و جدید، استاد و شاگرد یا خورد و کلاں کے نام کی تفریق برائے تفریق نہ تھی۔ وہ صرف فن و آرٹ کے عاشق تھے اور اسی کی روشنی میں فن کار و تخلیق کار کی قدر افزائی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اداریوں اور اپنی تحریروں میں جہاں سینئرس کا نام احترام کے ساتھ لیا، وہیں اپنے جونیئرس کو بھی انھوں نے محروم نہیں کیا۔ ان کی اس وسعت ظرفی اور فراخ دلی کا ثبوت ان کی مشہور کتاب تاریخ اردو ادب اور خود نوشت 'قصہ بے سمت زندگی' کے صفحات ہیں، جس میں انھوں نے شعر و ادب کی تمام معتبر شخصیات کے ساتھ نوخیز نسل کا بھی فراخ دلی سے ذکر کیا ہے۔ اداریہ میں مشمولات پر بحث کرتے ہوئے اپنے سے بہت جونیئر کی تحریر کی مدح سرائی کرتے ہیں، یہ رویہ آج کل کے رسالوں میں معدوم و مفقود ہے۔

وہاب اشرفی نے صرف انھی اخبارات و رسائل میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر کا مظاہر نہیں کیا، بلکہ اپنے عہد و وقت کے تمام اہم ادبی رسائل میں اپنی فکر انگیز ادبی تنقیدی تحریروں سے دھوم مچاتے رہے۔ ان کی تحریروں کی کسی رسالے میں اشاعت اس رسالے کے لیے سند وقار اور اعتراف نامہ تصور کی جاتی تھی۔ آج کل، استعارہ، آہنگ، زبان و ادب، آواز، شعور، شعر و حکمت، ایوان اردو، الفاظ، فکر و نظر، شب خون، اظہار، عہد نامہ، حصار، ترسیل، کتاب، کتاب نما، شاعر، تحریک، جواز، کوہسار، نشانات، سہ ماہی آمد، ترکش، جرنل خدا بخش لائبریری وغیرہ ان کی ادبی تحریروں کے لیے محور بنے رہے۔ غیر ملکی رسائل میں نقوش، آئندہ، روشنائی، صریر اور اوراق میں ان کی ادبی تحریروں کو نمایاں جگہ ملتی رہی۔ انھوں نے صرف مطبوعہ وسائل ابلاغ کو ہی اپنی ادبی تحریروں کی جولان گاہ نہیں بنایا، بلکہ ان کی تحریروں کو ہوا کے دوش پر سوار ہونے کا بھی موقع ملا۔ انھوں نے اپنے ادبی نظریات کی تشہیر و ترسیل کے لیے برقی میڈیا کا بھی سہارا لیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی، پٹنہ ریڈیو، رانچی ریڈیو کے ساتھ دور درشن پر بھی ادبی پروگرام میں حصہ لیتے رہے اور ادبی بحث و مباحثہ میں سرگرمی کے ساتھ شرکت کرتے رہے۔

وہاب اشرفی کی ادبی صحافت اور ان کے مخصوص آرگن مباحثہ کو اہم ناقدین نے اعتبار کی سند عطا کی۔ ادیب و ناقد حقانی القاسمی لکھتے ہیں:

''مباحثہ پٹنہ کے مدیر پروفیسر وہاب اشرفی کا تعلق مابعد جدید رجحان سے ہے مگر رسالہ نظریاتی اسیری سے آزاد ہے اور رسالے کے محتویات اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ 'مباحثہ' میں کھلی ڈلی آزاد فضا ہے اور ہر تخلیق کار کے لیے مباحثہ کے در وا ہیں۔ مباحثہ کے مشمولات فکر انگیز، معتبر، معنی خیز اور ادبی مباحث سے بھرپور ہوتے ہیں۔ فکر و نظر کو نئی روشنی اور ادب کو نئی موسموں سے روشناس کرانے والا مباحثہ اپنے ممیزات کی وجہ سے ادبی رسائل میں ممتاز ہے۔''

(مضمون ادبی صحافت کا عصری منظر نامہ، مشمولہ اکیسویں صدی میں اردو صحافت، مرتب امام اعظم، ص 45، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2016)

وہاب اشرفی ایک بیدار مغز، روشن دماغ اور بے باک صحافی رہے تھے۔ انھوں نے تمام ادبی اصناف شاعری، فکشن، تنقید، ڈرامہ پر لکھا، میدان صحافت میں اپنی کٹیا میں محو خرام رہے، کسی کی دریوزہ گری نہیں کی، نہ اس کو کسی تجارت کا ذریعہ بنایا، بلکہ وہ صحافت کو عبادت کا درجہ دیتے رہے اور ادبی صحافتی اخلاقیات کا دامن تھامے رہے، اعتدل و توازن ان کا شناخت نامہ رہا۔ یہ رویہ کبھی نہیں اپنایا کہ جو میرے ساتھ نہیں وہ میرا دشمن ہے۔ نہ انھوں نے ادب میں کسی دبستان کے جبر و ستم کو قبول کیا اور نہ ہی صحافت کے کارزار میں کسی کے سامنے سپر ڈالی۔ وہ ایک جری، نڈر اور جرأت مند صحافی تھے۔ اپنے نظریات و افکار کا اظہار کرنے میں کبھی کسی کی سرزنش یا کسی کی ناگواری کی پروا نہیں کی۔ انھوں نے شعر و ادب کے بڑے بڑے سورماؤں کو بھی خاطر میں نہیں لایا اور اپنی کسی فکر یا خیال کا خون بھی نہیں ہونے دیا، وہ اپنے ادبی موقف کا برملا اظہار و اعلان کرتے رہے۔ ادبی تھیوریاں بنتی اور بکھرتی رہیں اور وہاب اشرفی مست ہاتھی کی طرح ان تھیوریوں کے مقابلے میں اپنی نظر اور نظریہ کی تشکیل کرتے رہے۔ وہاب اشرفی نے اپنی صحافت کو یک رنگ یا یک رخی بھی نہیں ہونے دیا، بلکہ فکر و نظر کی نئی دنیا تلاش کرتے رہے اور ایک سند باد کی طرح دنیائے صحافت میں نئے جزیرے اور نئے منطقے کی کھوج لگاتے رہے۔ انھوں نے مباحثہ کے ذریعہ اسی ادبی صحافتی روایت کو تازگی، درخشندگی اور تابندگی عطا کی تھی، جو کبھی دل گداز، مخزن، ہمایوں، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، زمانہ، ساقی، عالمگیر اور نگار سے وابستہ رہی تھی۔

وہ تاعمر ادب و صحافت کی مشاغلی کرتے رہے اور آخری شمارہ (39) کی اشاعت کے دو دن بعد ہی اس دار فانی کو الوداع کہا۔ گویا ان کی زندگی کا خاتمہ ہی صحافت کی عبادت پر ہوا۔ ان کی کئی صحافتی ادبی تحریریں آج بھی ہمارے حافظہ کا حصہ ہیں اور ہمارا اہم ادبی ورثہ ہیں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے جنازے کے ساتھ مباحثہ کا بھی جنازہ اٹھا، ان کی موت کے ساتھ ہی مباحثہ کا وہ زریں صحافتی عہد بھی ختم ہو گیا، جس پر نہ صرف پوری ریاست بلکہ دنیائے ادب کو بھی رشک و فخر تھا۔ اور یہ فخر بجا بھی تھا کہ مدیر کی علمی و ادبی حیثیت ہی کسی رسالے کو اعتبار بخشتی ہے اور ادبی معاشرے میں وہاب اشرفی کی علمیت و ادبیت پر کسی کو شک نہ تھا۔ مباحثہ کے بعد ریاست میں ادبی صحافت کی سطح پر خوف ناک اور مہیب سناٹا طاری ہے۔ یہاں کی ادبی صحافت کے سمندر میں سکوت ہے۔ کوئی چہل پہل نہیں ہے۔ رسالوں کی 'آمد' ہی ان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ ادبی صحافت اور رسائل کو زندہ رکھنا ضروری ہے کہ یہ اپنے عہد کے رفتار پیما ہوتے ہیں اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ:

''پتریکاؤں (رسائل) کو ادب کے پہیے کہا جائے تو بہت غلط نہ ہوگا۔ کتابیں انفرادی اور عوامی ذخیروں میں ہی پڑی رہ جاتیں اگر رسائل انھیں اندھیرے بند کمروں سے کھینچ کر باہر کھلی ہوا میں نہ لے آتے۔ ادب کے لیے ہمیں کتابوں تک جانا پڑتا ہے، رسائل اسے ہم تک لے آتے ہیں۔ بحثیں اور اطلاعات دیتے ہیں۔ ہیرو اور ویلن بناتے ہیں۔ وہ ادب کو متحرک بناتے ہیں۔ سارے مذاکرے، مباحثے رسائل کے واسطے سے ہی ہوتے ہیں۔'' (ذہن جدید، ج:21، شمارہ:58، ص:11)

■

Abrar Ahmad
At+Post Ijra, Via Raiyam Factory
Distt: Madhubani - 847237 (Bihar)
Mob.:8651708079

اردو اور کشمیری زبان کا لسانی و تہذیبی رشتہ

الطاف حسین نقشبندی

آج معاصر دنیا میں انسانی معاشرے کو غربت، بھوک، تشدد، جنسی جرائم، مذہبی اور لسانی عصبیت جیسے سیکڑوں مسائل کا سامنا ہے۔ یقینی طور پر زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ دانشور اس صورت حال پر غور و فکر کر رہے ہیں لیکن اس ضمن میں سب سے اہم کردار مختلف زبانوں کے ادیب اور دانشور ادا کر رہے ہیں اور ان میں اردو اور کشمیری کے قلم کار بھی پیش پیش ہیں اور ایمانداری سے دیکھا جائے تو اردو اور کشمیری دونوں ہی زبانوں کا ادب صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب کا ترجمان ہے۔ گریرسن نے لکھا ہے:

''برعظیم کی ساری جدید زبانیں اپ بھرنش ہی کے بچے ہیں۔''

چونکہ اردو اور کشمیری کا شمار بھی جدید زبانوں میں ہی ہوتا ہے اس لیے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ساخت اور سرمایہ الفاظ میں اختلاف کے باوجود ایک ہی ماں 'شورسینی اپ بھرنش' کے دونوں بچوں اردو اور کشمیری کے بیچ لسانی اور تہذیبی رشتے بہت مضبوط ہیں۔ دونوں زبانیں جدید تو کہلاتی ہیں لیکن ان دونوں زبانوں میں الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو صدیوں پرانی ہندوستانی تہذیب کے بہاؤ کے ساتھ ان دونوں میں داخل ہوگئی ہیں۔ اس لیے لسانی اور تہذیبی اعتبار سے اردو اور کشمیری میں گہرا رشتہ ہے۔ دراصل دسویں صدی عیسوی کے بعد جب ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات عرب، ایران اور ترکستان جیسے مسلم علاقوں کے ساتھ بہت گہرے ہوگئے تو ان ہندوستانی ریاستوں میں مسلمان صوفیوں، مبلغوں، عالموں اور دانشوروں کا اثر و رسوخ بھی بڑھتا گیا اور پھر اگلی تین چار صدیوں میں پورے ہندوستان خاص طور پر دکن، لاہور، دہلی اور پنجاب جیسے علاقے اسلامی تہذیب و ثقافت کے بھی ایسے ہی روشن مرکز بن گئے جیسے کہ اسلام سے پہلے یہ علاقے بدھ اور ہندومت کے روشن مرکز تھے۔ جب ان ہندوستانی اور اسلامی تہذیبوں میں میل جول بڑھا تو ان کی زبانوں میں بھی لین دین کا سلسلہ بڑھا اور اس طرح برصغیر میں مذہبی بھائی چارہ اور مشترکہ تہذیب کی بنیاد پڑی جو مسلمان صوفیا اور علما آئے انھوں نے مقامی بولیوں اور زبانوں کو ہی اپنی دعوت کا ذریعہ بنایا۔ اس ضمن میں خاص طور پر داتا گنج ہجویری، حضرت معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت شیخ سلیم چشتی، حضرت بندہ نواز گیسو دراز اور شاہ بوعلی قلندر کے نام اہم ہیں۔ ان صوفیا اور علما کے علاوہ حضرت بلھے شاہ اور بابا فرید سنت کبیر اور گرونانک دیو جی مہاراج وغیرہ۔ برصغیر کی مختلف قوموں ان کی تہذیبوں اور زبانوں کو ایک کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ برصغیر کے مرکزوں سے دور پہاڑی ریاست جموں و کشمیر میں سانجھی تہذیب اور ملی جلی زبان کی تشکیل کا یہ عمل ذرا دیر سے چودہویں صدی میں یکے بعد دیگرے حضرت بلبل شاہ اور امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ، شاہ ہمدان، وغیرہ کی کوششوں سے کشمیر میں ایک نیا لسانی اور تہذیبی منظر نامہ تیار ہوا۔ اسلام کی آمد سے پہلے کشمیری عالموں ابھینو گپت آنندوردھن وغیرہ نے سنسکرت میں جو کارنامے انجام دئے ان کی وجہ سے کشمیر کو 'شاردا پیٹھ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد کشمیر کو ایران صغیر کا نام دیا گیا۔ اٹھارہویں، انیسویں صدی تک کشمیری اور اردو دونوں زبانوں نے پراکرت اور سنسکرت کے بعد اپ بھرنشوں کے علاوہ پالی، پنجابی، فارسی اور عربی کے الفاظ بھی اپنے اندر جذب کیے۔ حالانکہ جمیل جالبی کے مطابق تاریخی اعتبار سے اپ بھرنش کا اثر و رسوخ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے بنگال سے پنجاب، سندھ، کشمیر، گجرات و راجپوتانہ تک اور شمالی ہند و نیپال سے مہاراشٹرا جاری و ساری تھا اور پھر رفتہ رفتہ دیسی بولیوں اور تہذیبوں کے میل جول سے مستقل زبانوں کی حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ ماہر لسانیات نے ان زبانوں کی حرفی اور صوتی خصوصیات کی بنیاد پر ان کو تین زمروں میں رکھا ہے:

(1) پشاچی یا دردی زمرہ: اس زمرے میں کشمیری، پشتو، لہندا اور سندھی وغیرہ آتی ہے۔

(2) شورسینی زمرہ: مغربی ہندی، راجستھانی، پنجابی، گوجری/گجراتی، پہاڑی وغیرہ زبانوں کو اس زمرے میں رکھا جاتا ہے۔

(3) ماگدھی زمرہ: اس زمرے میں بنگالی، آسامی، اڑیا اور مرہٹی وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔

تاریخی اعتبار سے جب محمد بن قاسمؒ نے 712 میں سندھ اور ملتان کو فتح کیا اس وقت پورے علاقے میں ملی جلی بولیاں اور تہذیبیں تھیں۔ اور محمد بن قاسمؒ سے لے کر گیارہویں صدی کے آغاز یعنی 1001 میں محمود غزنوی کے حملے تک ہندوستانی اور اسلامی تہذیبوں اور زبانوں کا میل جول بڑی رفتار کے ساتھ ہوا۔ عربی ایرانی تہذیب اور زبانوں نے ہندوستانی زبانوں اور تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے:

''اس گہرے اثر کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان جب یہاں آئے تو واپس جانے کا ارادے سے نہیں آئے بلکہ آریوں کی طرح اس ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا وطن

بنالیا۔ دوسری وجہ یہ کہ یہاں کے لوگوں کی تہذیب کمزور، پارہ پارہ اور زوال پزیر تھی۔ باہر سے آنے والوں کے پاس جان دار زبانیں تھیں اور ان کے خیالات اور عقائد میں وہ توانائی اور لپک بھی تھی جو چڑھتے سورج اور ابھرتے پھیلتے نظام میں ہوتی ہے۔"

(تمدن ہند پر اسلامی اثرات، از ڈاکٹر تارا چند، ص 224 بحوالہ تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص 9)

کشمیری زبان دنیا کی قدیم زبانون میں سے ایک ہے۔ پنڈت کلہن نے اپنی مشہور کتاب 'راج ترنگنی' میں لکھا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ کشمیری میں بہت ساری زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے اسی لیے آج کی کشمیری زبان کا اگر پانچ سو برس پہلے کی کشمیری زبان سے موزانہ کیا جائے تو بہت فرق نظر آئے گا۔ دراصل چودہویں صدی تک کشمیر میں سیاسی اتھل پتھل نے لوگوں کو پریشان کر رکھا تھا چنانچہ کشمیری باشندوں نے ترکستان کے مشہور صوفی سید شرف الدین عبدالرحمٰن عرف بلبل شاہ کو 1336 میں کشمیر بلایا جنھوں نے کشمیری عوام میں اسلامی تعلیمات کو پھیلایا۔ اس وقت کا حکمراں رنچن شاہ بلبل کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مسلمان ہو گیا۔ جس نے سلطان صدرالدین کے نام سے کشمیر میں اسلامی دور کا آغاز کیا۔ جب 1372 میں ایران کے صوفی بزرگ امیر کبیر میر سید علی ہمدانی سات سو سے زیادہ اسلامی عالموں، مبلغوں اور کاریگروں کے ساتھ کشمیر آئے تو کشمیری زبان ہی نہیں سماجی رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ امیر کبیر اور ان کے مریدین عام لوگوں میں صرف تبلیغ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ کئی طرح کی دستکاریوں مثلاً قالین بافی، پیپر ماشی، فن تعمیر وغیرہ کی تربیت بھی دیتے تھے۔ چنانچہ اہل کشمیر نے اجتماعی طور پر نہ صرف دین اسلام کو اپنایا بلکہ سلطان زین العابدین کے عہد (1420-1470) میں فارسی زبان کشمیر کی علمی و ادبی زبان بن گئی۔ لیکن روزمرہ کی زندگی میں کشمیری کا چلن بھی جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ فارسی اور عربی کے الفاظ کشمیری زبان میں کثرت سے داخل ہونے لگے۔ اس طرح کشمیری زبان کا لسانی اور ثقافتی رشتہ پہلے فارسی، عربی اور اسلام سے قائم ہوا۔ لیکن جب 1775 میں بنگال پر انگریزوں کے قبضے کے بعد جب رفتہ رفتہ پورے ملک پر برطانوی پرچم لہرانے لگا تو انگریزوں نے بڑی عیاری کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پنجاب کی حکومت کو بھی اپنا باج گذار بنالیا۔ کشمیر کے لوگوں کا پنجاب کے شہروں، لاہور، جالندھر، امرتسر وغیرہ میں آنا جانا ایک عام سی بات تھی

❛ کشمیری زبان دنیا کی قدیم زبانون میں سے ایک ہے۔ پنڈت کلہن نے اپنی مشہور کتاب 'راج ترنگنی' میں لکھا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ کشمیری میں بہت ساری زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے اسی لیے آج کی کشمیری زبان کا اگر پانچ سو برس پہلے کی کشمیری زبان سے موزانہ کیا جائے تو بہت فرق نظر آئے گا ❜

جہاں عوامی زبان اردو تھی۔ پنجاب کے ان علاقوں کے اردو شعرا و ادبا بھی کشمیر آتے جاتے رہتے تھے۔ اور وہ کشمیری زبان و ادب سے اچھی طرح واقف بھی ہو گئے تھے۔ اس وقت تک کشمیری زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ بھی کثرت سے داخل ہو چکے تھے۔ دوسری بات یہ کہ فارسی کی طرح کشمیری بھی دائیں بائیں لکھی جاتی ہے اس لیے کشمیر کے لوگوں کو اردو کو اپنانے میں دشواری نہیں ہوئی اس لیے اٹھارہویں صدی تک آتے آتے اردو جموں اور کشمیر میں رابطے کی زبان کے طور پر مضبوط و مستحکم ہوتی چلی گئی۔

دیکھا جائے تو جموں وکشمیر میں اردو باضابطہ طور پر 1846 میں ڈوگرہ حکومت کے قیام کے بعد داخل ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ریاست کی سماجی و ثقافتی، مذہبی و دفتری اور علمی و ادبی میدانوں میں اس قدر تیز رفتاری سے مقبولیت کے مدارج طے کرتی ہے کہ 1885,86 تک آتے آتے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ ریاست جموں وکشمیر کے تینوں خطوں جموں وکشمیر اور لداخ میں لوگوں کی مادری زبانیں الگ الگ تھیں۔ کشمیر میں کشمیری کے علاوہ گریزی، بلتی، شنا وغیرہ، صوبہ جموں میں ڈوگری، گوجری اور پہاڑی اور لداخ میں لداخی اور بلتی وغیرہ زبانیں اور بولیوں کا رواج تھا۔ لیکن سرکاری درباری اور بازاری زبان اردو ہی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ریاست میں اردو کو سرکاری زبان بنائے جانے سے بہت پہلے لداخ میں اردو آپسی لین دین اور تبادلہ خیال کے لیے رابطے کی زبان تھی۔ ڈوگرہ راج سے پہلے لداخ وسط ایشیا کی اہم منڈی تھا یہاں مختلف ممالک کے لوگ تجارت کے لیے آتے تھے۔ عام لداخی خصوصاً تاجر لوگ ان سے اردو میں ہی بات کرتے تھے۔ لین دین حساب کتاب کے لیے بھی اردو ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ جموں کشمیر اور لداخ تینوں خطوں کے مسلمانوں کی مذہبی کتابیں تو اردو میں تھیں ہی ہندوؤں کی مقدس کتابیں، گیتا اور پُران وغیرہ بھی عام ہندو اردو میں ہی پڑھتے تھے۔ آج بھی پرانی نسل کے ہندو بزرگ خوشی محمد دل کا کیا ہوا گیتا کا اردو ترجمہ ہی پڑھتے ہیں۔ سکھ بھائیوں کا 'گرو گرنتھ صاحب' بھی اردو میں دستیاب تھا۔ دوسری بات یہ کہ بیرون ریاست کے لوگوں سے رابطہ مذہبی، ادبی اور علمی اظہار و بیان کا وسیلہ بھی اردو ہی ہے۔ اسی لیے جموں کشمیر اور لداخ کے ہر شخص کی دوسری مادری زبان اردو ہی ہے۔ اردو اور کشمیری کا لسانی اور ثقافتی رشتہ اس کے بعد سے ہی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ ریاست میں زیادہ تر اخبارات اور رسائل آج بھی اردو میں ہی شائع ہوتے ہیں۔ اردو کے دانشور صحافی ادیب اور شاعر بھی ہر فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں لکھتے رہے ہیں۔ پنڈت ہرگوپال خستہ اور محمد الدین فوق سے لے کر شاعر کشمیر مہجور، غلام رسول نازکی، رسا جاودانی، نند لال کول طالب اور مہندر رینا اور آج کی تاریخ میں حامدی کاشمیری، نور شاہ، رفیق راز، خالد بشیر، شفق سوپوری اور نذیر آزاد اردو اور کشمیری زبانوں میں یکساں طور پر لکھ رہے ہیں اور خاص طور پر ان کی اردو تحریریں یہ ثابت کر رہی ہیں کہ اردو زبان و ادب کا کشمیری زبان سے جو مضبوط اور مستحکم لسانی اور ثقافتی رشتہ ہے وہ رشتہ جموں کشمیر کے تینوں خطوں، جموں، کشمیر اور لداخ کو جوڑے رکھنے کی ضمانت تو ہے ہی، ریاست میں امن و امان قائم رکھنے اور اس ریاست کا رابطہ ملک کے دوسرے حصوں سے قائم رکھنے کا وسیلہ اردو ہی ہے۔

■

Dr. Altaf Husain Naqshbandi
Dept of Urdu
Centeral University of Kashmir 190004 (J&K)

ندیم احمد ندیم

اردو اور پنجابی
ایک تہذیبی و لسانیاتی مطالعہ

کوئی بھی زبان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک اس میں تہذیبی عناصر کی شیرینی شامل نہ ہو جائے کیونکہ تہذیب وتمدّن ہی وہ چراغ ہے جو کسی زبان کو فصاحت و بلاغت کی معراج تک پہنچانے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔اس لیے کسی بھی زبان کو جانچنے پرکھنے کے لیے صرف ونحو کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت کا مطالعہ بھی ازحد ضروری ہوتا ہے۔

پانچ دریاؤں کے آب زلال سے سرسبز وشاداب سرزمین پنجاب ہمیشہ سے ذکروفکر کا مرکز رہی ہے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں علم وآگہی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔یہاں کی زرخیزی ذہن و دل کو پاکیزگی و بالیدگی عطا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس پنجاب نے ایسے وسیع النظر اور بیدار مغز انسان پیدا کیے جو بے شمار لوگوں کی فیضیابی کا باعث بنے۔جہاں اس زبان نے گروؤں اور صوفی سنتوں کی زبان پنجابی کو جنم دیا وہیں اردو جیسی نفیس اور بلیغ زبان بھی اسی پنجاب میں پیدا ہوئی یعنی جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھنے والی یہ دونوں زبانیں اسی مقدّس سرزمین کی پروردہ ہیں۔شاید اسی وجہ سے دونوں زبانوں میں انفرادیت کے باوجود ایک ربط خاص موجود ہے جو دونوں زبانوں کے تہذیبی ولسانی مطالعے کو دلچسپ اور کارآمد بناتا ہے۔

زبان کی ایک بڑی خاصیت اس میں ہونے والی مسلسل تبدیلی ہے۔یہ تبدیلی جہاں معاشرے کی ضرورتوں کی بنا پر ہوتی ہے وہیں مختلف تہذیبوں کا باہمی میل ملاپ بھی اس کی بڑی وجہ ہے۔ہندوستان میں داخل ہونے والے فاتحین،صوفی سنتوں اور فوجیوں کا پہلا پڑاؤ اسی پنجاب کی سرزمین تھی۔اس لیے مختلف تہذیبوں کے ملنے سے جہاں ایک نئی تہذیب وجود میں آئی وہیں پہلے سے موجود زبانوں کی بھی بھرپور ترقی ہوئی اور نئی زبانوں کا اختراع بھی ہوا۔ان زبانوں میں ایک اہم زبان اردو بھی تھی۔بے شک پنجابی پہلے سے موجود تھی مگر اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔اس طرح نئی تہذیبوں کے سنگم نے جہاں اردو کو جنم دیا وہیں پنجابی کی ترویج وترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا اور یہ بھی سچائی ہے کہ پنجابی ایک بڑی بہن بلکہ ماں کی طرح اردو کی معاونت کرتی رہی اور پھر جب اردو اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تو پنجابی کو تقویت دیتی رہی۔یہ بات ویسے ہی ہے جیسے کسی خاندان کے افراد ایک دوسرے کے لیے معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی ترقی وفلاح میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔

نظر شیر علی خاں سرخوش اپنی کتاب 'تذکرہ اعجاز سخن" میں لکھتے ہیں:

''اردو کی نہایت ابتدائی شکل پنجابی ہی ہے..... اردوئے قدیم پنجابی سے ماخوذ ہے۔''

پروفیسر حمید احمد خاں کے مطابق:

''قدیم اردو حیرت ناک حد تک پنجابی کی طرح معلوم ہوتی ہے۔''

پنڈت دتاتریہ کیفی اپنی کتاب کیفیہ میں رقمطراز ہیں:

''اردو پنجاب میں ہی پیدا ہوئی۔''

پروفیسر محمود شیرانی اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں لکھتے ہیں:

اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبے کے زیرِ اثر تیار ہوا۔''

جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی 'تاریخ ادب اردو' جلد اوّل میں اردو اور پنجاب کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' پنجابی لہجہ، آہنگ،تلفّظ اور محاورہ شروع سے ہی اردو زبان کے مزاج میں شامل رہا ہے۔اردو کو اہل پنجاب نے اپنے سینے سے دودھ پلا کر پالا، پوسا اور بڑا کیا۔اردو کی روایت اور تاریخ میں پنجاب اسی طرح شامل ہے جس طرح انسانی رگوں کے اندر دوڑتے ہوئے تازہ خون میں سرخ وسفید جسیمے۔''

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اردو، پنجابی اور پنجابیت کا اٹوٹ رشتہ ہے۔زبان و بیان کی مختلف سطحوں کے مطالعے سے اس

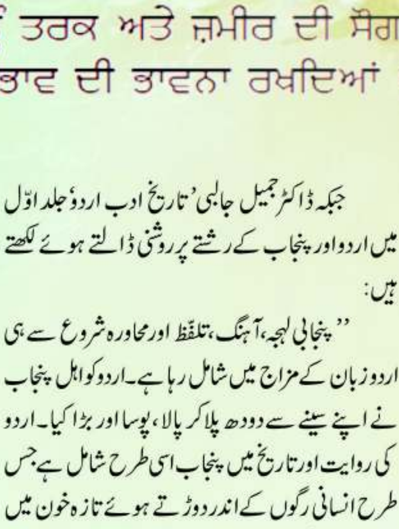

رشتے کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

کسی ایک زبان کا دوسری زبان پر اثر دیکھتے وقت پہلا پیمانہ الفاظ کا باہمی استعمال ہے۔اس لحاظ سے پنجابی نے بے شمار اردو الفاظ کو اپنا لیا ہے۔بے شک ان الفاظ کا ماخذ عربی، فارسی اور ترکی الفاظ ہیں لیکن غور طلب ہے کہ یہ الفاظ اردو کے توسط سے ہی پنجابی میں شامل ہوئے اور پنجابی نے اسی محبت اور رچاؤ کے ساتھ ان الفاظ کو اپنا لیا جو اردو کا حصہ ہیں۔ہاں یہ بات صحیح ہے کہ لفظوں کا یہ آپسی لین دین تین طریقوں سے ہوتا ہے۔پہلا طریقہ لفظوں کا ہو بہو (تت سم) اپنی اصل شکل کے ساتھ شمولیت کرنا ہے جبکہ دوسرا طریقہ لفظوں کی تھوڑی بدلی ہوئی شکل وصورت کے ساتھ شامل ہونا ہے اور تیسری شکل دونوں زبانوں کے الفاظ کا ایک نئے لفظ یا ترکیب کی صورت سامنے آتا ہے۔یہاں اردو اور پنجابی میں مشترکہ طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کی ایک فہرست دینا واجب معلوم ہوتا ہے۔

عقل، عجیب، عمر، امیر، عرق، عمل، احساس، عادت، آفت، اولاد، جلسہ، جلوس، اجلاس، عزت، ذلت، شربت، حضرت، شکل، صورت، عمارت، علاج، ایمان، سلام، شراب، حملہ، حوالات، حکم، حکومت، قدرت، قسمت، قیمت، خصلت، خط، خبر، اخبار، دیوان، قسم، قبر، قلم، کرامات، قاعدہ، قصہ، کتاب، خیال، غریب، غیرت، جناب، ضرورت، ظلم، جسم، دین، فیصلہ، وہم، مجبور، منظور، مطلب، مدد، مرض، مرضی، محبت، مقدمہ، ملک، موسم، موقع، مولوی، قاضی، یتیم، وکیل، امید، آوارہ، افسوس، اُف، آمدنی، سرکار، سردار، زبان، جادوگر، جاگیر، دستور، دماغ، پرہیز، پاجامہ، پرزہ، پیشہ، پیشی، پیمانہ، پیغمبر، فرمان، بلبل، اللہ، روزہ، روزی، روزگار، نماز، بندگی، عبادت، صداقت وغیرہ وغیرہ۔یعنی یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے،ہم ڈھونڈتے رہیں گے اور الفاظ ملتے رہیں گے۔

اسی طرح عربی وفارسی کے وہ الفاظ جو اردو سے ہوتے ہوئے پنجابی میں پہنچے تو انھوں نے نئی شکلیں اختیار کیں، جیسے: دخط (دستخط) چدّر (چادر) بزار، بجار (بازار) اگ (آگ) پیند، پیوند (پیوند) تسیل (تحصیل) سہور (شعور) اچّا (اونچا) انام (انعام) حجور (حضور) مجور (مزدور) متھاج (محتاج) بکل (بیاکل) چاچا (چچا) باندر (بندر) بھگ (بھاگ) چھڈو (چھوڑو) جھوٹھ (جھوٹ) بدّل (بادل) پچھے (پیچھے) کھنڈ (کھانڈ) آنڈا (انڈا) پھلّن (پھول) گڈی (گاڑی) رچھ (ریچھ) اگے (آگے) بھنڈ (بھانڈ) چول (چاول) ٹکا (ٹیکا) جٹ (جاٹ) مُل (مول) جھگ (جھاگ) اُن (اون) کم (کام) پنجیب (پازیب) مجوری (مزدوری) امان (ایمان) خودکشی (خودکشی) اُجو (وضو) نواج (نماز) منکعت (منفعت) وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح ناصر (ناصر) ہافج (حافظ) کامل (کامل) محسن (محسن) رازک (رازق) واجد (واحد) مرشد (مرشد) حاکم (حاکم) وغیرہ بولا جاتا ہے۔

اور کئی لفظ تو اتنے بدل گئے ہیں کہ اصل لفظ کہیں کھو کے رہ گیا ہے، جیسے:

ناظر۔۔ناظر۔۔ناجر۔۔نجر

آتش۔۔آتش۔۔آتس۔۔آتسڑی

قاصد۔۔کاسد۔۔کاسد

علمبردار۔۔لمبڑدار۔۔لمبردار۔۔نمبردار

حامد۔۔حامد۔۔حامد

ماجد۔۔ماجد۔۔ماجد

خالص۔۔کھالس۔۔کھالس

خالصہ۔۔کھالصہ۔۔کھالسا

حاضر حضور۔۔حادر حدور۔۔حادراحدور

لفافہ۔۔لپھاپھا۔۔لپھاپھا

صابن۔۔سابن۔۔سابن

جائے نماز۔۔جانماز۔۔جانماج وغیرہ

کئی جگہ عربی فارسی الفاظ سے نئے پنجابی لفظوں کا اختراع کیا گیا ہے جیسے:

عرض داشت (ارداس) راہِ راست (رہراس) واحد گرو (واہیگرو) ایک اللہ (اکولاہا) اک الٰہی (اکولاہی) پنجیب (پازیب) لیمو (نیبو) پُل صراط (پُرسلات) تنگی ترشی (تنگی ترسی) وغیرہ۔

اگر تہذیبی ومعاشرتی طور پر دیکھا جائے تو بہت سے عربی فارسی الفاظ آج سکھ مذہب کی پہچان بن چکے ہیں مثلاً دیگ، تیغ، فتح، نشان، صاحب، دربار صاحب، حاضر، حضور صاحب، صاحبزادہ، صاحبزادی، صاحب کمال، جاہ وجلال، ظفرنامہ، بادشاہ، پاتشاہ، درویش وغیرہ۔

الفاظ کے باہمی استعمال کے بعد دوسری اہم چیز صرف ونحو کی مانی جاتی ہے۔اس سطح پر جب ہم دونوں زبانوں کا محاسبہ کرتے ہیں تو بہت سی یکسانیت دیکھنے کو ملتی ہے۔مثلاً تذکیر وتانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں یکساں نظر آتے ہیں۔جو لفظ الف پر ختم ہوتا ہے اس کی تانیث بناتے وقت 'الف' کو 'ی' سے بدل دیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر لڑکا۔لڑکی، گھوڑا۔گھوڑی، دادا۔دادی، نانا۔نانی، راجا۔رانی، بکرا۔بکری، بھولا۔بھولی، لالا۔لالی وغیرہ۔

جب اسم مذکر حرف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہوتا ہے تو دونوں زبانوں میں 'نی' یا 'انی' کا اضافہ کرکے اسم مونث بنا لیا جاتا ہے، مثلاً سردار۔سردارنی، زمیندار۔زمیندارنی، اونٹ۔اونٹنی، لوہار۔لوہاری، سنار۔سناری، فقیر۔فقیرنی، نمبردار۔نمبردارنی وغیرہ وغیرہ۔

یہاں یہ جاننا بھی دلچسپ ہوگا کہ دونوں زبانوں میں جو 'نی' بطور لاحقہ استعمال ہوتی ہے وہ دراصل پنجابی معاشرے میں 'تانیث' کی علامت ہے اور عموماً لڑکیوں اور عورتوں کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جیسے نی کڑیے، نی دھیے، نی بہو، نی بھینیں، نی جیتے دی ماں وغیرہ۔

اگر اسم مذکر 'ی' پر ختم ہو تو اسم مونث میں 'ی' کو 'ن' سے بدل دیا جاتا ہے، جیسے تیلی۔تیلن، جوگی۔جوگن، موچی۔موچن، نائی۔نائن، درزی۔درزن، بھنگی۔بھنگن، دھوبی۔دھوبن وغیرہ وغیرہ۔

دونوں زبانوں میں ایک بڑی خاصیت یہ بھی ہے کہ چیزوں کے نام اور صفات، واحد جمع اور مذکر مونث اپنے موصوف کے عین مطابق تبدیل ہو جاتے ہیں۔میرا لڑکا (میرا منڈا) میرے لڑکے (میرے منڈے) میری لڑکی (میری کڑی) بڑا لڑکا (وڈا منڈا) بڑے لڑکے (وڈے منڈے)

موٹا کتا (موٹا کتا) اونچا گھوڑا (اُچا گھوڑا) وغیرہ۔

اور دونوں زبانوں میں تذکیر وتانیث یا جمع بناتے وقت فعل بھی اپنے فاعلن کے عین مطابق یکساں آتا ہے۔

لڑکا آیا (منڈا آیا) لڑکے آئے (منڈے آئے) لڑکی آئی (کڑی آئی) لڑکیاں آئیں (کڑیاں آئیاں) وغیرہ۔

دوسرے جملے میں خبر اپنے مبتدا کے مطابق نہیں ہے جبکہ پرانی اردو میں 'لڑکیاں آئیاں' ہی استعمال ہوتا تھا جو پنجابی سے پوری طرح مماثلت رکھتا تھا۔اس ضمن میں اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

ماضی مطلق کی مثالیں ملاحظہ کریں:

وہ آیا (اوہ آیا) وہ آئے (اوہ آئے) تو آیا (توں آیا) تم آئے (تسیں آئے) میں آیا (میں آیا) ہم آئے (اسیں آئے) وہ آئی (اوہ آئی) وہ آئیں (اوہ آئیاں) تو آئی (توں آئی) تم آئیں (تسیں آئیاں) وغیرہ۔

اسی طرح ماضی قریب کے جملوں میں بھی یکسانیت

نظر آتی ہے:

وہ آیا ہے(اوہ آیا ہے، اوہ آیا اے) وہ آئے ہیں (اوہ آئے ہن، اوہ آئے نے) وہ آئی ہے (اوہ آئی ہے، اوہ آئی اے) وہ آئیں ہیں(اوہ آئیاں ہن، اوہ آئیاں نے)وغیرہ۔

ماضی بعید کی بات کریں تو؛

وہ آیا تھا(اوہ آیا سی) وہ آئے تھے (اوہ آئے سن) وہ آئی تھی(اوہ آئی سی) وہ آئیں تھیں (اوہ آئیاں سن) میں گیا تھا(میں گیا سی) ہم گئے تھے (اسیں گئے سی)وغیرہ۔

پنجاب کے ضلع سنگرور میں اردو کے خاص اثر کی بنا پر ماضی بعید کے پنجابی جملوں میں ایک انفرادیت دیکھنے کو ملتی ہے، جیسے میں گیا تھا(میں گیا سی، میں گیا تھی، میں گیا تی) میں دیکھ رہا تھا(میں دیکھ رہا سی، میں دیکھ رہا تھی، میں دیکھ رہاتی)وغیرہ۔

یعنی پڑھا لکھا طبقہ فعل 'سی' کو 'تھا' سے بدلتا ہے جب کہ عام لوگ اس کو 'تھی' اور 'تی' سے بدلتے ہیں اور یہ خالص اردو کا اثر ہے۔

فعل حال کی بات کریں تو؛

وہ کام کرتا ہے(اوہ کم کردا ہے/اے) وہ کام کرتے ہیں (اوہ کم کردے ہن/نے) تم کیا کرتے ہو (تسیں کی کردے ہو) وہ کام کرتی ہے (اوہ کم کردی ہے) وہ کام کرتی ہیں(اوہ کم کردیاں ہن/نے)وغیرہ وغیرہ۔

فعل مستقبل کی مثال لیں تو؛

وہ آئے گا (اوہ آئے گا) وہ آئیں گے (اوہ آون گے) تو آئے گا (تو آئیں گا/آویں گا) تم آؤ گے (تسیں آوں گے) میں آؤں گا (میں آؤں گا/آوانگا) ہم آئیں گے (اسیں آواں گے) وہ آئے گی (اوہ آئے گی/آوے گی) وہ آئیں گی(اوہ آؤنگیاں)وغیرہ وغیرہ۔

فعل امر بنانے کا قاعدہ بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہے؛

دیکھ، سن، کہا، سنا، لے آ، دے، کھا، پی، جا، نکل وغیرہ۔

جب کسی کو عزت و تعظیم سے مخاطب کرنا ہو تو 'واؤ' کا اضافہ کردیا جاتا ہے؛

جا(جاؤ) آ(آؤ) اٹھ(اٹھو) بیٹھ(بیٹھو) کھا(کھاؤ) پی(پیو) سن(سنو) دیکھ(دیکھو) کہہ(کہو) بول(بولو)وغیرہ۔

دعائیہ کا انداز بھی یکساں ہے؛

خوش رہو، سلامت رہو، آباد رہو (بسدے رہو) جیتے رہو (جیوندے رہو) خدا ترقی دے (ربّ ترقیاں دیوے) خدا مہر کرے (رب مہر کرے)وغیرہ۔

لازم و متعدی؛

سیکھنا(سکھنا) سکھانا(سکھاؤنا) اٹھنا(اٹھنا) ٹوٹنا (ٹٹنا) توڑنا(توڑنا) جلنا(جلنا) جلانا(جلاؤنا) پگھلنا (پگھلنا) بیٹھنا (بیٹھنا) چلنا (چلنا) مرنا (مرنا)وغیرہ۔

دونوں زبانوں میں الفاظ نہیں بھی یکساں دکھائی دیتے ہیں۔

نا، ناں، نانا، نہیں، ناہی، ناہیں وغیرہ۔ ایسا نہ کرو (اجیہا نہ کرو/انجھ نہ کرو) اس طرح نہ کرو (ایس تراں نہ کرو) شرارت نہ کرو (شرارت نہ کرو) باہر نہ جاؤ(باہر نہ جاؤ)وغیرہ۔

ان تمام مماثلتوں کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کی اپنی اپنی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے، مثال کے طور پر پنجابی میں 'ب' سے شروع ہونے والے الفاظ 'وُ' سے بدل جاتے ہیں۔ بیچنا(ویچنا) بال(وال) بٹہ (وٹا) بَیری (وَیری) برتنا (ورتنا) بچار (ویچار) بگاڑ (وگاڑ) بار (وار) بکاؤ(وکاؤ) بساکھ(وساکھ) بسنا(وسنا) بیچ(وچ) بس(وس)وغیرہ۔

محاورے کسی بھی زبان کے ترقی یافتہ ہونے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ کسی بھی تہذیب یا زبان کی سچائیاں محاوروں سے بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔ اس تعلق سے دیکھا جائے تو اردو اور پنجابی کے محاورے تقریباً تقریباً ایک سے نظر آتے ہیں، مثلاً؛

آٹے میں نمک ہونا(آٹے وچ لون ہونا)

آنکھیں پھیر لینا(اکھاں پھیر لینا)

آنکھ لگنا(اکھ لگنا)

آگ بگولہ ہونا(اگ بگولا ہونا)

آؤ بھگت کرنا(آؤ بھگت کرنا)

اپنا الو سیدھا کرنا(اپنا الو سیدھا کرنا)

اپنے منھ میاں مٹھو بننا(آپنے منھ میاں مٹھو بننا)

بھانڈا پھوڑنا(بھانڈا پھوڑنا)

اینٹ سے اینٹ بجانا(اٹ نال اٹ کھڑکاؤنا)

پانچوں انگلیاں گھی میں ہونا(پنجوں انگلیاں گھی وچ ہونا)

پاؤں تلے سے زمین نکل جانا(پیراں ہیٹھوں زمین نکل جانا)

جنگل میں منگل ہونا(جنگل وچ منگل ہونا)

چار چاند لگانا(چار چند لاؤنا)

دانت کھٹے کرنا(دند کھٹے کرنا)

انیس بیس کا فرق(انّی ویہہ دا فرق)وغیرہ۔

ان کے علاوہ کچھ نئے محاورے زبان دینی، طوطی بولنا، استادی کرنی، قبر وچ پیر ہونا، عید دا چند ہونا، عید بننی، زبان نوں لگام دینا، سر قلم کرنا، نمک حرام کرنا، چودھویں دا چند وغیرہ بھی پنجابی میں شامل ہو گئے ہیں۔

ان مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے باہمی سنگم سے ایسا بھی ہوا ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کے لفظوں نے پنجابی سے مل کر نئے الفاظ بھی بنائے ہیں حالانکہ ان کے معنی یکساں ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ چیز اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ دونوں زبانوں کی تہذیب و معاشرت ایک ہی ہے، کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔ چٹا سفید، لال سرخ، کالا سیاہ، پیلا زرد، شادی بیاہ، دوست متر، نین نقش، بہت زیادہ، صبح سویرے، دکھ درد، چہرہ مہرہ، سکھ چین، آس امید، آل اولاد وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی خالص اردو، عربی و فارسی کا ہی اثر ہے کہ پنجابی میں بھی اضافت والے الفاظ کا استعمال ہونے لگا ہے، جیسے صاحبِ کمال، وراثتِ خالصہ، کتابِ عشق، اندازِ بیاں، دردِ دل، شامِ غم، بینارِ خالصہ وغیرہ۔

اسی طرح شش و پنج، روز و شب، دین و دنیا، جاہ و جلال وغیرہ الفاظ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

غور طلب ہے کہ دو جملوں کو جوڑنے والا لفظ 'کہ' بھی فارسی کا ہی اثر ہے کیونکہ اس سے پہلے اس لفظ کا استعمال پنجابی میں نہیں ملتا۔

اس کے علاوہ پنجابی نے عربی، فارسی اور اردو سابقوں اور لاحقوں کو بھی اپنا لیا ہے، جیسے؛

دان: لون دان، کوڑے دان، پیک دان، اگال دان کو گال دان

دانی: چوہے دانی، مچھر دانی، صابن دانی، سرمے دانی، نمک دانی

دار: زمین دار، رنگ دار، دمدار، جمعدار، لمبڑدار، تحصیل دار

بے: بے کار، بے عزت، بے غیرت، بے جوڑ، بے مثال، بے قصور

خانہ: ہاتھی خانہ، کبوتر خانہ، ڈاک خانہ، دواخانہ، دیوان خانہ

ان زبانوں کا پنجابی زبان پر سب سے بڑا اثر نئی آوازوں کی پنجابی میں شمولیت کرنا ہے۔ جب یہ نئی آوازیں پنجابی میں شامل ہوئیں تو پنجابی حروف میں بندی یا نقطہ لگانے کا رواج ہوا یعنی اس اثر سے نہ صرف آوازوں میں تبدیلی آئی بلکہ حروف کی ساخت تک بدل گئی ہے۔ یہ حروف ہیں خ، ذ، ز، ض، ظ، ش، غ، ف بلکہ بھائی کاہن سنگھ نابھہ نے تو 'ق' کی آواز کو بھی اپنا لیا ہے۔

زبان کا ایک بڑا اثر تب دیکھنے کو ملتا ہے جب لوگ

کسی زبان کے الفاظ کو اپنے شخصی ناموں کے لیے منتخب کرنا شروع کر دیتے ہیں، جیسے: تیغ بہادر، زوراور سنگھ، صاحب سنگھ، مہربان سنگھ، حکم سنگھ، حاکم سنگھ، دیوان سنگھ، دربارا سنگھ، شمشیر سنگھ، گلزار سنگھ، محکم سنگھ، ملکیت سنگھ، ملکیت سنگھ، سردار سنگھ، دلدار سنگھ، حضور سنگھ، تخت سنگھ، ذیل سنگھ، فوجہ سنگھ، کرم سنگھ، آفتاب سنگھ، ماہتاب سنگھ، نشان سنگھ، ہزارا سنگھ، امراؤ سنگھ، شیر سنگھ، کنور گریوال، سلطان سنگھ، وزیر سنگھ، خوشی، تبسم، مہناز، شہناز، گرنواز وغیرہ ناموں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

جیسے ماقبل ذکر کیا گیا کہ عربی، فارسی، ترکی اور دوسری زبانیں بولنے والے بیرونی فاتحین،فوجی اور درویش جب پنجاب میں آنا شروع ہوئے اور یہاں کے باشندوں سے گفت وشنید ہوئی تو ایک نئی زبان وجود پذیر ہوئی جو ''اُردو کہلائی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پنجابی کو اردو کی ماں کا درجہ دیا جا سکتا ہے یا کم از کم 'ماں سی' یعنی موسی تو ضرور کہا جا سکتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ پنجابی بولنے والے لوگ اردو کو آسانی سے سمجھ اور بول لیتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے اردو بولنے والے لوگ پنجابی کو قدرِ مشکل سے سمجھتے اور بولتے ہیں۔اس کی ایک اہم وجہ پنجابی زبان کا ٹونل لینگوئج ہونا بھی ہے۔اس لیے اردو داں حضرات کے لیے ڈھڈ، بھانڈے، ڈھلق وغیرہ الفاظ کی قرأت کرنا دشوار ہو جاتی ہے۔

پنجابی کی ایک بڑی مشہور کہاوت ہے ''گُرو گُڑ ہی رہا تے چیلا چینی ہوگیا''۔اردو بے شک عمر میں پنجابی سے چھوٹی ہے لیکن زیادہ ترقی یافتہ مانی جاتی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ اردو کو نوابوں اور درباروں کی سرپرستی حاصل رہی اور وہ ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔اس طرح نہ صرف یہ کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی بلکہ یہیں پروان بھی چڑھی۔ہاں یہ بات سچ ہے کہ اردو اور پنجابی کی ترقی میں عربی، فارسی اور ترکی زبانیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔اس لیے جو پنجابی داں حضرات عربی و فارسی زبانوں سے واقفیت نہیں رکھتے تو ان کے یہاں مختلف قسم کی غلطیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، جیسے صاحبزادہ (ساہبجادا) حاضر (ہاجر) حضور (ہجور) نواز (نواج) نماز (نواج) راز (راج) مشقت (مسکت) یاد (جاد) وغیرہ، اور شاید لفظ 'جاں' بھی 'یا' کا بدلا ہوا روپ ہے۔

آج ہمارے بہت سے پنجابی نہ تو پنجابی کی نئی آوازوں سے واقف ہیں اور نہ ہی نئے الفاظ سے روشناس ہیں۔اس لیے کئی دفعہ جمع کے طور پر استعمال ہونے والے لفظوں کی بھی جمع بنادی جاتی ہے، مثلاً

اصل لفظ ہے جذبہ۔۔جذبات۔۔جذباتاں

حال۔۔حالات۔۔حالاتاں/حلاتاں

خیال۔۔خیالات۔۔خیالاتاں

کمال۔۔کمالات۔۔کمالاتاں

کرامت۔۔کرامات۔۔کراماتاں

خیر۔۔خیرات۔۔خیراتاں

جن کو کسی بھی طور پر ٹھیک نہیں مانا جا سکتا لیکن یہ بھی درست ہے کہ اردو فارسی کی معلومات رکھنے والا ان کی غلط ادائیگی نہیں کرے گا۔

ادب کی بات کریں تو عربی فارسی الفاظ کا ثبوت تو ہمیں بارھویں صدی کے حضرت شیخ فرید شکر گنج کے کلام میں ہی ملنا شروع ہو جاتا ہے۔

اٹھ فریدا وضو ساز، صبح نماز گزار
جو سر سائیں نہ نیویں سو سر کپ اتار

شری گرو گرنتھ صاحب نہ صرف یہ کہ سکھ مذہب کا عظیم صحیفہ ہے بلکہ زبان وادب کی رو سے بھی اہم ترین گرنتھ ہے اور ہندوستان کے مشترکہ کلچر، معاشرت، اخوت اور بھائی چارے کی زندہ مثال بھی ہے۔اس گرنتھ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بے شمار الفاظ اردو، عربی وفارسی کے شامل ہیں۔کئی سطور میں تو پچاس سے اسّی فی صد الفاظ ان ہی زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

نانک دنیا کیسی ہوئی
سالک مت نہ رہیو کوئی
بھئی بندھی ہیت چکایا
دنیا کارن دین گنوایا

ایک اور جگہ فرمان ہے۔

پیر پیغمبر سالک صادق
شہدے اور شہید
شیخ ،مشائخ ،قاضی ملّا
در درویش رشید
برکت تن کو اگلی پڑھدے رہن درود

حق پرایا نانکا اس سور اس گائے
گُر پیر حامہ تاں بھرے جاں مردار نہ کھائے

شری گرو گرنتھ صاحب کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پنجابی میں اردو فارسی اور عربی الفاظ کی شمولیت بہت زیادہ ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر امرونت سنگھ، سابقہ پروفیسر، شعبۂ اردو فارسی، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کی 750 صفحات پر مشتمل تصنیف 'عربی فارسی وچوں اتپن پنجابی شبداولی' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

1971 میں ڈاکٹر جمیل جالبی کو کراچی کی ایک لائبریری سے 35-1421 کے درمیان لکھا ہوا ایک مسوّدہ ملا۔ تقریباً دس سال کی محنت کے بعد انھوں نے اس مسوّدے کو ڈی کوڈ کیا تو پتہ چلا کہ یہ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے فخرالدین نظامی کی لکھی ہوئی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے جس کا پتا اس شعر سے لگا کہ

سن وے فخرالدین بہ سُر آکھیا محمد نبی خاتم الانبیا
نظامی کہن ہار جس پار ہوئے سنن ہار سن نغز گفتار ہوئے

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے عمیق مطالعے کے بعد اس کو اردو کی پہلی مثنوی قرار دیا لیکن جب ہم اس مثنوی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک کثیر تعداد پنجابی الفاظ کی دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر

آتھن، آکھے، اتاول، اگیتی، انگ، پٹ، پینترا، ترک، جدّاں، جیونا، ستونت، کگڑ، نیڑے، وارتا، ونّش، ترآدھار، ترجیو، کلنک، کنڈل، سرجیا، ڈپٹا، تھاں، تتا، پرمان، پرکھ، اسوجھا، جگ، دوملکھا وغیرہ۔اور جملوں کی ساخت کچھ یوں ہے:

اکاس اونچا پاتال دھرتی تونہی
جہاں کچھ نہ کوئی، تہاں ہے تونہی
پدم راؤ اٹھیا کہ سیوا دھروں
کرے کن جے رائے بنتی کروں

کیا ان لفظوں اور جملوں کی بنیاد پر ہم اس تصنیف کو پنجابی کی تخلیق نہیں مان سکتے ہیں؟ لیکن اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اردوئے قدیم پنجابی ہی سے ماخوذ ہے اور پنجابی کی طرح ہی دکھائی دیتی ہے۔دونوں زبانوں میں ایک ربطِ خاص ہے جس کو علاحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔اس لیے ان زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے لیے دونوں زبانوں سے گہری واقفیت ہونی ضروری ہے۔

حوالے:

1- نظر شیر علی خاں سرخوش، تذکرہ اعجاز سخن، صفحہ نمبر 'ز'
2- ایضاً، صفحہ نمبر 'خ'
3- دا کامن اسکیچر آف اردو اینڈ پنجابی، صفحہ نمبر
4- دتاتریہ کیفی، کیفیہ، صفحہ نمبر 59
5- پروفیسر محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، صفحہ نمبر 114
6- ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) صفحہ نمبر 593

■

Dr. Nadeem Ahmed
Lecturer (Urdu)
Northern Regional Language Centre
Punjabi University Campus
Patiala - 147002 (Punjab)
Cell.:09888856914, 7009456145

اردو ناولوں میں نسوانی کرداروں کا مطالعہ

طاہرالدین

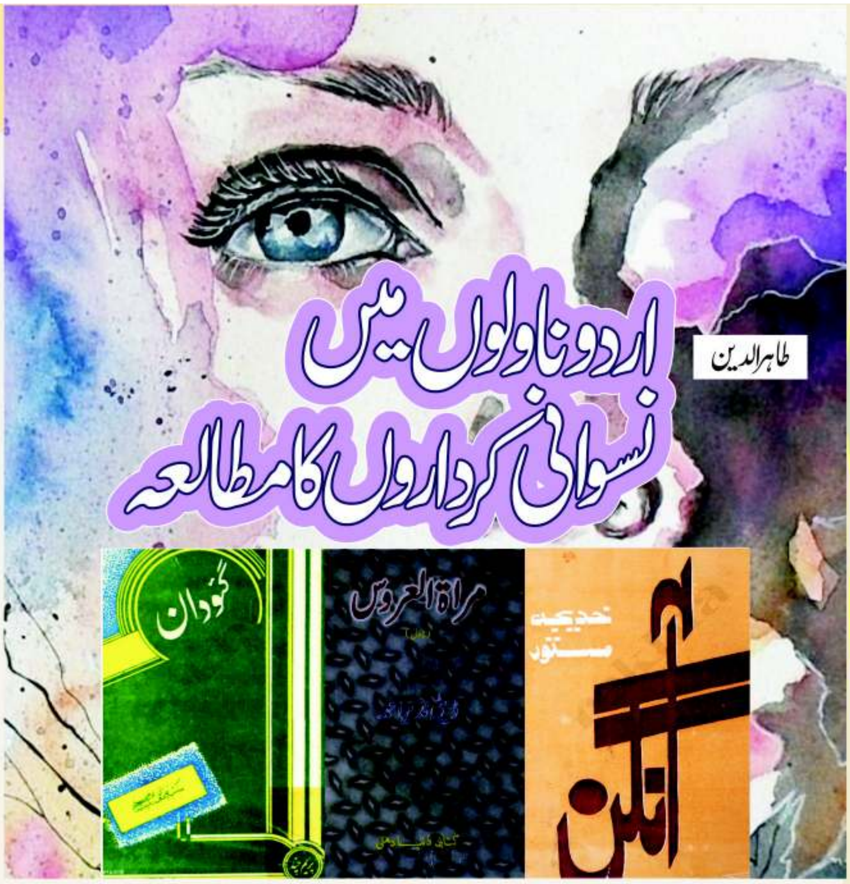

ناول (Novel) ایک انگریزی لفظ ہے، جس کے معنی نیا کے آتے ہیں۔ لفظ ناول (Novel) کے لاطینی مآخذ "Novella" کا مفہوم بھی نیا ہوتا ہے۔ یہ داستان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور مغربی ادب کی دین ہے۔ اس کا اطلاق ایک ایسی نثری کہانی پر ہوتا ہے، جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ایک فنی اور کامیاب ناول میں مربوط و منظّم پلاٹ، حقیقی اور متحرک زندگی سے بھرپور کردار، واضح نقطۂ نظر، موضوع سے ہم آہنگ اور پُراثر ماحول، دلکش اور فطری مکالمے اور مقصد و فن کا حسین امتزاج و توازن ہوتا ہے۔ اس کا آغاز پرکشش ہوتا ہے۔ اور تذبذب، الجھن، ارتقاء، منتہا اور منطقی انجام سے بھرپور ہوتا ہے۔ ایک اچھے ناول میں خارجی پہلوؤں اور داخلی کیفیتوں کی موزوں آمیزش اور احساس و مشاہدہ کی نزاکت ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ بلکہ اس کی تنقید و تفسیر فنی حسن کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد سب سے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے 1869 میں مرأۃ العروس لکھ کر ناول نگاری کی داغ بیل ڈالی، جب ہم نذیر احمد کے ناولوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے یہاں اس دور کے مسائل محض خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی ہیں جو زندگی سے متعلق اور معاشرے کے مسائل ہیں قدرتی طور پر ان قصوں کے کردار اصلی اور حقیقی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کہ نذیر احمد کے ناولوں کے ساتھ ساتھ دوسرے ادیبوں نے اس صنف کے ذریعے عورتوں کے مسائل کی طرف رُخ نہیں کیا۔ راشد الخیری نے بھی عورتوں کے مسائل اور ان کے حل کی سمت میں قلم اٹھایا ہے۔

یہ خود ایک متوسط طبقے کے چشم و چراغ تھے، جس طبقے کی زندگی اور طرزِ معاشرت کے تمام تر پہلوؤں سے نہ صرف ان کی گہری واقفیت تھی، بلکہ اس کی خوبیوں اور خامیوں کا انھیں خوب خوب علم تھا۔ صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی اور طوفان حیات کے باریک بین تجزیے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان ناولوں کے زنانہ کرداروں کے ذریعہ راشد الخیری نے خواتین میں صحیح علم کے حصول کی ضرورت پر کافی زور دیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک جہالت کی سب سے بڑی وجہ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی ہے۔ 'طوفان حیات' اور 'حیات صالحہ' کے ذریعے انھوں نے خواتین کے کرداروں کو کچھ اس طرح مرتب کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے اس خیال کی وکالت ہوجائے کہ نیکی، شرم و حیا، پاکیزگی کی خصوصیتیں عورتوں کے واسطے زیور ہیں۔ اور عزم و جفاکشی، ضبط و تحمل اور خدمت و ایثار اس کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ گویا راشد الخیری نے اپنے ناولوں کے ذریعے زندگی کے اصلاحی اور اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ عورتوں کی اصلاح اور ان کی معاشرتی حیثیت کو بلند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مرزا ہادی رسوا کا ناول 'امراؤ جان ادا' 1899 میں بھی اسی موضوع سے متعلق ہے۔ ہر خاص و عام نے اس پر ہزاروں صفحات رنگ دیے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کا خیال ہے:

''شاہدِ رعنا کے جواب میں مرزا ہادی رسوا نے 'امراؤ جان ادا' لکھی اور سیّد عابد علی عابد نے لکھا ہے:

'امراؤ جانِ ادا' اودھ کی مٹتی ہوئی دل آویز زوال پذیر، زہرناک و شیریں معاشرت کی علامت ہے''

(اصول انتقاد ادبیات ص 586)

یہاں عابد علی عابد کا خیال خود رسوا کا خیال ہے۔ رسوا نے اپنے ناول 'ذات شریف' میں لکھا ہے:

''ہمارے اکثر ناولوں کا موقعۂ واردات ہمارا وطنِ خاص لکھنؤ ہے'' (ذات شریف، ص 4)

اس کے لیے 'امراؤ جان ادا' اور 'ذات شریف' کے دیباچے کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

'امراؤ جان ادا' کی اشاعت سے اردو ناول کا عہد جدید شروع ہوجاتا ہے۔ اسی صنف سے مرزا ہادی رسوا کو بقائے دوام حاصل ہوا۔ اس ناول میں اصلاح اور تبلیغ کے بھرپور مواقع ہیں۔ انھوں نے موضوع، تکنیک اور فکر و فن کے برتاؤ میں اس توازن کا استعمال کیا جس کی وجہ سے شاہکار تیار ہوتے ہیں۔ کہنے کو یہ کہانی ایک طوائف کی زندگی سے متعلق ہے، اسی طرح قصے کا ماحول بھی اودھ سے تعلق رکھتا ہے لیکن ناول نگار کا نظریۂ کائنات وسیع اور بالیدہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں شروع ہوئی تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ان میں اور بھی تیزی آئی اور مختلف ادارے قائم کیے گئے۔ ان اداروں کے ذریعے عورتوں کو سماج میں ان کا جائز مقام دلانے کی بھرپور کوشش ہوئی۔

اس کے فوراً بعد پریم چند نے ناول نگاری شروع کی۔ پریم چند کو ملک ہندوستان کی قومی تحریک کا وہ پس منظر ملا جس کے سہارے انھوں نے اپنے ناولوں کو اپنے عہد کا نبض پیما بنایا۔ پریم چند کے یہاں اردو ناول نہ صرف اپنی موضوعاتی اور فنی تکمیل کی حدوں تک پہنچتا ہے۔ بلکہ اب اردو ناول دوسری زبانوں کے شہکاروں کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔

نرملا، چوگانِ ہستی، میدانِ عمل، بازار حسن اور گئودان جیسے ناولوں سے پریم چند نے اردو قصہ گوئی کو وہ بلندی عطا کی جس کے مقابل پوری بیسویں صدی میں کوئی دوسرا لکھنے والا سامنے نہیں آسکا۔ ان کے یہاں کوئی تصنع اور بناوٹ نہیں۔ تعلیم یافتہ سے لے کر عام لوگوں کے بیچ کام آنے والی زبان کا استعمال ہے۔ مظلوموں، پسماندہ افراد، جدوجہد میں شامل لوگ، استحصال کا شکار بے بس کسان اور مزدور، عورتیں بلکہ یہ کہا جائے کہ پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کے مختلف

مسائل مثلاً کم عمری کی شادی، بے جوڑ شادی، بیواؤں کی شادی اور طوائفوں کی زندگی کی طرف توجہ دلائی اور اس طرح انھوں نے ہندوستانی عورتوں کو سماجی پستی سے نکالنے میں مثبت رول ادا کیا۔ مختصر یہ کہ پریم چند نے خواتین کے مسائل پر کچھ زیادہ ہی دھیان دیا ہے۔ ان کے بعد کے ناول نگاروں میں ایک روشن نام کرشن چندر کا بھی ہے۔ شکست، طوفان کلیاں، ایک عورت ہزار دیوانے، سڑک واپس جاتی ہے، برق کے پھول، آسمان روشن ہے ان کے مشہور ناول ہیں، لیکن ان کے تمام ناولوں پر رومانی غلبہ ہے......شکست کرشن چندر کا سب سے اہم ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس میں فنی اور ترقی پسندانہ فکر دونوں کا توازن ملتا ہے۔ اپنے ناول 'شکست' میں انھوں نے اپنے مخصوص رنگارنگ اسالیب میں ہندوستانی عورتوں کی مظلومیت کا منظر پیش کیا ہے۔

خدیجہ ستور کا ناول 'آنگن' میں معاشرتی بحران کے ساتھ ساتھ سیاسی ہیجانات بھی دکھائی دیتے ہیں جو تاریخی تناظر میں اپنی مخصوص معنویت اور عصری تناظر میں گوناگوں افادیت کے حامل ہیں۔

خدیجہ مستور نے 'آنگن' میں چھمی اور عالیہ کے کرداروں پر بڑی محنت کی ہے۔ عالیہ جو اس کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار نہیں بلکہ بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کی وہ زندہ حقیقتیں ہیں جنھیں خدیجہ مستور نے انسانی روپ دے دی۔

(فنون لاہور: خدیجہ مستور نمبر ص 114)

چھمی اور عالیہ دونوں زندہ ماضی ہیں۔ دونوں کی شخصیت ماضی کو مسخ ہونے سے بچانے کی ایک تخلیقی جدوجہد ہے۔

(انصاری: کتاب شناسی، ص 76۔2۔ علی گڑھ میگزین، ہم عصر اردو ادب نمبر، ص 216)

جمیلہ ہاشمی کا ناول 'تلاشِ بہاراں' (1961) ایک اہم ناول ہے۔ جس میں ہندوستانی کلچر اور حب الوطنی کی روح زندہ و توانا دکھائی دیتی ہے۔ اس کا مرکزی کردار کنول کماری ٹھاکر ہندوستانی عورت ہی نہیں، ہندوستانی کلچر کی روح رواں ہے۔ جبکہ وہ کئی سال مغربی ممالک میں گذار چکی ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ گویا جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول خواتین کے اصلاحی مقصد کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور وہ ہر عورت میں کنول کماری ٹھاکر کی سیرت کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

بہر حال اردو ناولوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جسم فروشی، اوباشی، مردانہ اقتدار پر مبنی سماج کی وہ لعنت ہے جو ہر دور اور ہر دیار میں یکساں طور پر موجود رہی۔ طوائف کو نذیر احمد، مرزا رسوا، قاری سرفراز حسین، پریم چند، قاضی عبدالغفار اور منٹو وغیرہ نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا تو طوائف کو ایک انسانی المیے کی شکل میں پیش کیا۔ تقسیم ملک کے بعد بلکہ 1960 کے بعد عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جلیم مسرور اور بانو قدسیہ نے اسے قابل توجہ سمجھا تو اس کی زندگی کے باطنی حقائق اور تلخیوں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔

عصمت چغتائی کا ناول 'معصومہ' (1961) ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جس کی عورتوں کو دست بردِ زمانہ نے جسم فروشی پر مجبور کیا۔ اس کا مرکزی کردار 'معصومہ' ہی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے مردانہ کرداروں کا جو حال ہے، ان کے نسوانی کرداروں کا بھی وہی حال ہے۔ کوئی قابل ذکر نسوانی خوبی ایسی نہیں جو 'آگ کا دریا' کی طلعت میں نہ ہو۔ خیالات، ذہانت، حب الوطنی اور قوم پرستی کے اعتبار سے وہ تقریباً اپنے بھائی کمال رضا کے بالکل ہم پلہ نظر آتی ہے۔ اسے موسیقی میں بھی کافی دخل حاصل تھا۔ یورپ کے قیام کے دوران جب وہ اپنے رفقا کے ساتھ مشرقی برلن جاتی ہے تو وہاں کی ایک مشہور سنگ تراش فراؤلین کے یہاں ٹھہرتی ہے اسے آرٹ میں اس قدر دخل حاصل تھا کہ وہ وہاں اس کی اسسٹنٹ بن جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی شناخت یوں تو تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ لیکن ان کا ناول 'گردشِ رنگ چمن' (1987) کا قصہ مسز عندلیب اور ان کی بیٹی ڈاکٹر عنبریں بیگ کے طوائف النسل ہونے کی بناء پر مناسب سماجی مقام نہ ملنے کے مسئلے پر مبنی ہے۔ انھوں نے صرف طوائف ہی کو نہیں بلکہ اس کے یعنی عورت کے مختلف النوع روپ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ بقول ابوالکلام قاسمی:

''قرۃ العین حیدر کے بعض ناولوں میں ازمنۂ قدیم سے لے کر جدید عہد تک عورت کے مختلف روپ کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش تحریک نسواں کا وہ خام مواد ہے جس کے شعور کے بغیر یہ تحریک جنسی تفریق اور استحصال کا تاریخی سیاق و سباق حاصل نہیں کر سکتی، 'آگ کا دریا' میں چمپا اس ہندوستانی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جو اگر قدیم زمانے میں ایودھیا کے راج گرو کی بیٹی چمپک کی شکل میں تاریخی حادثات کا شکار ہو کر اپنی ذہانت اور شدت احساس کے باوجود اور اپنی مرضی کے خلاف ایک بوڑھے برہمن کی بیوی بننے پر مجبور ہوتی ہے۔ یہی چمپا 'آگ کا دریا' میں کبھی جنس بازار بن کر لکھنؤ کے بالا خانے میں اپنی پہچان کی متلاشی نظر آتی ہے اور کبھی جدید زمانے کی چمپا احمد کے روپ میں کامیابی کے سارے ظاہری وسائل سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اپنے آدرش عامر رضا سے اپنے دل کا حال تک نہیں بتا پاتی اور نتیجے کے طور پر دائمی تنہائی کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ عورتوں کی بے کسی، تنہائی، مردوں کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط کی غلامی اور لامتناہی انتظار کی کیفیت قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناولوں اور افسانوں میں بھی ملتی ہے۔ 'آخر شب کے ہم سفر' کی دیپالی سرکار تحریک نسواں کی ایک ایسی نمائندہ بن کر اُبھرتی ہے جو مردوں کی مصالحت پسندانہ پسپائی کے لیے ایک تازیانۂ عبرت بھی ہے اور اپنے اصول و آدرش کے لیے آخر تک مخالف قوتوں سے نبرد آزمائی کی علامت بھی۔''

(بحوالہ قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ: ارتضیٰ کریم ص 70-69)

طوائف کی زندگی کے باطنی حقائق کو پیش کرنے والوں میں جیلانی بانو کا ناول 'ایوان غزل' (1976) عفت موہانی کا ناول 'ایک چراغ دور کا' (1977) ارشاد امروہی کا ناول 'ستے صنم' (1977) اور نسیم انہونوی کا ناول 'نگرو' (1977) اہم ہیں۔

شین مظفر پوری کے ناولوں کو دیکھتے ہیں تو اُن کے یہاں ماحول اور موضوع کی یکسانی کے باوجود بڑا تنوع ہے۔ 'ہزار راتیں' کی مُنّی اور 'چاند کا داغ' کی سلطانہ کا تقابل کیجیے۔ اس حد تک دونوں مشابہ ہیں کہ انھوں نے سازگار حالات کے تحت طوائف اور ایکٹرس کی صورت میں جسم فروشی کی۔ لیکن باقی دوسرے احوال یکسر مختلف بلکہ متضاد ہیں۔

مذکورہ ناول نگاروں کے علاوہ اور بھی ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں زنانہ کرداروں کے وسیلے سے نسوانی مسائل کی جانب اشارہ کیا ہے۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی، علی عباس حسینی، ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور اور آمنہ ابوالحسن وغیرہ۔ مذکورہ تمام ناول نگاروں کے نسوانی کرداروں کی وہی خوبیاں اور خرابیاں ہیں جو قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے نسوانی کرداروں کا ہے۔

تقابلی جائزے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہر ناول نگار نے اپنے اپنے ناولوں میں زنانہ کرداروں کی کردار سازی میں نہایت چستی اور چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے اور ہر کوئی اپنے اپنے فن میں کامیاب ہے۔

مختصر یہ کہ مجموعی حیثیت سے مذکورہ تمام ناول نگاروں کو ناول نگاری کے فن میں مکمل دسترس اور کمال حاصل ہے۔ سبھوں نے اس فن کی خصوصیت کو بروئے کار لانے میں حد درجہ جدوجہد سے کام لیا ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

■

Taheruddin
Village: Makri Tola, Ward No: 13
Post: Karnol Thana, Saheb Ganj
Distt: Muzaffarpur - 843125 (Bihar)

ڈپٹی نذیر احمد اور تعلیمِ نسواں

محمد عامر

ڈپٹی نذیر احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ بیک وقت مترجم، ناول نگار، خطیب، مصلح قوم، تعلیم اور تربیتِ اولاد کے شیدائی تھے۔ ان کا پسندیدہ موضوع تعلیم، تربیتِ اولاد اور اصلاح معاشرہ تھا جیسا کہ ان کی بیشتر تصانیف کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے۔ وہ ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ابتدائی تعلیم والد محترم اور اپنے زمانے کے نامور استاد ڈپٹی نصر اللہ سے حاصل کرنے کے بعد دہلی آئے، جہاں انھیں حصول علم کے مختلف مواقع ملے۔ نذیر احمد بچپن ہی سے تعلیم کے تئیں سنجیدہ اور فکر مند تھے۔ دہلی کالج میں نذیر احمد کا داخلہ ان کی قابلیت، محنت و لگن کا بین ثبوت تھا۔ انھوں نے اپنا تعلیمی سفر غربت اور مفلسی کے سائے تلے شروع کیا۔ دلی کالج میں داخلہ ان کی زندگی کا وہ اہم موڑ تھا جہاں ان کی قابلیت کو چار چاند لگا، کیونکہ مناسب وقت پر صحیح رہنمائی ان کو میسر تھی۔ تکمیل تعلیم کے بعد تلاش معاش کے سلسلے میں انگریزی سرکار میں بغرض ملازمت مختلف شعبوں میں بھی رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں نے آزادی کا بگل بجایا تھا مگر اس میں انھیں ناکامی ہاتھ لگی۔ نذیر احمد دوراندیش، دوربیں اور مستقبل شناس تھے یہی وجہ ہے کہ اس ناکامی کا تجزیہ انھوں نے بہت جلد کرلیا تھا۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوچکا تھا کہ جدید علوم وفنون کے بغیر معاشرے کو کوئی بھی طاقت پستی سے نہیں نکال سکتی۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے تعلیم اور اصلاح معاشرہ پر زیادہ زور دیا۔ یہی وہ دور تھا جب ہندوستانی مسلمان ناامیدی کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے جن کو باہر لانے کے لیے سرسید جیسے رہنما اصلاحی تحریک لے کر ان کے بیچ آئے۔

سرسید نے پہلے پہل مسلمانوں کے اندر تعلیمی بیداری اور اصلاحی پہلوؤں پر زور دیا۔ ہندوستان میں 1857 کے انقلاب سے قبل اپنی قوم کے تئیں اصلاح معاشرہ کی تحریک راجہ رام موہن رائے شروع کر چکے تھے۔ سرسید اس اصلاحی تحریک سے کہیں نہ کہیں متاثر تھے۔ انھوں نے بھی قوم کی اصلاح کی غرض سے تعلیمی بیداری اور معاشرتی اصلاح پر خصوصی توجہ صرف کی۔ سرسید مسلمانوں کے لیے روایتی تعلیم کو ناکافی اور بے کار تصور کرتے تھے اسی لیے انھوں نے اپنی قوم کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (محمڈن اورینٹل کالج) اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ سرسید کی یہ اصلاحی تحریک جس میں تعلیمی بیداری کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل تھی صرف مردوں کے لیے نہیں تھی بلکہ ان کے نزدیک تعلیم کا جو تصور تھا وہ عمومی نوعیت کا تھا لیکن واضح طور پر تعلیم نسواں کی بابت سرسید کا موقف پوری طرح ظاہر نہیں ہوتا، جہاں ایک طرف وہ اپنے زمانے کی تعلیم یافتہ عورتوں کو دیکھ کر عش عش کرتے تھے وہیں دوسری طرف ان کا خیال تھا کہ اگر ہمارے قوم کے مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو عورتیں خود بخود تربیت یافتہ ہوجائیں گی کیوں کہ ہمارے سماج میں عورتیں مرد کے تابع ہیں۔ تعلیم نسواں کے تعلق سے سرسید کا نظریہ کچھ یوں ہے:

''مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہوجائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ ہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم وتربیت یافتہ ہوجائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اس کا ضرور بالضرور ایک زبردست 'گوخفیہ' اثر پہنچے گا۔''

(لاہوری: ضیاء الدین (مرتب)، افکار سرسید، کراچی، فضلی سنز لمیٹڈ 1998، ص 212)

1857 کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ وہ ہر موڑ اور ہر سطح پر ظلم وستم کا شکار تھے، تعلیمی لحاظ سے مسلمان وقت اور حالات کے تئیں کافی پیچھے تھے اور ان کے اندر جو تعلیم تھی وہ بھی محض روایتی تھی جو کہ حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکافی تھی، اسی لیے سرسید نے جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنی قوم کو فکر مند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سوتے جاگتے انھوں نے اپنی قوم کو اس پست حالت سے نکالنے کی ہر ممکن تعبیریں کیں لیکن جب مسلمان عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ آیا تو انھوں نے اپنی سماجی حالت کا موازنہ کرتے ہوئے یوروپی عورتوں کی مثال دی جہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ سرسید نے اس کا جواز کچھ اس طرح پیش کیا کہ وہاں کے مرد پہلے تعلیم یافتہ ہوئے پھر انھوں نے اپنی عورتوں کو اس کی ترغیب دی چوں کہ سرسید نے دوران سفر یوروپ کی تہذیبی وسماجی زندگی کا مشاہدہ قریب سے کیا تھا۔ وہاں کی تعلیمی صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس وقت ہم تمام یوروپ کے تعلیم یافتہ ملک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہوجاتے ہیں عورتیں بھی لائق ہوجاتی ہیں، جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہوسکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے، اسی کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 211)

درج بالا اقتباس سے صاف طور پر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ سرسید نے عورتوں کی تعلیم کے مسئلے کو مرد کی تعلیم کے تابع رکھا۔ انھوں نے عورتوں کی جدید تعلیم کے لیے باضابطہ طور پر کوشش نہیں کی۔ اس مضمون میں سرسید کے نظریۂ تعلیم نسواں پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ اس بات کی

طرف توجہ مرکوز کرانا ہے کہ اس عہد میں تعلیم نسواں کے موضوع پر بھی بحث کی جارہی تھی۔ سرسید جیسے رہنما تعلیم نسواں کے لیے روایتی تعلیم کے قائل تھے چوں کہ ان کے زمانے میں مردوں کے اندر ہی تعلیمی فقدان تھا ایسی صورت میں اگر وہ عورتوں کے لیے جدید تعلیم کی حمایت کرتے تو نہ جانے ان کی تحریک کا رخ کس جانب ہوتا۔ ابھی تو مردکی تعلیم پر بات کرنے سے مختلف قسم کی رنجشوں کا سامنا کرنا پڑرہا تھا اگر وہ تعلیم نسواں کی بات کرتے تو شاید ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کسی حد تک سرسید کا یہ نظریہ درست تھا کہ اگر معاشرے میں مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں دیر نہیں لگے گی۔ انھوں نے تعلیم نسواں کی مخالفت تو نہیں کی مگر سوچنے کا انداز اوروں کے مقابلے مختلف تھا چوں کہ سرسید کی تعلیمی بیداری اجتماعی حیثیت کی حامل تھی اس لیے ان کو ہر پہلو پر نظر رکھنا ضروری تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار سرسید کے فعال رفقا میں ہوتا ہے۔ تعلیم کے نشیب وفراز سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ایک مدت تک شعبۂ تعلیم میں ملازمت بھی کرچکے تھے۔ زمانے کے بدلتے حالات سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ اس عہد میں نذیر احمد وہ واحد شخص تھے جنھوں نے تعلیم نسواں اوران کے مسائل کو لے کر غور وفکر کیا۔ سرسید احمد خاں کی طرح تعلیم نسواں کے تئیں غیر واضح طور پر نہیں بلکہ واضح طور پر اپنی آرا کا اظہار کیا اوراسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی۔ تعلیم نسواں کی کمی کا انھیں شدت سے احساس تھا کیوں کہ جب ان کی اولاد حصول تعلیم کے قابل ہوئی تو اس زمانے میں ان کی نظر مروجہ نصابی کتب پر گئی۔ انھیں کوئی ایسی معیاری کتاب نہیں ملی جسے وہ اپنی لڑکیوں کو پڑھانے میں معاون پاتے۔ انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے 'مرأۃ العروس' کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''خاندان کے دستور کے مطابق میری لڑکیوں نے بھی قرآن شریف اور اس کے معنی، قیامت نامہ، راہ نجات وغیرہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے اردو کے رسالے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پڑھے۔ گھر میں رات دن پڑھنے لکھنے کا چرچا تو رہتا ہی تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک خاص رغبت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کی حالت کے مناسب نہیں۔ اور جو مضامین ان کے پیش نظر رہتے ہیں ان سے ان کے دلوں کو افسردگی ان کی طبیعتوں کو انقباض اور ان کے ذہنوں کو کُندی ہوتی ہے۔ تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق ونصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کو زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کجرائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج ومصیبت میں رہا کرتی ہیں۔ اُن کے خیالات کی اصلاح اور ان کے عادات کی تہذیب کرے اور کسی دلچسپ پیرایہ میں ہو جس سے اُن کا دل نہ اکتائے طبیعت نہ گھبرائے مگر تمام کتب خانہ چھان مارا۔ ایسی کتابوں کا پتہ پر نہ ملا تب میں نے اس قصے کا منصوبہ باندھا۔''

(ڈپٹی نذیر احمد: مرأۃ العروس، لکھنؤ، تیج کمار، 1978، ص 2-1)

درج بالا اقتباس طویل تو ضرور ہے مگر اس کے بغیر پوری بات واضح نہیں ہو پاتی۔ دراصل یہ وہی محرکات تھے جس نے نذیر احمد کو تعلیم نسواں کے تئیں سنجیدہ ہونے پر مجبور کیا۔ تعلیم نسواں کے تعلق سے 1857 کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد یہ پہلی شعوری اور انفرادی کوشش بھی تھی۔ نذیر احمد نے حصول تعلیم کے لیے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا نیز وہ اعلیٰ درجے کی علمی بصیرت اور ذوق سلیم رکھتے تھے۔ انھیں جب تعلیم نسواں کے لیے کتابوں کی ضرورت پڑی تو سارے کتب خانے چھان مارے لیکن نتیجہ بے سود رہا۔ کیوں کہ زمانے کے تقاضے کے مطابق انھیں کوئی ایسی کتاب ملی ہی نہیں جو ان کے نقطۂ نظر کی پاس دار ہو۔ دراصل وہ روایتی نصاب تعلیم سے مطمئن نہیں تھے، جیسا کہ درج بالا اقتباس میں اس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ یہ اقتباس اس عہد میں تعلیم نسواں کی خستہ حالی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ انقلاب کے فوراً بعد کا زمانہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر زوال پذیر تھا۔ ایسے حالات میں قوم کو سیاسی اور معاشرتی زوال سے باہر نکالنے کے لیے اس وقت کے ادیب ومفکر اس بات پر متفق تھے کہ قوم کی تعلیمی بیداری اور معاشرتی بگاڑ کے اصلاح پر دھیان دیا جائے۔ بعض مفکرین نے حصول تعلیم کی کھل کر حمایت کی اور کچھ لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی۔ تعلیم نسواں کے تئیں سنجیدہ ہونے کے پس پشت نذیر احمد کی منشا یہ تھی کہ اگر عورتیں تعلیم یافتہ اور باشعور ہوجائیں گی تو وہ امور خانہ داری کی ذمے داری کے علاوہ اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح اور بہتر رہنمائی بھی کرسکیں گی۔ تعلیم نسواں کے لیے نذیر احمد صرف فکر مند ہی نہیں تھے بلکہ اس کے لیے انھوں نے عملی قدم بھی اٹھایا اور بڑی بے باکی سے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا۔ ان کی پہلی تخلیقی کاوش ''مرأۃ العروس'' جسے اردو ادب کا پہلا ناول ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، تعلیم نسواں کے خلا کو پر کرنے کے لیے ہی وجود میں آیا تھا۔ دراصل یہ کتاب نذیر احمد نے اپنی لڑکیوں کو پڑھانے کی غرض سے تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک فرضی قصے کے ذریعے عورت کے اندر تعلیم نہ ہونے کے نقصانات کے ساتھ تعلیم یافتہ عورت کی خوبی کی داستان مرتب کی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتاب خواندہ اور ناخواندہ عورت کے تقابل پر مبنی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب تعلیم نسواں کے طریقۂ کار کے تمام تر تقاضوں کا خاکہ بھی پیش کرتی ہے۔ 'مرأۃ العروس' کو نذیر احمد نے تعلیم نسواں کے فروغ اور ضرورت کے لیے رقم کیا تھا جس میں دو بہنوں کے فرضی قصے کے ذریعے تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس میں اکبری کا کردار جو کہ بڑی بہن ہے جس کی تعلیم وتربیت نہ ہونے کی وجہ سے شادی کے بعد اپنے افعال سے سسرال کو اجیرن بنادیتی ہے۔ اس کے بالمقابل اصغری کا کردار ہے جس کی تعلیم وتربیت پر بچپن سے دھیان دیا گیا تھا وہ گھر کو جنت بنادیتی ہے۔ اس ناول میں اکبری کے کردار کو مختصراً بیان کیا گیا ہے جب کہ اصغری کے کردار کے تمام پہلوؤں کی تصویر کشی وضاحت سے کی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اصغری کے کردار سے نذیر احمد نے تعلیم نسواں کے تئیں اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نذیر احمد صرف لڑکیوں کی تعلیم کے قائل تھے بلکہ وہ لڑکوں کے لیے بھی تعلیم کو ضروری تصور کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے مکاتیب کے مجموعہ 'موعظ حسنہ' کے بیشتر خطوط سے واضح ہوتا ہے، لیکن نذیر احمد نے تعلیم نسواں پر زور دے کر 'تعلیم حاصل کرو مہد سے لحد تک' پر عمل کیا ہے کیوں کہ ایک انسان کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ماں اگر ناخواندہ ہوگی تو انسان اپنی پہلی درس گاہ میں کس نوعیت کی تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد تعلیم نسواں پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'مرأۃ العروس' میں لکھتے ہیں:

''عورتوں کو اپنی اولاد کی تہذیب کے واسطے بھی لیاقت حاصل کرنے کی بہت ضرورت ہے... پس اے عورتو! اولاد کی اگلی زندگی تمہارے اختیار میں ہے چاہو تو شروع سے ان کے دلوں میں وہ ارادے اور وہ اونچے خیال بھردو کہ یہ بڑے ہوکر نام ونمود پیدا کریں اور تمام عمر آسائش میں بسر کرکے تمھارے شکر گزار رہیں اور چاہو تو ان کی افتاد کو ایسا بگاڑ دو کہ جوں جوں خرابی کے لچھن سیکھتے جائیں اور انجام تک اس کا تاسف کیا کریں۔'' (ایضاً، ص 26-25)

درج بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عورتوں کے لیے تعلیم اور لیاقت کیوں اور کتنی ضروری ہے۔لیکن عہد نذیر احمد سے موجودہ دور تک نہ جانے کیوں تعلیم نسواں کے سلسلے میں ہمارا سماج بے راہ روی کا شکار رہا ہے۔ویسے بھی ہندوستان میں ہماری سماجی و تعلیمی حالت دن بہ دن خستہ ہوتی جارہی ہے اور آج بھی سماج میں کچھ افراد موجود ہیں جو تعلیم نسواں کو فضول اور غیر سماجی گردانتے ہیں۔ ہر زمانے میں یہ کہہ کر تعلیم نسواں کے فروغ کو روکا گیا کہ اگر عورتیں تعلیم حاصل کریں گی تو سماج میں فحاشی اور برائی کا چلن عام ہوگا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم بے حیائی کو روکتا ہے۔ جو لوگ تعلیم نسواں کی مخالفت کرتے ہیں ان کو شاید یہ نہیں معلوم کہ عہد حاضر ایڈوانس ٹکنالوجی کا عہد ہے۔ بہت ساری ضروریات زندگی کل کے مقابلے آج ایسی ہیں جن کی حاجت مرد اور عورت کو یکساں ہے۔عہد حاضر میں جدید علوم کی طرف مرد تو پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر کررہے ہیں مگر عورتوں کو جس لائق ہونا چاہیے تھا اس کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔آج دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم اسی میں الجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم نسواں سماجی برائی کا باعث بنے گی۔ یاد رہے بے حیائی کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بے حیائی تو وہاں بھی ہے جہاں پر تعلیم نسواں کا کوئی چلن نہیں ہے تو اس کو کیا نام دیا جائے۔

1857 کا عہد ایک ایسا عہد تھا جہاں مرد ہی بے راہ روی اور جہالت کے شکار تھے۔ اصلاحی تحریکوں کے ذریعے سماجی اور تعلیمی بیداری کی کوششیں کی گئیں مگر آج ہمیں جس سطح پر ہونا چاہیے اس سے کوسوں دور ہیں۔نذیر احمد مرد کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کے قائل اس لیے تھے کہ ہماری گھریلو زندگی بھی بہتر ہوسکے، جس کے لیے ہمیں اپنے گھروں کی عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانا بے حد ضروری ہے۔ جیسا کہ 'مرأۃ العروس' کے قصے سے ظاہر ہوتا ہے۔ نذیر احمد اپنے زمانے سے قبل اور خود اپنے زمانے کی مشہور و معروف تعلیم یافتہ عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے 'مرأۃ العروس' میں تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''...جو لڑکیاں اپنا وقت گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی ہیں وہ بے ہنری رہتی ہیں اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا وہ مردوں کی طرح دنیا میں نامور اور مشہور ہوئی ہیں جیسے نور جہاں بیگم، زیب النسا بیگم یا ان دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکہ وکٹوریہ، یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے ایک چھوٹے سے گھر یا کنبے کا نہیں بلکہ ملک اور جہان کا بندوبست کیا۔'' (ایضاً،ص15)

نذیر احمد نے تعلیم نسواں کے موضوع پر جس بے باکی سے لکھا وہ بے باکی اس عہد کے دیگر مفکرین کے یہاں نظر نہیں آتی۔انیسویں صدی کے ہندوستان کی سماجی وتہذیبی صورت حال پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس عہد میں عورتوں کے تقدس اور احترام کے تو سبھی قائل تھے مگر ان کی انفرادی شناخت کا حامی کوئی نہیں تھا۔ اس عہد میں عورتوں کی تعلیمی صورت حال بہتر نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی سماجی صورت حال ابتر تھی، جس کی وجہ سے طرح طرح کے ظلم وستم ان پر ڈھائے جاتے تھے۔اس سنجیدہ مسئلے پر کسی نے آواز بلند کرنے کی کوشش نہیں کی۔اس عہد میں یہ خیال عام تھا کہ عورت گھر کی زینت ہے اور اسے چہار دیواری میں رہنا چاہیے۔مگر یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا چہار دیواری کے اندر ان کے حقوق کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی؟ سماجی آزادی کا فقدان، انفرادی حقوق کی پامالی، رحمِ مادر میں بچیوں کا قتل اور بیوہ کی دوسری شادی نہ ہونا وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن سے طبقۂ نسواں کے تئیں مرد اساسی سماج کی جہالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔تعلیم نسواں اور ان کے حقوق سے متعلق نذیر احمد کے موقف کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ایک ایسے عہد میں جو مرد اساس معاشرہ تھا وہاں انھوں نے حقوق نسواں کی آواز اٹھائی۔ اسی لیے انھوں نے تعلیم نسواں کی حمایت تو کی مگر ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ موجودہ معاشرتی حالات میں عورتوں کو اپنا حق حاصل کرنا آسان تو نہیں ہے اس لیے انھیں چاہیے کہ پہلے مناسب تعلیم حاصل کریں۔نذیر احمد ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پڑھنا سیکھو کہ پردے میں بیٹھے ہوئے تمام دنیا کی سیر کرلیا کرو۔علم حاصل کرو کہ اپنے گھر میں زمانے بھر کی باتیں تم کو معلوم ہوا کریں۔'' (ایضاً،ص25)

نذیر احمد تعلیم نسواں کے طرف دار اس لیے بھی تھے کہ عورتیں خانگی اور ذاتی زندگی میں اپنی کمیوں کا ازالہ کرکے تعلیمی و معاشرتی اعتبار سے حسن خلق جیسی نعمتوں سے مزین ہوسکیں۔عصر حاضر میں اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ عورتوں میں تعلیم کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان کی زندگی میں اولاد کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ بھی آتا ہے۔ بچوں کی تربیت کی ذمے داری والدین کے سر ہوتی ہے، خاص طور پر ایک ماں اس سلسلے میں زیادہ سنجیدہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے اندر تعلیم اور تربیت اولاد کی اچھی صلاحیت نہ ہو تو وہ بچوں کی رہنمائی کیسے کرسکتی ہے۔'مرأۃ العروس' میں اس نفسیاتی نکتہ کا تجزیہ کرتے ہوئے نذیر احمد کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''لڑکے مدرسے میں بیٹھنے کے بعد بھی مدتوں تک بے دلی سے پڑھا کرتے ہیں اور کہیں بہت دنوں میں ان کی استعداد کو ترقی ہوتی ہے۔ اس تمام وقت میں ان کو ماؤں سے یقیناً بہت مدد مل سکتی ہے۔ اول تو ماؤں کی سی شفقت اور دل سوزی کہاں؟ اور دوسرے رات دن کا برابر پاس رہنا جب ذرا طبیعت متوجہ دیکھی جھٹ کوئی حرف پہچنوا دیا، یا کچھ گنتی ہی یاد کرادی، کہیں پورب پچھّم کا امتیاز بتادیا۔مائیں تو باتوں باتوں میں وہ سکھا سکتی ہیں جو استاد برسوں کی تعلیم میں بھی نہیں سکھا سکتا۔'' (ایضاً،ص26)

نذیر احمد کے نظریۂ تعلیم نسواں کی عکاسی ان کے خطوط میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ خواتین کی تعلیم اور ان کی تربیت کے تعلق سے کہتے تھے کہ یہ مردوں کی ذمے داری ہے کہ اپنے گھروں میں عورتوں کو خود تعلیم دیں اور اسے اس قابل بنائیں کہ وہ آنے والی نسلوں کی اچھی تربیت کرسکیں۔ان کے یہاں گھر سے باہر نکل کر عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کا تصور اس لیے نہیں ملتا کہ اس عہد میں عورتوں کی عفت کا مسئلہ اور تحفظ کا ڈر تھا۔اس لیے وہ چاہتے تھے کہ گھر کے اندر ہی عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔نذیر احمد کی گھروں میں تعلیم حاصل کرنے کی وکالت کامیاب بھی ہوئی۔خود انھوں نے اپنے گھر میں اس بات کی تاکید کی۔ اپنی بہو کی تعلیم و تربیت کے متعلق بیٹے کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تاکید کرو کہ تمھاری بی بی لکھنا سیکھے، اور اس کے پڑھنے کی کتابیں جمع کرو اور اس کی مدد کامل طور پر کی جائے۔اگر فرمایشوں کی نوبت آئے تو اس کو حقارت کے ساتھ روک دینا کہ ہماری تمھاری حالت پر اماں کو نظر ہے اور اس قدر بس کرتا ہے، جو ان کو مناسب معلوم ہوگا خود کریں گی۔ کچھ تھوڑا سا روپیہ دے کر دیکھو کہ کیا کرتی ہے؟ اگر وہ سودے سلف یا عارضی نمایش کی چیزوں میں اٹھا ڈالے تو جانو کہ احمق اور ناعاقبت اندیش ہے، اور اگر زیور یا دوسرے عمدہ مصرف میں لگائے تو البتہ خوشی کی بات ہے۔تم کو ایک مدت تک بی بی کو تعلیم کرنا پڑے گا۔''

(ڈپٹی نذیر احمد: موعظہ حسنہ، مرتبہ: ثوبان سعید، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2015،ص167)

تعلیم نسواں کے سلسلے میں نذیر احمد کا یہ موقف رہا ہے کہ ان کو صرف اتنی تعلیم دی جائے کہ گھریلو کام کاج، اولاد کی تربیت اور اپنے حقوق کو جان سکیں۔ انھوں نے عورتوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی وکالت نہیں کی۔ ان کا ماننا

تھا کہ عورتوں کو بنیادی تعلیم دینا ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جب بنیاد ہی نہیں ہوگی تو عمارت کا انحصار کس پر ہوگا۔ انیسویں صدی میں تعلیم نسواں کے سلسلے میں کوئی بہتر انتظام نہیں تھا جب کہ عصر حاضر میں تعلیم نسواں کے باب میں اسلامی ادارے قائم کیے گئے ہیں، جہاں لڑکیوں کی تعلیم کی بابت اچھا بندوبست کیا گیا ہے۔ جن میں ان کی تعلیم سے لے کر تربیت پر بھی خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ عصر حاضر میں عورتیں پردے میں رہ کر ہر وہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں جن کو پہلے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں عورتوں کی تعلیم کا تصور بھی نہیں تھا اور اس وقت ایسے ادارے بھی نہیں تھے جہاں پر ان کی عزت وعفت کی کوئی ضمانت لیتا۔ اس لیے اس عہد میں عورتوں کو تعلیم سے دور رکھا گیا۔ عصر حاضر میں اس کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے باقاعدہ مدارس اور ہاسٹل کا انتظام کیا گیا ہے جہاں پر ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عفت کی حفاظت بھی کی جاتی ہے۔ انیسویں صدی میں جو لوگ اس بات پر اعتراض کرتے تھے کہ پردہ کے رواج کی وجہ سے مسلمان عورتیں ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں اس لیے وہ اعلیٰ تعلیم سے محروم ہیں۔ اس مسئلے پر نذیر احمد کا جو موقف ہے وہ قابل تعریف ہے۔ جس سماج میں عورتوں کی تعلیم کا کوئی تصور ہی نہ ہو ان سے اچانک اعلیٰ تعلیم کی بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک کلو وزن اٹھانے کی سکت رکھنے والے کو اچانک دس کلو دے دیا جائے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلم معاشرے میں جو رسم و رواج ہیں اس سے عورتیں ترقی نہیں کر سکتیں۔ نذیر احمد اس دلیل کو باطل قرار دیتے ہیں۔ وہ اس بات سے بالکل واقف تھے کہ پردہ کسی بھی طرح ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنتا ہے۔ انھوں نے ایک خط میں کچھ یوں لکھا ہے:

''مگر خوب سمجھ رہو کہ مجھ کو اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ ہندوستان کی عورتوں کو ان کی حالت کے مناسب تعلیم کرنا نہایت ضروری ہے۔ مگر ساتھ ہی رواج پردہ کی موقوفی کا میں سخت مخالف ہوں۔ اول تو میں انگریزوں کا کوئی کارنمایاں ایسا نہیں دیکھتا جس کو میں سمجھوں کہ پردہ اس میں حارج ہو سکتا ہے۔ اور اگر ہو بھی تو بے پردگی کے خراب نتیجے اخباروں میں پڑھتے پڑھتے کلیجا پک گیا ہے۔'' (ایضاً، ص 209)

جہاں پر تعلیم نسواں کا کوئی تصور ہی نہ ہو وہاں پر اچانک اعلیٰ تعلیم کی بات کرنا احمقانہ سی بات لگتی ہے۔ اس زمانے کے روشن خیالوں کو پہلے عورتوں کے لیے مناسب تعلیم کی بات کرنی چاہیے تھی جیسا کہ نذیر احمد نے کی۔ درج بالا اقتباس اس بات پر دال ہے کہ نذیر احمد عورتوں کو مناسب تعلیم دینے کے حق میں تھے۔ نذیر احمد بھی اگر اس عہد میں اعلیٰ تعلیم کی بات کرتے تو سماج ان کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا۔ لیکن انھوں نے پہلے عورتوں کے لیے مناسب تعلیم کی بات کی اور یہی وقت کی ضرورت بھی تھی۔ تعلیم نسواں کے متعلق نذیر احمد کے نظریات وخیالات کی عکاسی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے پہلے اپنے گھر کی عورتوں کو مناسب تعلیم دینا فرض سمجھا۔ 'مراۃ العروس' اس کی ایک اہم کڑی ہے۔ ان کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''...خدا کی قسم ایک ہمارے گھر کی عورتیں ہیں کہ ہر طرح کی عمدگی ان میں ہے۔ پاک دامنی، دین داری، ہنر خانہ داری، شوہروں کی اطاعت گزاری، نیک دلی، کفایت شعاری: اور ان باتوں کے ساتھ اس قدر پڑھنا لکھنا جو ہماری سوسائٹی کی حالت موجودہ کے لحاظ سے عورتوں کو ضروری ہے۔ کیا ہے جو ان میں نہیں ہے۔''

(ایضاً، ص 51)

تعلیم کے ساتھ عورتوں کو زمانے کی ضرورت کے مطابق ہنر بھی حاصل کرنا چاہیے۔ کیوں کہ انسانی زندگی میں حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ اس لیے یہ صرف مردوں کے لیے خاص نہیں ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر اور لیاقت بھی حاصل کریں۔ مستقبل میں ایک انسان پر وقت اور حالات کیسے ہوں گے یہ بات کسی کو نہیں معلوم۔ عورتوں کی زندگی ہمارے سماجی نظام میں مرد کے تابع ہے اور اس کے نان ونفقہ کی ساری ذمے داری مردوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور مرد ہی ہمارے سماج میں معاشی واقتصادی حالات کا ذمے دار ہوتا ہے اس کے برعکس عورت کو امور خانہ داری کی ذمے داری سونپی جاتی ہے۔ مرد تلاش معاش میں ہر وقت گھر پر نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ سے عورت پر امور خانہ داری کے علاوہ بچوں کی دیکھ ریکھ بھی واجب ہوتی ہے چوں کہ یہی ہمارا سماجی نظام ہے، اس لیے عورت کو تعلیم کے ساتھ لیاقت اور ہنر حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ عین جوانی میں اگر شوہر کا انتقال ہو جائے یا کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اس کی بیوی کس در پر اپنے بچوں کو لے کر جائے گی۔ ایسی حالت میں اگر عورت تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ہنر مند ہوگی تو وہ گھر بیٹھے چھوٹے موٹے کام کر کے بھی اپنے اور اپنے بچوں کی باقی زندگی کا بیڑا پار کر سکتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر عورت میں تعلیم یا کوئی ہنر نہیں ہوگا تو اس کی بقیہ زندگی مصیبت زدہ ہو جائے گی۔ اس لیے ہمارا یہ سماجی فریضہ ہے کہ وقت اور حالات کی مناسبت سے ہم عورتوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ مصیبت پڑنے پر کسی کی محتاج نہ رہیں۔ 'مراۃ العروس' میں نذیر احمد اس مسئلے کی طرف توجہ مرکوز کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لکھنے پڑھنے کے علاوہ سینا پرونا کھانا پکانا یہ دونوں ہنر ہر ایک لڑکی کو سیکھنے ضروری ہیں۔ کسی آدمی کو یہ حال معلوم نہیں ہے کہ آئندہ اس کو کیا اتفاق پیش آئے گا۔ بڑے امیر اور بڑے دولت مند یکا یک غریب اور محتاج ہو جاتے ہیں اگر کوئی ہنر ہاتھ میں پڑا ہوتا ہے تو ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ اگلے وقتوں کے بادشاہ باوجود دولت وثروت کے ضرور کوئی کام سیکھ رکھا کرتے تھے تاکہ مصیبت کے وقت کام آئے۔''

(ڈپٹی نذیر احمد: مراۃ العروس، لکھنؤ، تیج کمار 1978، ص 18)

ڈپٹی نذیر احمد کا نظریۂ تعلیم نسواں پوری طرح واضح ہے۔ وہ تعلیم نسواں کو وقت اور حالات کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے اس کے حق میں تھے کیونکہ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ ہماری تہذیبی وسماجی ترقی تعلیم نسواں کے تصور کے بغیر مکمل نہیں۔ انھوں نے تعلیم نسواں کی شروعات اپنے گھر سے کی اور اپنی بچیوں کو پڑھانے کے لیے خود ہی کتابیں تصنیف کیں جن میں 'مراۃ العروس' اور 'بنات النعش' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اتنا ہی نہیں ان کی دیگر تصانیف جن میں 'توبۃ النصوح' اور 'موعظہ حسنہ' کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے یہ بھی تعلیم اور تربیت اولاد کے موضوع پر مبنی ہیں۔ تعلیم نسواں کے تئیں نذیر احمد کے افکار ونظریات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے علاوہ اپنی اکلوتی بہو کو بھی تعلیم یافتہ اور ہنر مند بنانا چاہتے تھے۔ آج بھی ہمارے سماج میں ایسا بہت ہی کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ بہو کو تعلیم دینے کی بات کی جاتی ہو۔ اس سوچ سے بھی نذیر احمد کے نظریۂ تعلیم نسواں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال اتنا تو واضح ہے کہ نذیر احمد وقت اور حالات کے مطابق تعلیم نسواں کو ضروری مانتے تھے۔ جس کی زندہ مثال ان کی متعدد تصانیف ہیں جو آج بھی تعلیم نسواں کی اہمیت اور افادیت کو واضح کر رہی ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ صدی کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی تصانیف مشعل راہ ہیں اور اردو ادب میں اعلیٰ مقام کی حامل ہیں۔

■

Mohammad Amir
Room No: 002, Narmada Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067
Email.: mohdamir56@gmail.com

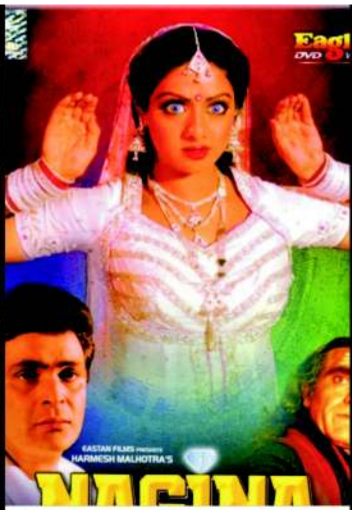

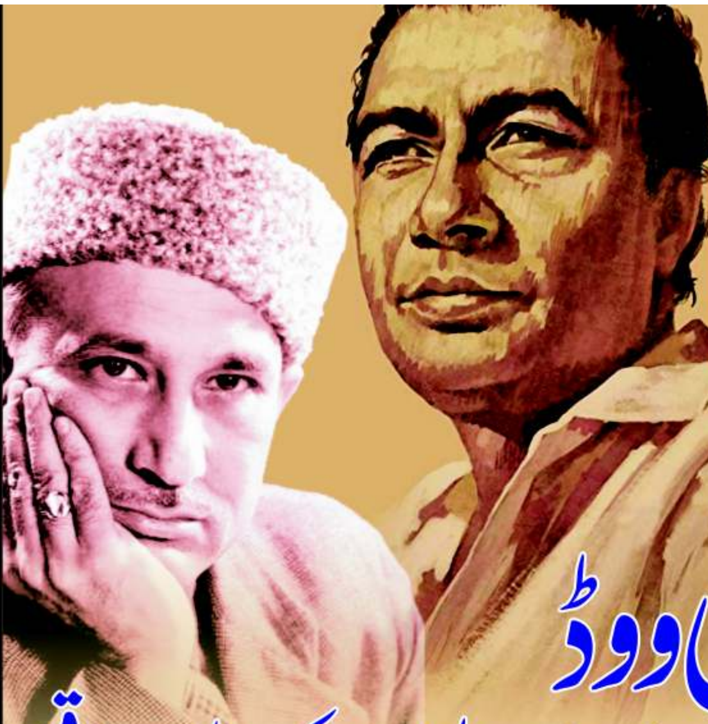

محمد شمیم اختر

بالی ووڈ
اردو جاننے والوں کے لیے مواقع

بے روزگار نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ وہ شخص کامیاب نہیں ہو پاتا جس میں ناکامی کا خوف کامیابی کی چاہت سے زیادہ ہو۔ لہٰذا ہر انسان کو ہی ناکامی کے بارے میں غور و فکر کرنے کے بجائے اپنے اندر کامیابی کی چاہت جگانی چاہیے اور اس کے لیے تگ و دو میں لگ جانا چاہیے۔

بالی ووڈ کے نام سے مشہور ہماری فلمی دنیا بہت بڑی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی فلم صنعتوں میں سے ایک ہے۔ روزگار کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو یہ روزگار فراہم کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی صنعت ہے اور اگر فلموں کی تعداد کا ذکر کیا جائے تو بالی ووڈ میں اوسطاً ہر سال ایک ہزار فلمیں تیار ہوتی ہیں جبکہ انگریزی فلمی دنیا، ہالی ووڈ میں ایک سال میں تقریباً 500 فلمیں ہی بنتی ہیں۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے کاروبار کی بات کی جائے تو جہاں 2007 میں تقریباً 9300 کروڑ روپے کا کاروبار ہوا تو وہیں 2008 میں یہ 10400 کروڑ روپے پہنچ گیا۔ 2012 میں تو اس کا کاروبار تقریباً 11200 کروڑ روپے اور 2013 میں 12500 کروڑ روپے تک پہونچ گیا۔ اس کے بعد تو ہر سال ہی اس کے کاروبار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ 2017 کی بات کی جائے تو اس سال 15500 کروڑ روپے کا کاروبار ہوا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق 2021 میں بالی ووڈ کا کاروبار تقریباً 20700 کروڑ روپے تک پہنچ جائے گا۔

یہ بالی ووڈ کا جادو ہی ہے جس سے ہالی ووڈ بھی متاثر ہے۔ امریکی فلموں کے مشہور و معروف اداکار بریڈ پٹ نے انڈو۔ایشین نیوز سروس سے ایک بار انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ کسی بالی ووڈ فلم میں کام کرنا پسند کریں گے کیونکہ بالی ووڈ فلموں میں بہت ڈراما ہوتا ہے اور یہاں کی فلموں میں بہت زیادہ رنگ ملتے ہیں۔

بالی ووڈ میں اداکاری سے لے کے پروڈکشن، اور پروڈکشن سے اڈیٹنگ، اسکرپٹ رائٹنگ، مکالمہ نگاری، اور ترجمہ، ڈبنگ سے لے کے وائس اوور اور زبان و آواز اور تلفظ میں تربیت جیسے بہت سے شعبے ہیں جہاں تعلیم یافتہ افراد خاص طور سے اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے افراد کے لیے کافی مواقع ہیں۔

ہم جب فلمیں دیکھتے ہیں تو اسکرین پر ہمیں چند افراد جس میں ہیرو، ہیروئن، ولین (غنڈہ) اور دوسرے اداکار ہی نظر آتے ہیں اور ایک عام تاثر ان ہی چند اداکاروں پر جا کر ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ فلم کا پس منظر کتنا وسیع ہے اور ایک فلم کو پردے تک پہنچانے میں کتنے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کا علم فلم انڈسٹری سے واقفیت رکھنے والے لوگوں کو ہی ہوتا ہے۔

کسی فلم کی تیاری میں بہت سارے شعبے کارفرما ہوتے ہیں جس میں سب سے پہلا اور اہم شعبہ ہدایت کاری یعنی ڈائرکشن کا ہے پھر پروڈکشن کا ہے۔ پروڈکشن میں پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کے علاوہ اسکرپٹ رائٹر وغیرہ آتے ہیں۔ پھر آرٹ، کاسٹنگ، کیمرہ، سیٹ آپریشن، میک اپ کے شعبے ہوتے ہیں اور پھر اس کے بعد پوسٹ

پروڈکشن کا مرحلہ آتا ہے جس میں اڈیٹوریل، کمپوزیٹنگ، پوسٹ پروڈکشن ساونڈ اینڈ میوزک، وژول افیکٹس وغیرہ شامل ہیں۔

ہر شعبے کی تفصیلات سے واقفیت بہت ضروری ہے تاکہ تمام شعبوں میں روزگار کے مواقع کی معلومات حاصل ہو۔

ہدایت کاری، ڈائرکشن

کسی فلم میں ہدایت کاری کا شعبہ سب سے اہم شعبہ ہے۔ ہدایت کاری یعنی ڈائرکٹر اپنے آپ میں ایک شعبہ ہے جن کی نظروں میں فلم کے تمام پہلو ہوتے ہیں۔ اس میں مواد سے لے کے ہر قسم کا تخلیقی پہلو شامل ہے۔ اس میں اداکاروں کے لیے ہدایت کاری، شوٹنگ کے لیے مقامات کے انتخاب اور تکنیکی تفصیلات کی تمام باتیں شامل ہیں۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ پوری فلم کی تیاری کی ذمے داری ڈائرکٹر کی ہوتی ہے۔ اس کے لیے بڑے ہی تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے ڈائرکٹر کے معاون کے طور پر خدمات انجام دینی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ہی کوئی ہدایت کاری کے اس اہم ترین پیشے میں قسمت آزماتا ہے۔

میوزک ڈائرکٹر

فلموں میں موسیقی کا ایک اہم رول ہوتا ہے۔ بالی ووڈ میں تقریباً تمام فلمیں موسیقی پر مشتمل ہوتی ہیں جس میں نغموں کو اپنا منفرد مقام حاصل ہے۔ میوزک ڈائرکٹر کے کام میں موسیقی سے متعلق تمام انتظامات اور ریکارڈنگ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

پروڈکشن

پروڈکشن کے شعبے میں پروڈیوسر، ایگزیکٹو پروڈیوسر، لائن پروڈیوسر، پروڈکشن اسسٹنٹ، پروڈکشن منیجر، اسسٹنٹ پروڈکشن منیجر، یونٹ منیجر، پروڈکشن کو آرڈی نیٹر، اسسٹنٹ ڈائرکٹرس، لوکیشن منیجر، اسسٹنٹ لوکیشن منیجر، لوکیشن اسسٹنٹ، لوکیشن پروڈکشن اسسٹنٹ، کاسٹنگ ڈائرکٹر، اور پبلسسٹ وغیرہ آتے ہیں۔

پروڈیوسر

پروڈکشن کے شعبے میں پروڈیوسر کا کام سب سے اہم ہوتا ہے جو فلم کو پروڈیوس کرنے کا ماحول تیار کرتا ہے۔ پروڈیوسر فلم کی تیاری کے لیے پہل کرتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں سے بات چیت کرتا ہے۔ فلم کے سارے کام ان کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ وہ فلم بنانے میں ہونے والے اخراجات کا انتظام کرتا ہے، فلم میں کام کرنے والے اور فلم کے لیے کام کرنے والے افراد کو مقرر کرتا ہے۔ پروڈیوسر فلم کے شروع سے اس کے مکمل ہونے تک، تمام مراحل کی نگرانی کرتا ہے۔

> **فلم انڈسٹری میں داخلے کے لیے کافی سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں داخلے کے لیے زیادہ تر اسکرین رائٹرس اپنے کریئر کا آغاز بغیر با ضابطہ ملازمت کے یا بغیر کسی اجرت کے کرتے ہیں۔ اگر آپ کی یہ اسکرپٹ پسند آ جاتی ہے تو اسے اسپیک اسکرپٹ کہا جاتا ہے۔ پیشہ ور اسکرین رائٹر اپنی کہانیاں فروخت کرنے کے لیے ایجنسی وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں جبکہ نئے رائٹرس کو اس کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑتا ہے اور وہ 'رائٹرس ان ٹریننگ' خیال کیے جاتے ہیں۔**

پروڈکشن میں اس کے علاوہ کیمرہ اور لائٹنگ سے لے کر آرٹ ڈائرکٹر، سیٹ ڈیزائنر، گرافک ڈیزائنر، سیٹ ڈیکوریٹر، کوسٹیوم ڈیزائنر، کوسٹیوم سپر وائزر، کی کوسٹیومر، کوسٹیوم ہائر اور میک اپ شعبے میں میک اپ آرٹسٹ، میک اپ سپر وائزر اور ہیئر اسٹائلسٹ وغیرہ آتے ہیں۔

پوسٹ پروڈکشن

پوسٹ پروڈکشن شعبے میں پوسٹ پروڈکشن سپر وائزر، فلم ایڈیٹر، نگیٹو کٹر، کلرسٹ، ٹیلی سین کلرسٹ وغیرہ ہوتے ہیں۔ فلم کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے اس میں وژول افیکٹس ڈالے جاتے ہیں۔ اس کے لیے وژول افیکٹس پروڈیوسر، وژول افیکٹس کریٹیو ڈائرکٹر، وژول افیکٹس سپر وائزر، وژول افیکٹس ایڈیٹر اور کمپوزیٹر وغیرہ آتے ہیں۔

تعلیم یافتہ افراد کے لیے بالی ووڈ میں مواقع

یوں تو اگر تجزیہ ہو تو مذکورہ تمام شعبوں میں روزگار کے مواقع ہیں لیکن بات اردو کے تعلق سے ہو رہی ہے تو اب ذکر ان شعبوں کا جس میں اردو جاننے والوں کے لیے روزگار میں مواقع ہیں اور یہ بھی کہ ان شعبوں میں اردو سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

بالی ووڈ میں بننے والی فلموں میں شاید ہی کوئی ایسی فلم ہوگی جس میں اردو زبان کے الفاظ کا استعمال نہ ہوا ہو۔ اردو زبان کی شیرینی، شائستگی، فصاحت و بلاغت، یہ وہ چیزیں ہیں جو سب کو اس کے استعمال کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ اردو کے حوالے سے مندرجہ ذیل شعبوں میں روزگار حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

1۔ اسکرین پلے رائٹنگ
2۔ مکالمہ نگاری
3۔ نغمہ نگاری
4۔ مترجم
5۔ ایڈیٹنگ (زبان کے حوالے سے)
6۔ ٹرینر (تربیت کار)
7۔ وائس اوور آرٹسٹ
8۔ نیریٹر (راوی)

مذکورہ شعبوں میں کیسے کام انجام دیا جاتا ہے اور کس طرح کوئی اس بڑی فلمی دنیا میں رسائی حاصل کر سکتا ہے، اس کا ذکر ضروری ہے۔

اسکرین پلے رائٹنگ

کسی بھی فلم، ٹیلی ویژن پروگرام، کامکس یا ویڈیو گیمس کے لیے اسکرپٹ رائٹنگ یا اسکرین پلے رائٹنگ ضروری ہے۔ درحقیقت یہ سارے پروگرام اسکرین پلے رائٹنگ پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ اسکرین پلے رائٹنگ ایک ہنر ہے جس کے لیے تخلیقی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی چیز کو دلچسپ بنانے کے لیے اسے موثر انداز میں بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ کی تحریر دلچسپ ہے اور اس میں قارئین کو باندھے رکھنے کی صلاحیت ہے تو آپ کامیاب ہیں۔

یہ کسی کتاب یا افسانہ لکھنے کے مترادف ہے۔ افسانے صرف صفحات پر وجود میں رہتے ہیں جبکہ فلمیں انہیں ہمارے سامنے زندگی کا حصہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ناولوں اور افسانوں پر فلمیں بنی ہیں۔ آپ کی تمام تخلیقیت فلم میں بروئے کار آتی ہے۔

اسکرین پلے یا ٹیلی پلے لکھنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو کسی خیال یا آئیڈیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ان خیالات کو اسکرپٹ کی شکل دینی پڑتی ہے۔ اسکرپٹ کسی پراپرٹی جیسے کسی کتاب یا کسی انسان کی زندگی پر مبنی ہو سکتی ہے جسے اسکرپٹ رائٹر ایک دلچسپ کہانی کی شکل دیتے ہیں۔ زیادہ تر معاملوں میں اسکرین رائٹر کی پہل سے ہی فلم کو ایک شکل ملتی ہے۔

فلم انڈسٹری میں داخلے کے لیے کافی سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں داخلے کے لیے زیادہ تر اسکرین رائٹرس اپنے کریئر کا آغاز بغیر با ضابطہ ملازمت کے یا بغیر کسی اجرت کے کرتے ہیں۔ اگر آپ کی یہ اسکرپٹ پسند آ جاتی ہے تو اسے اسپیک اسکرپٹ کہا جاتا ہے۔ پیشہ ور اسکرین رائٹر اپنی کہانیاں فروخت کرنے کے لیے ایجنسی وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں جبکہ نئے رائٹرس کو اس

کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑتا ہے اور وہ 'رائٹرس ان ٹریننگ' خیال کیے جاتے ہیں۔

مکالمہ نگاری

مکالمہ نگاری بھی ایک فن ہے جو فلم کے شائقین کو فلم کی کہانی سے باندھے رکھتا ہے اور واہ واہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ فلم شہنشاہ کا ڈائیلاگ کہ 'رشتے میں تو ہم تمہارے باپ لگتے ہیں لیکن نام ہے شہنشاہ' یا فلم دیوار کا مکالمہ 'آج میرے پاس گاڑی ہے، بنگلہ ہے، پیسہ ہے... تمھارے پاس کیا ہے؟' یا پھر فلم پاکیزہ کے ڈائیلاگ 'آپ کے پاوں دیکھے، بہت حسین ہیں، انہیں زمین پر مت اتاریئے، میلے ہوجائیں گے'، مغل اعظم کا ڈائیلاگ کہ 'انار کلی، سلیم کی محبت تمھیں مرنے نہیں دے گی اور ہم تمہیں جینے نہیں دیں گے'، فلم شعلے سے 'ہم انگریزوں کے زمانے کے جیلر ہیں'، ایسے ڈائیلاگ ہیں جو ہماری زبان پر ہیں۔ اس کا سہرا ان فلموں کے مکالمہ نگاروں کے سر بندھتا ہے۔

وجاہت مرزا، خواجہ احمد عباس، اختر مرزا، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، قادر خان، سلیم جاوید وغیرہ کو کون نہیں جانتا۔ یہ وہ نام ہیں جن کا شمار بالی ووڈ میں مکالمہ نگاری میں ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اردو جاننے والے ان لوگوں نے فلموں کے لیے اسکرین پلے اور مکالمے لکھ کر بالی ووڈ میں اپنی موجودگی کا احساس کروایا۔

اگر آپ کے اندر تخلیقی شعور ہے، لکھنے کا طریقہ آپ کو آتا ہے تو آپ کو اسکرین پلے اور مکالمہ نگاری میں ضرور کامیابی ملے گی۔

نغمہ نگاری

غزل، نظم اور نغمے کسے پسند نہیں اور بالی ووڈ میں شاید ہی ایسی کوئی فلم ہوگی جس میں نغمے یعنی گانے نہ ہوں۔ اس کے بغیر ہماری فلمی دنیا ادھوری ہے۔ نغمہ نگاری میں اردو کے حوالے سے مواقع کی کمی نہیں ہے، بس آپ کو خوبصورت اور دل کو چھو جانے والی شاعری آنی چاہیے۔

اردو نغمہ نگاری میں جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، ندا فاضلی، جاوید اختر، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، راجہ مہدی علی خان، گلزار، ساحر لدھیانوی، حسرت جے پوری، قمر جلال آبادی، کوثر منیر، اسد بھوپالی، راحت اندوری، حسن کمال، ارشاد کامل، سعید قادری، جلیس شیروانی، شکیل اعظمی، وغیرہ کا نام کون نہیں جانتا۔

نغمے، فلم کی کہانی کو آگے بڑھانے اور حالات کے اظہار میں کافی مددگار ہوتے ہیں۔ کہانی میں حالات کے حساب سے ہی نغمے لکھے جاتے ہیں۔ آپ میں اگر شاعری کا جذبہ ہے، اپنے احساسات کو اگر آپ پرواز دے سکتے ہیں تو آپ فلموں کے لیے شاعری کر سکتے ہیں اور نغمے لکھ سکتے ہیں۔

مترجم

آج کل انگریزی، تمل، ملیالم اور کنڑ وغیرہ جیسی دیگر زبانوں کی فلموں کی بڑی تعداد میں ڈبنگ کی جاتی ہے اور پھر وہ ریلیز کی جاتی ہیں۔ اس کے لیے مترجمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو ترجمے کا فن آتا ہے، زبان پر عبور رکھتے ہیں تو یہ کام آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ آپ آسانی سے دیگر زبانوں کی فلموں کی اسکرپٹ اور ڈائیلاگ کا ترجمہ کر سکتے ہیں اور بڑی تعداد میں روزگار کے مواقع حاصل کر سکتے ہیں۔

اڈیٹنگ (زبان کے حوالے سے)

اسکرپٹ کے مکمل ہونے کے بعد زبان کے حوالے سے اس کی اڈیٹنگ بھی ضروری ہوتی ہے۔ اردو زبان پر عبور رکھنے والوں کے ساتھ ایک بہتر چیز یہ ہوتی ہے کہ انہیں ہندی بھی اچھی طرح آتی ہے لہذا کسی بھی اسکرپٹ کی اڈیٹنگ میں انہیں اس سے کافی آسانی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شعبے میں بھی اردو زبان پر دسترس رکھنے والوں کے لیے روزگار کے مواقع میں کمی نہیں ہے۔

ٹرینر (تربیت کار)

بالی ووڈ میں تقریباً ملک کے ہر حصے سے آئے اداکار کام کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دیگر ممالک سے بھی لوگ آکر ہماری فلمی دنیا میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انہیں زبان، ثقافت، طرز زندگی اور دیگر چیزوں کے بارے میں سیکھنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ خاص طور سے زبان کی بات کی جائے تو انھیں بولنے کا طرز، اپنی بات کو لوگوں تک پہنچانے کا طریقہ، تلفظ وغیرہ میں دقت آتی ہے۔ اس صورتحال میں انہیں تربیت کار یعنی ٹرینر کی خدمات لینی پڑتی ہیں۔ اس کے لیے کسی اردو داں سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا لہذا ایک شعبہ یہ بھی ہے جو ہمیں روزگار فراہمی کا یقین دلاتا ہے۔

ہماری فلم انڈسٹری میں روزگار کے بے پناہ امکانات ہیں۔ اسکرین پلے رائٹنگ، مکالمہ نگاری، نغمہ نگاری، ترجمہ، ایڈیٹنگ، تربیت، وائس اوور اور نیریٹر کے طور پر ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے یہاں دیگر شعبوں میں بھی روزگار کے لامتناہی امکانات موجود ہیں۔ خواہ اکاونٹس ہو، مینجمنٹ ہو، یا پھر انسانی وسائل کا شعبہ، ہر شعبے میں کام کرنے والے قابل لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

وائس اوور آرٹسٹ (ڈبنگ آرٹسٹ)

وائس اوور آرٹسٹ کہیں یا ڈبنگ آرٹسٹ، ان کا کام اپنی آواز دینا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کے پہلے ذکر ہو چکا ہے دیگر زبانوں کی بہت ساری فلموں کی ہمارے یہاں ڈبنگ ہوتی ہے اور پھر یہ فلمیں ریلیز کی جاتی ہیں۔ انہیں آواز دینے کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جن کا تلفظ بہتر ہو، جو جانتا ہو کہ لفظ کی ادائیگی کس طرح کرنی ہے۔ لہذا اس شعبے میں آپ اپنی قسمت آزما سکتے ہیں۔ آپ کے لیے مواقع کی یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

نیریٹر (راوی)

بہت ساری فلمیں ایسی ہوتی ہیں جس میں کہانی کو رفتار دینے کے لیے پس منظر سے اس کہانی کے بارے میں بتایا جاتا ہے جو کہانی کو پردے پر دکھائے جانے والی تصویروں اور ویڈیو سے منسلک کرتا ہے۔ یہ کام نیریٹر یعنی راوی کا ہوتا ہے۔ اکثر اس کے لیے کسی معروف اداکار کی خدمات لی جاتی ہیں۔ امیتابھ بچن اور اوم پوری وغیرہ نے بہت سی فلموں میں اپنی آواز دی ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ نیریٹر کے لیے ہمیشہ ایسے ہی کسی بڑے اداکار کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ آپ کی آواز اگر اچھی ہے اور الفاظ کی ادائیگی آپ واضح طور پر کر سکتے ہیں اور کہاں کس لفظ پر آپ کو زور دینا ہے، یہ آپ کو آتا ہے تو آپ راوی کی خدمات بہ آسانی انجام دے سکتے ہیں۔

ہماری فلم انڈسٹری میں روزگار کے بے پناہ امکانات ہیں۔ اسکرین پلے رائٹنگ، مکالمہ نگاری، نغمہ نگاری، ترجمہ، ایڈیٹنگ، تربیت، وائس اوور اور نیریٹر کے طور پر ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے یہاں دیگر شعبوں میں بھی روزگار کے لامتناہی امکانات موجود ہیں۔ خواہ اکاونٹس ہو، مینجمنٹ ہو، یا پھر انسانی وسائل کا شعبہ، ہر شعبے میں کام کرنے والے قابل لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا (ایف ٹی ٹی آئی) اور دیگر ادارے فلموں اور ٹیلی ویژن میں روزگار حاصل کرنے کے لیے تربیت بھی دیتے ہیں۔ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان ان اداروں سے کورس مکمل کر کے بالی ووڈ میں ہر طرح کے شعبے میں روزگار کے مواقع حاصل کر سکتے ہیں۔

■

Mohd Shamim Akhtar
Jogabai Ext.
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

دستاویز میں عناصر جوڑنا
(Adding Elements to the Documents)

پچھلے دو ابواب میں آپ نے سیکھا کہ کس طرح آپ ایم ایس-ورڈ کے ربن میں انسرٹ ٹیب کے ذریعے اپنی دستاویز میں فہرست، جدول اور گرافکس جوڑ سکتے ہیں۔ اس باب میں ہم انسرٹ ٹیب کی کچھ دیگر خصوصیات کا ذکر کریں گے، جن کی مدد سے آپ دستاویز میں خالی پیج، ہیڈر، فوٹر، علامت، خاص نشان وغیرہ دیگر عناصر جوڑ سکتے ہیں۔

صفحات کا حصہ (Page Sections)

تصویر WD-6.1: پہلے سے بنائے کور پیج

Insert ٹیب کے صفحات کے حصہ (Pages Section) میں کل تین بٹن ہیں۔ کور پیج (Cover Page)، خالی صفحہ (Blank Page) اور پیج بریک (Page Break)۔ ان بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) کور پیج جوڑنا (Adding Cover Page): کبھی کبھی ورڈ میں رپورٹ ٹائپ کرتے وقت آپ کو ایک اچھا کور پیج (Cover Page) جوڑنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس سے آپ کی رپورٹ/ دستاویز زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہے۔ ایم ایس-ورڈ میں کچھ پہلے سے ہی تیار کیے گئے Cover Page موجود ہیں، جن میں سے آپ کسی ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

اس کے لیے Insert ٹیب کے Pages حصہ میں Cover Page کے ڈراپ ڈاؤن بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک مینو کھلے گا (تصویر WD-6.1)، جس میں پیج کور کے آپشن ہوں گے۔ آپ اپنی ضرورت کے مطابق دستاویز کے موافق کسی بھی آپشن پر کلک کیجیے۔ Cover Page فوراً جڑ جائے گا۔ اس میں آپ کو صرف دستاویز کا نام، مصنف کا نام، تاریخ اور دیگر معلومات کو جوڑنا ہوگا۔

آپ دیکھیں گے کہ کچھ Cover Pages کو جوڑنے سے ربن میں Table Tools کے تحت Diesign اور Layout کے دو ٹیب جڑ جاتے ہیں (تصویر WD-6.2)، جن کے ذریعے آپ Cover Page کو ایڈیٹ کر سکتے ہیں۔ یہ ٹیب ٹیبل بناتے وقت جڑنے والے ٹیب کی ہی طرح ہیں، جن کا تفصیلی ذکر ہم باب 4 میں کر چکے ہیں۔

تصویر WD-6.2: ٹیبل ٹولس میں ڈیزائن ٹیب

اگر آپ اپنی دستاویز سے Cover Page ہٹانا چاہیں، تو Cover Page مینو میں Remove Current Cover Page ہدایت دیں۔ Cover Page فوراً غائب ہو جائے گا۔

(ii) خالی صفحہ جوڑنا (Adding Blank Page): اگر آپ اپنی دستاویز میں خالی صفحہ جوڑنا چاہتے ہیں، تو Cover Page بٹن کے نیچے دیے گئے Blank Page بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے نقطہ شمول کی جگہ ایک خالی صفحہ جڑ جائے گا۔

(iii) پیج بریک (Page Break): ورڈ میں کام کرتے وقت آپ کو کسی صفحے کو دو صفحات میں تقسیم کرنے کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ یہ کام Page Break بٹن کی مدد سے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس بٹن کو کلک کرتے ہی نقطہ شمول کی جگہ سے ایک نیا صفحہ شروع ہو جائے گا، یعنی موجودہ صفحہ تقسیم ہو جائے گا۔

تصویر WD-6.3: ہیڈر کے اسٹائل

ہیڈر اور فوٹر حصہ (Header and Footer Section)

Insert ٹیب کے ہیڈر اور فوٹر حصہ (Header & Footer Section) میں تین بٹن ہیں۔ صفحہ کے اوپر کا حصہ (Header)، صفحہ کے نیچے کا حصہ (Footer) اور صفحہ نمبر

(Page Number)۔ان سبھی کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) ہیڈر جوڑنا (Inserting Header): کبھی کبھی آپ کو دستاویز میں ہیڈر جوڑنے کی ضرورت پڑجاتی ہے۔اس کے لیے Insert ٹیب کے Header & Footer حصہ میں Header کے ڈراپ ڈاون بٹن پر کلک کیجیے۔ ڈراپ ڈاؤن مینو (تصویر WD-6.3) میں آپ کو ہیڈر کے الگ الگ اسٹائل نظر آئیں گے۔ آپ اپنی خواہش کے مطابق کوئی بھی اسٹائل چن کر مناسب ہیڈر دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ مینو میں دیکھیں گے کہ ورڈ میں طاق (Odd) اور جفت (Even) صفحہ نمبر والے صفحات کے لیے الگ الگ ہیڈر دینے کی سہولت موجود ہے۔

ہیڈر کو ایڈٹ کرنے یا مٹانے کے لیے Heaer مینو میں بالترتیب Edit Header اور Remove Header ہدایت دیں۔

ہیڈر اور فوٹر ٹولس (Header & Footer Tools)

ہیڈر یا فوٹر جڑتے ہی ربن میں Headr & Footer Tools کے تحت Design ٹیب (تصویر WD-6.4) جڑ جاتا ہے، جس کے ذریعے آپ ہیڈر یا فوٹر علاقہ میں تاریخ، وقت، کوئک پارٹ، تصویر، کلک آرٹ جوڑ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ایک ہیڈر یا فوٹر سے دوسرے پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں، الگ الگ صفحات کے لیے الگ الگ ہیڈر بنا سکتے ہیں اور ہیڈر اور فوٹر کی پوزیشن بھی متعین کرسکتے ہیں۔ اس ٹیب کو بند کرنے کے لیے Close Header & Footer بٹن پر کلک کریں۔

ہیڈر اور فوٹر ٹولس کی خصوصیات یہاں اختصار میں بتائی گئی ہیں، جنھیں آپ Screen Tip (ماؤس پوائنٹر کے ایک لمحہ رکنے پر ملنے والی جانکاری) کے ذریعے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

تصویر WD-6.4: ہیڈر اور فوٹر ٹولس کے تحت ڈیزائن ٹیب

ٹیبل ٹولس (Table Tools)

آپ دیکھیں گے کہ ٹیبل نما ہیڈر یا فوٹر جوڑنے پر ہیڈر یا فوٹر ٹولس کے ڈیزائن ٹیب کے علاوہ ٹیبل ٹولس کے ڈیزائن اور لے آؤٹ ٹیب بھی جڑ جاتے ہیں، جن کا استعمال ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں۔

ایک عام ہیڈر یا فوٹر بنانے کا ایک آسان طریقہ بھی ہے۔ آپ صرف اپنی دستاویز کے ہیڈر علاقہ (اوپری حاشیہ) یا فوٹر علاقہ (نچلا حاشیہ) میں ڈبل کلک کیجیے۔ اب اپنا من چاہا ٹیکسٹ ٹائپ کیجیے اور ہیڈر یا فوٹر علاقہ کے باہر ڈبل کلک کیجیے۔ ہیڈر ر فوٹر فوراً بن جائے گا۔ اسی طرح آپ ڈبل کلک کرکے ہیڈر یا فوٹر کو ایڈٹ کرسکتے ہیں یا ہٹا بھی سکتے ہیں۔

(i) فوٹر جوڑنا (Inserting Footer): ہیڈر جوڑنے کی جانکاری دیتے وقت ہم فوٹر جوڑنے کی بھی زیادہ تر جانکاری فراہم کرچکے ہیں۔ فوٹر جوڑنے کی سبھی کارروائی ہیڈر جوڑنے کی ہی طرح ہے۔ فوٹر جوڑنے پر بھی ربن میں Header & Footer Tools جڑتے ہیں۔

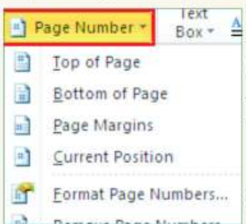

تصویر WD-6.5: صفحہ نمبر کا اسٹائل

(iii) صفحہ نمبر جوڑنا (Inserting Page Numbers): صفحہ نمبر جوڑنا ہیڈر اور فوٹر جوڑنے کی طرح آسان اور آرام دہ ہے۔ Insert ٹیب کے Header & Footer حصہ میں Page Number ڈراپ ڈاؤن مینو (تصویر WD-6.5) کے ذریعے آپ اپنی ضرورت کے مطابق دستاویز کے اوپر (Top of Page)، نیچے (Bottom of Page)، حاشیہ میں (Page Margins)، نقطہ شمول (Cursor) کی جگہ (Current Position) صفحہ نمبر جوڑ سکتے ہیں۔

(iv) صفحہ نمبر کا فارمیٹ سیٹ کرنا (Setting the Format of Page Numbers): آپ ایم ایس-ورڈ میں صفحہ نمبر کا فارمیٹ، جیسے 1، 2، 3، i، ii، iii.....، a، b، c..... وغیرہ سیٹ کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے Page Number مینو میں Format Page Numbers... ہدایت دیں۔ ایسا کرنے پر Page Number Format ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-6.6) کھلتا ہے۔

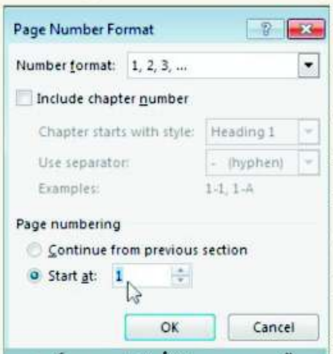

تصویر WD-6.6: صفحہ نمبر کا فارمیٹ سیٹ کرنا

Number Format ڈراپ ڈاؤن مینو کی مدد سے آپ خواہش کے مطابق فارمیٹ سیٹ کرسکتے ہیں۔ Include Number کی مدد سے آپ باب نمبر بھی جوڑ سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ آپشن زیادہ استعمال میں نہیں آتے، کیونکہ ان کے لیے Home ٹیب کے پیراگراف حصہ میں جاکر ملٹی لیول لسٹ وغیرہ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ Page Numbering آپشن سے آپ صفحہ نمبر ایک خاص صفحہ سے شروع کرسکتے ہیں یا عام طریقے سے سبھی صفحات میں جوڑ سکتے ہیں۔ صفحہ نمبر مٹانے کے لیے Page Number ڈراپ ڈاؤن مینو میں Remove Page Number ہدایت دیں۔

نشانات کا حصہ (Symbols Section)

Insert ٹیب کے نشانات حصہ (Symbols Section) میں کل دو بٹن ہیں۔ حسابی مساوات (Equation) اور نشان (Symbol)۔ ان بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

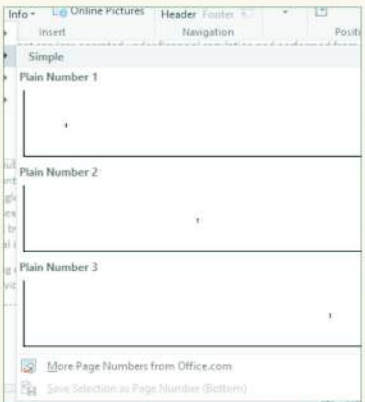

تصویر WD-6.7: ورڈ میں تیار حسابی مساوات

(i) حسابی مساوات کو جوڑنا (Inserting Equation): ایم ایس-ورڈ میں کچھ عام اور مقبولِ عام حسابی مساوات، جیسے دائرے کا رقبہ (Area of Circle)، دو اسمی کلیہ (Binominal Theorem) وغیرہ پہلے سے ہی موجود ہیں۔ آپ Insert ٹیب کے نشانات (Symbols) حصہ میں Equation بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کریں۔ ایسا کرنے پر ایک مینو کھلے گا (تصویر WD-6.7)، جس میں کچھ عام حسابی مساوات دستیاب ہوں گی۔ آپ ان میں سے کسی بھی مساوات پر کلک کرکے اسے نقطہ شمول کی جگہ پر جوڑ سکتے ہیں۔

اگر مطلوبہ مساوات اس مینو میں موجود نہیں ہے، تو مینو کے نچلے حصہ میں دیے گئے

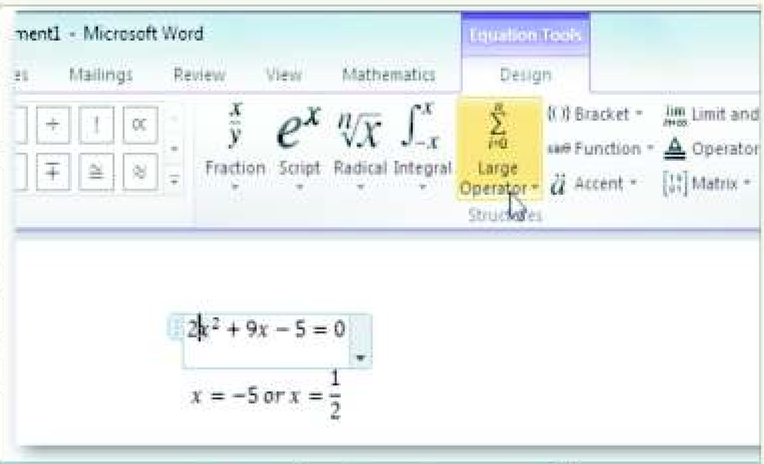

تصویر WD-6.8: ورڈ دستاویز میں حسابی مساوات جوڑنا

Insert New Equation آپشن پر کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر آپ کی دستاویز میں Type equation here کے نام سے الگ جگہ (تصویر WD-6.8) جڑ جائے گا، جہاں آپ مساوات ٹائپ کر سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی آپ کے ربن میں Equation Tools عنوان کے تحت ہونے والے متعدد آلات (Tools)، نشانات (Symbols) اور ڈھانچے (Structures) ہیں۔ ان سبھی بٹنوں کا استعمال آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے آپ دستاویز میں اپنی پسندیدہ مساوات جوڑ سکتے ہیں۔

(ii) خاص نشان جوڑنا (Inserting Special Symbols): کئی فونٹوں میں بہت سی ایسی علامتیں اور خاص نشان موجود ہوتے ہیں، جن کے لیے کی بورڈ پر کوئی کنجی نہیں ہوتی۔ اس کے لیے یا تو سمبل ڈائیلاگ باکس یا شارٹ کٹ کنجیوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر آپ کوئی خاص نشان یا علامت اپنے ٹیکسٹ میں ڈالنا چاہتے ہیں، تو 'Insert' ٹیب میں 'Symbol' بٹن پر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو کچھ عام نشان مل جائیں گے، جن پر کلک کر کے آپ نقطہ شمول کی جگہ پر جوڑ سکتے ہیں۔ اگر مطلوبہ نشان اس فہرست میں نہیں ہے، تو More Symbols پر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر WD-6.9 کی طرح سمبل کا ڈائیلاگ باکس حاصل ہوگا۔

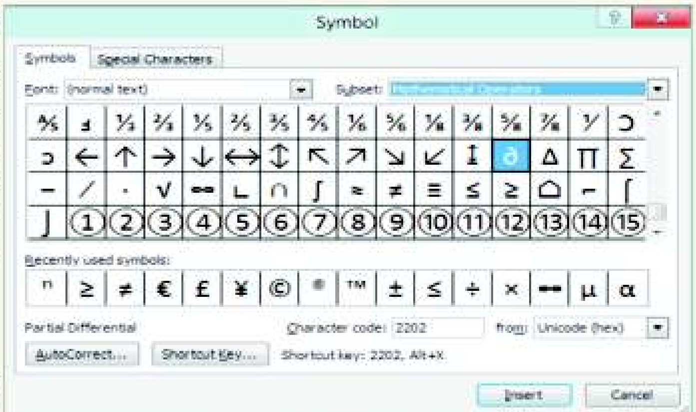

تصویر WD-6.9: سمبل ڈائیلاگ باکس کی 'سمبل' ٹیب شیٹ

اس ڈائیلاگ باکس میں دو ٹیب شیٹ ہوتی ہیں، جن میں سے سمبل ٹیب شیٹ تصویر WD-6.9 میں دکھائی گئی ہے۔ اس ٹیب شیٹ میں 'Font' کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں سے آپ کوئی بھی فونٹ چن سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ مقبول نشانات 'Windings' اور 'Webdings' میں دستیاب ہوتے ہیں، جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ اس میں آپ کے ذریعے چنے ہوئے فونٹ میں موجود سبھی علامت یا نشان دکھائے جاتے ہیں۔ فونٹ بدل کر آپ دوسرے دستیاب نشانات کو دیکھ سکتے ہیں۔ Subset کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں آپ مخصوص نشانات، جیسے رموز اوقاف کے خاص نشانات (General Punctuation Symbols)، کرنسی کے نشانات (Currency Symbols) وغیرہ چن سکتے ہیں۔ آپ جس نشان کو اپنے ٹیکسٹ میں شامل کرنا چاہتے ہیں، اسے کلک کیجیے۔ اس کو ٹیکسٹ میں لے جانے کے لیے 'Insert' بٹن کو کلک کیجیے یا انٹر دبایئے۔ آپ نشان کو ڈبل کلک کر کے سیدھے بھی ٹیکسٹ میں جوڑ سکتے ہیں۔

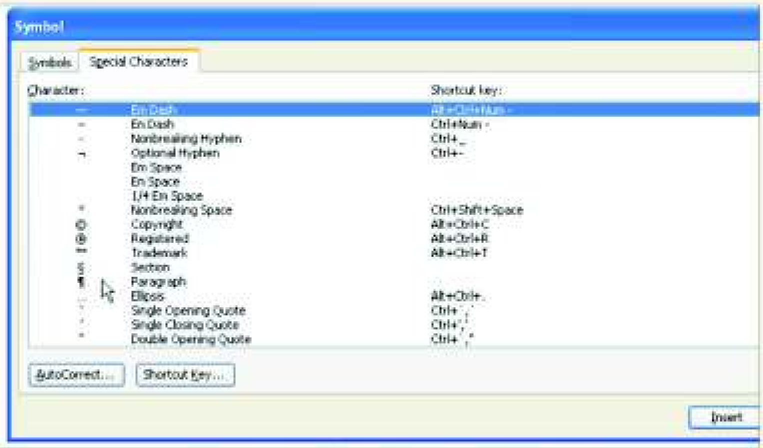

تصویر WD-6.9: سمبل ڈائیلاگ باکس کی 'سمبل' ٹیب شیٹ

اسی ڈائیلاگ باکس کی 'Special Characters' ٹیب شیٹ میں بہت سے خاص نشانات کی فہرست اور ان کی شارٹ کٹ کنجی دی جاتی ہے جیسا کہ تصویر WD-6.10 میں دکھایا گیا ہے۔ اگر آپ کسی نشان کو ٹیکسٹ میں ڈالنا چاہتے ہیں، تو یا تو اسے اس ڈائیلاگ باکس میں چن کر 'Insert' بٹن کلک کیجیے یا انٹر دبایئے یا اس نشان کو ڈبل کلک کیجیے۔ ویسے اگر آپ اس خاص نشان کی شارٹ کٹ کنجی جانتے ہیں، تو اس ڈائیلاگ بکس میں آئے بغیر سیدھے کی بورڈ سے ہی اسے ٹائپ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، (...) Ellipse کی شارٹ کٹ کنجی Alt+Ctrl+. ہوتی ہے۔ لہٰذا، اس نشان کو ٹائپ کرنے کے لیے آپ کو یہ تینوں کنجیاں ایک ساتھ دبانی ہوں گی، یعنی آلٹ اور کنٹرول کنجی کو دبائے رکھ کر ڈاٹ (.) دبایئے۔ اسی طرح پیراگراف نشان ٹائپ کرنے کے لیے آلٹ کو دبائے رکھ کر 0182 ٹائپ کیجیے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

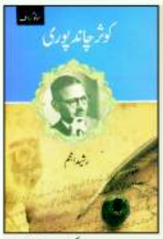

کوثر چاند پوری (مونوگراف)

مصنف: رشید انجم
صفحات: 150، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: امیر حمزہ K12، حاجی کالونی، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو زبان وادب کی یہ مٹھاس رہی ہے کہ اس نے سب سے زیادہ اطبا کو متاثر کیا ہے اس لیے جو پیشے سے طبیب ہوئے وہ ادب کے مریض بھی ہوئے۔ اگر سترہویں صدی سے طبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اکثر اطبا نے اردو زبان وادب میں کچھ نہ کچھ تعاون پیش کیا ہے اور یہی نہیں بلکہ طبیبوں نے اپنے مطب کو مشاعرہ گاہ اور ادبی اجلاس گاہ بھی بنایا۔ یہ سلسلہ اب تک کئی شہروں میں جاری ہے جہاں ماہانہ نشستوں میں طبیبوں کی نمائندگی مسلسل ہوتی رہتی ہے۔ کوثر صاحب کا بھی تعلق طبابت سے تھا اور آزادی کے بعد افسر الاطبا کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ کوثر صاحب کی پیدائش 1900 میں ہوئی، عمر کا اکثر حصہ بھوپال میں گزرا، ریٹائرمنٹ کے بعد 1962 میں دہلی منتقل ہوگئے، 13 جون 1990 کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

کوثر صاحب کی کل نوے سالہ زندگی میں ستر سالہ ادبی زندگی ہے جس میں انھوں نے نثری دنیا میں کمال حاصل کیا۔ ان کی ان ہی ستر سالہ ادبی زندگی کی خدمات، ذاتی حیات اور تخلیقی جہات کے تمام گوشوں کو اس مونوگراف میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف رشید انجم کی یہ کتاب چار بنیادی عناوین پر مشتمل ہے۔ شخصیت وسوانح، ادبی وتخلیقی سفر، تنقیدی محاکمہ اور جامع انتخاب۔ شخصیت و سوانح کو بہت ہی جامع اور معلومات سے پر پیش کیا گیا ہے جس میں حسب ونسب، خاندانی پیشہ اور موصوف کے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالی گئی ہے، کہ موصوف میں ادیبوں کی سی نزاکت اور طبیبوں جیسی لطافت تھی۔ اسی کے ذیل میں ابتدائی ادبی سفر کا ذکر بھی ہے کہ ادبی محفلوں میں شرکت کے باعث شاعری کی جانب ان کی طبیعت راغب ہوچکی تھی اور شعر گوئی میں شہرت بھوپال کی سرحدیں پار کرچکی تھیں۔ لیکن ادبی و تخلیقی سفر کے عنوان میں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ابھی وہ شعری سرمایہ اتنا بھی جمع نہیں کرسکے تھے کہ کوئی ایک شعری مجموعہ ہی منظر عام پر لایا جاسکے کہ نثری تخلیقات کی جانب مائل ہوگئے اور باضابطہ افسانوی دنیا میں ایک عہد گزارا۔ 1929 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'دلگداز افسانے' شائع ہوکر منظر عام پر آیا جس میں سولہ افسانے تھے جن میں سے چند افسانوں پر مصنف کی مختصر رائے بھی ہے۔ 1930 میں دوسرا افسانوی مجموعہ 'دنیا کی حور' شائع ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں پر مصنف کی کوئی زیادہ رائے نہیں ہے بلکہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ پچھلے افسانوں سے یہ افسانے کافی بہتر ہیں، اول میں نیاز فتح پوری کا عکس ہے تو دوسرے میں پریم چند کی طرح حقیقت پسندی کی جانب مائل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے دیگر سات افسانوی مجموعوں کا ذکر ہے۔ جن پر گفتگو جدا جدا نہیں کی گئی ہے بلکہ اجتماعی تاثر ان افسانوی مجموعوں پر پیش کیا گیا۔ اس کے بعد مصنف کوثر صاحب کے ناولوں کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک ناول کے ذکر کے ساتھ بہت ہی مختصر فنی اور موضوعاتی گفتگو بھی پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ''سب کی بیوی' کوثر صاحب کا وہ پہلا ناول ہے جسے ٹرننگ پوائنٹ کہا جاسکتا ہے''، ''اس ناول میں جنسیات پر ان کا قلم بے باک ہوا ہے''۔ دوسرے ناول 'اغوا' کے بارے میں لکھتے ہیں '' پلاٹ قدرے کمزور ہے۔ اس ناول میں کہیں کہیں واقعات میں روانی کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔'' اس کے بعد سات اور ناولوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے مصنف 'مرجھائی کلیاں' کوثر صاحب کا اہم ناول مانتے ہیں اور 'پتھر کے گلاب' کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کو شاہکار ناول کہا جاسکتا ہے۔ 'محبت اور سلطنت' میں کوثر صاحب کو ایک اعلیٰ اور منجھے ہوئے فنکار کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ کوثر چاند پوری نے رپورتاژ نگاری میں بھی قدم رکھا تھا اور 'کارواں ہمارا'، 'سفر ارض غزل' جیسے رپورتاژ لکھے۔'' کوثر صاحب نے بچوں کے لیے بھی خوب لکھا اور بھوپال کے ادب اطفال کی تاریخ میں وہ واحد شخص نظر آتے ہیں جس نے بچوں کے لیے پچیس کتابیں (نثر میں) لکھیں جن کا ذکر مصنف نے اس مونوگراف میں بہت ہی مختصراً کیا ہے۔ کوثر صاحب کی تنقید نگاری پر لکھی گئی چار کتابوں 'دیدۂ بینا'، 'جہانِ غالب'، 'فکر وشعور' اور 'دانش وبینش' کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ کوثر صاحب فکر تونسوی کے ہم عصر تھے اور ان سے مراسم بھی تھے جس کا ذکر اس کتاب میں بھی ہے، صرف مراسم ہی نہیں تھے بلکہ ان کے فن طنز ومزاح سے بھی وہ مراسم رکھتے تھے جس پر ان کی پانچ کتابیں 'مسکراہٹیں'، 'موج کوثر'، 'شیخ جی'، 'نوک جھونک' اور 'خندہ دل' منظر عام پر آئیں جس پر مصنف نے کچھ طنزیہ ومزاحیہ تحریر کے نمونے پیش کیے ہیں اور ان پر مختصر

تجزیہ بھی ہے۔ سوانح نگاری پر بھی چار کتابیں 'بیرم خاں ترکمان'، 'اطبائے عہد مغلیہ'، 'حکیم اجمل خاں' اور 'جام جم' ہیں جن کا ذکر دیگر کتب کے مقابلے قدرے تفصیل سے ہوا ہے۔ اس کے بعد کوثر صاحب کی دیگر خدمات کا ذکر ہوا ہے اور جامع انتخاب بھی ہے جیسا کہ ہر مونوگراف میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کو مصنف نے جس محنت اور تگ و دو کے بعد پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اصناف سخن کی تعریف و ارتقا پر گفتگو کی ہے اگر اس کو حذف کر کے موصوف کی تخلیقات کے فن پر مزید گفتگو ہو جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ تاہم یہ کونسل کی اہم اور عمدہ پیش کش ہے۔

ملاقاتیں (مشاہیر کے انٹرویو)

ترتیب : پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات : 578، قیمت : 241 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی
مبصر : ڈاکٹر شفیع ایوب، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

'ملاقاتیں' مشاہیر کے انٹرویو کا مجموعہ ہے۔ انٹرویو معلومات کی حصولیابی کا ایک موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ دو انسانوں کے مابین ہونے والی گفتگو، جس میں ایک سوال کرتا ہے اور دوسرا ان استفسارات پر اظہار خیال کرتا ہے۔ انٹرویو سے صرف معلومات کا حصول ہی مقصود نہیں ہے بلکہ جس شخصیت کا انتخاب انٹرویو کے لیے کیا گیا ہے اس کے خیالات اور افکار سے بہتر واقفیت بھی انٹرویو ہی ہے۔ کسی بھی بڑی، اہم اور عظیم شخصیت کے بارے میں ہم بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ بڑی شخصیات سے وابستہ چھوٹی باتوں میں بھی ایک تجسس ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک عام قاری کسی بڑی شخصیت پر لکھا طویل مضمون پڑھنے کے بجائے انٹرویو پڑھنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'ملاقاتیں' کے مرتب پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے انٹرویو اور انٹرویو کے فن پر ایک بھرپور دیباچہ لکھ کر اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ مشاہیر کے انٹرویوز کے کئی مجموعے بازار میں دستیاب ہیں، لیکن ان میں زیادہ تر کتابیں کسی ایک ہی میدان سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے لیے گئے انٹرویوز پر مبنی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'ملاقاتیں' کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ شخصیات اور موضوعات کا ایسا تنوع اور ایسی رنگا رنگی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ یقیناً اس سے فاضل مرتب کی کشادہ ذہنی اور وسعت فکر و نظر کا پتہ چلتا ہے۔ فکشن، شاعری، ڈراما، تحقیق، لسانیات، صحافت، ترجمہ اور تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کے انٹرویوز اس کتاب میں شامل ہیں۔

فکشن کی دنیا سے تعلق رکھنے والی پچیس شخصیات سے کی گئی گفتگو اس کتاب میں شامل ہے۔ ان میں کرشن چندر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ساتھ امرتا پریتم جیسی شخصیت بھی شامل ہیں۔ ان ممتاز فکشن نگاروں کے ساتھ فکشن کے موجودہ منظر نامہ سے سلام بن رزاق، شوکت حیات، غضنفر اور عبدالصمد جیسے اہم نام بھی شامل ہیں۔ اس فہرست میں جوگندر پال، انتظار حسین، عابد سہیل، وریندر پٹواری، اقبال مجید، کملیشور، قاضی عبدالستار اور رتن سنگھ جیسے افسانہ نگاروں کے نام بھی ہیں۔ صرف یہی حصہ اس قدر وقیع ہے کہ قارئین کی دلچسپی کا تمام تر مواد یہیں مل جائے گا۔

ڈراما کے باب میں حبیب تنویر جیسے باکمال ڈراما نگار سے لیا گیا دلچسپ انٹرویو کتاب میں شامل ہے۔ باب تنقید میں پروفیسر محمد حسن، وہاب اشرفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور سلیم اختر موجود ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ان اعلیٰ پائے کے ناقدین ادب سے ان لوگوں نے گفتگو کی ہے جو نہ صرف ان ناقدین اور ان کے علمی کارناموں سے واقف تھے بلکہ ماضی اور حال کے تنقیدی منظر نامے پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر وہاب اشرفی سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے گفتگو کی ہے، جو پٹنہ میں موجود ہیں اور وہاب اشرفی کی علمی و ادبی فتوحات سے بھرپور واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن سے جمالیات اور جمالیاتی تنقید پر گہری نظر رکھنے والے حقانی القاسمی نے انٹرویو لیا ہے۔ عہد حاضر میں اپنی دانشوری اور تخلیقی تنقید کے لیے ممتاز و منفرد مقام کے حامل نقاد پروفیسر عتیق اللہ سے نوجوان صحافی و اسکالر ڈاکٹر عبدالحی نے گفتگو کی ہے۔

لسانیات ایک ایسا شعبہ ہے جسے ہم اردو والے اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جبکہ امریکہ اور یوروپی ممالک میں لسانیات پڑھنے پڑھانے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ اور پروفیسر علی رفاد فتیحی جیسے ماہرین لسانیات سے لیا گیا انٹرویو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ تحقیق کے میدان سے خلیق انجم اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ترجمہ کی دنیا سے ساجدہ زیدی اور بیدار بخت، طنز و مزاح سے شہنشاہ طنز و مزاح مجتبیٰ حسین، صحافت کے میدان سے سنتوش بھارتیہ، تعلیم کے میدان سے پروفیسر مشیر الحسن، سید حامد اور پروفیسر یشپال سے لیے گئے انٹرویوز اس کتاب میں شامل ہیں۔

شاعری کے باب میں شہریار، مغنی تبسم، احمد فراز، کلیم عاجز، مظہر امام، زبیر رضوی، علقمہ شبلی اور مظفر حنفی جیسے صف اوّل کے شعرا سے گفتگو شامل کتاب ہے۔ یہ تمام شعرا عوام و خواص میں یکساں مقبولیت کے حامل ہیں۔ ان کے شعری تجربات کے بارے میں، ہم عصروں سے چشمک کے بارے میں اور ذاتی زندگی کے کچھ اہم پہلوؤں کے بارے میں ہر خاص و عام جاننا چاہتا ہے۔ ایسے میں ان انٹرویوز کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

متفرقات کے عنوان سے بھی کل سات لوگوں کے انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں اپنا بھ گھوش جیسے ناسا کے سائنسداں، ماہر تعلیم و ماہر دینیات پروفیسر اختر الواسع اور فلمی دنیا سے فلم اسٹار دیو آنند وا ے کے ہنگل جیسی شخصیات شامل ہیں۔ ساڑھے پانچ سو سے زیادہ صفحات پر محیط یہ کتاب دلچسپ معلومات کا خزانہ ہے۔ نہ صرف اسکالرس کے لیے بلکہ عام قاری کے ذوق مطالعہ کے لیے بھی یہ کتاب ایک عمدہ تحفہ ہے۔ ■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

ابوالفضل صدیقی کا افسانوی ادب

مصنف: ڈاکٹر سید ظفر امام
صفحات: 200، قیمت: 300 روپے (مجلد)، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: عبداللہ ظہور

زیر تبصرہ کتاب 'ابوالفضل صدیقی کا افسانوی ادب' دراصل ظفر امام کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس پر ان کو 1995 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند ملی اور تقریباً 22/سال کی مدت کے بعد اس مقالے کو بطور بصورت منظر عام پر لایا گیا۔ چونکہ ظفر امام اپنی پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد فوراً کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے اس لیے ان کو خود ذاتی طور پر اس مقالہ سے بہت کم دلچسپی تھی بلکہ یوں کہیے کہ اس کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا تھا لیکن ان کے دوستوں کی دلی خواہش تھی کہ اس وقیع ادبی خدمت کو منظر عام پر لایا جائے۔ چنانچہ ظفر امام کے نہایت ہی قریبی مصاحب ڈاکٹر امتیاز نے اس کو شائع کرانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی نتیجتاً 2018 میں اس کی اشاعت پہلی بار عمل میں آئی۔

بنیادی طور سے یہ کتاب بشمول اختتامیہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ابوالفضل صدیقی کی حیات و خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے' دوسرے باب میں ان کی بکھری پڑی تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے' تیسرے باب میں افسانے کے فن پر تنقیدی بحث کی گئی ہے اور ان کے نمائندہ افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے' اسی طرح چوتھے باب میں ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور آخری باب میں خاکہ نگار کی حیثیت سے ابوالفضل صدیقی کی شخصیت کا تعین کیا گیا ہے۔

یہ کتاب دیگر کتابوں کے مقابلے میں اس طور پر منفرد ہے کہ اس میں مصنف نے نہ صرف تحقیق کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پوری امانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے مواد میں کسی طرح کا کوئی ایسا موقع نہیں دیا کہ جو شکوک وشبہات کے دروازے وا کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کی انھوں نے اس درمیان میں جن جگہوں کے بھی اسفار کیے ہیں ان کو من وعن بیان کر دیا ہے۔ پاکستان کے سفر کو بہت ہی دلکشی کے ساتھ بیان کیا ہے چونکہ وہ جگہ موضوع سے مناسبت رکھتی ہے انھوں نے وہاں مقیم ہو کر تمام شبہات کا ازالہ کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ افسانے سے متعلق ہے اس باب کی ابتدا میں افسانے کے فن سے بحث کی گئی ہے نیز اس فن سے متعلق چند سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ ان بنیادی تنقیدی نقوش کے مقابلے میں فرمان فتح پوری، شمیم احمد، جمیل جالبی جیسی عبقری شخصیات کے خیالات بونے معلوم ہوتے ہیں۔ ظفر امام نے مرزا ادیب کے بارے میں کہا ہے ''کہ وہ واحد ایسی شخصیت ہے جس نے ابوالفضل صدیقی صاحب کے افسانوں میں ایک نئی تکنیک اور فن کی بازیافت کی ہے''۔

کتاب میں ناول کے تجزیاتی مطالعے کو بھی شامل کیا ہے، اس حصے میں بنیادی طور سے دو ناولوں (تعزیر اور ترنگ) کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ابوالفضل صدیقی کے ناولوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ ان کے صرف دو ہی ناولوں کا تجزیہ کیا گیا ہے؟..... اس اشکال کے حل کی جستجو جب بڑھتی گئی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ان دو ناولوں میں دو مخالف اقوام (ہندو اور مسلم) کے معاشرہ اور ان کی بود و باش کو اس فنکارانہ حکمت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جو قوم حق گو ہے اس کو ناحق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور جو قوم اپنے اعمال و افعال سے ناحق ہے اس کو حق پر ثابت قدم دکھانے کی لاحاصل جدوجہد کی گئی ہے۔

کتاب کا آخری حصہ ابوالفضل صدیقی کی خاکہ نگاری سے متعلق ہے۔ ابتدا میں ظفر امام نے چند خاکہ نگاروں کے خاکوں کو جگہ دی ہے۔ جن کی بطور صنف' اہمیت اس لیے بھی ہے کی ان خاکوں میں افسانوی عناصر واضح طور سے پائے جاتے ہیں نیز ان خاکوں کی انفرادیت اس لیے بھی ہے کہ مذکورہ خاکوں میں سوانحی پہلو شد و مد کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مصنف نے چند خاکوں کا تذکرہ کیا ہے جو کچھ اس طرح ہیں..... سلطان حیدر جوش کا خاکہ 'پہلی کرسی'، 'من انداز قدرت رامی شناشم' کے عنوان سے ضیاء جالندھری کا خاکہ اور جمیل جالبی کا 'من وتو' کے عنوان سے لکھا ہے۔

بطور خلاصہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظفر امام نے کتاب کو پانچ حصوں میں منقسم ضرور کیا ہے۔ اگر ان تمام حصوں کا غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ابتدائی دو حصے آخر کے تین حصوں پر ہر اعتبار سے فوقیت کے حامل ہیں کیونکہ ابتدائی دو حصوں میں مصنف نے تحقیق و تدوین کو جس تندہی کے ساتھ انجام کار تک پہنچایا ہے اس کا عشر عشیر بھی بعد کے حصوں میں نہیں پایا جاتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ زیر تبصرہ کتاب اپنے آپ میں ارمغان کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ ہمارے ملک میں پاکستانی ادباء پر جس قدر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے وہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ جہاں تک کتاب کی ظاہری ساخت کا سوال تو اس کا ٹائٹل دلکش اور عمدہ ہے نیز عبارت خوانی کے دوران قاری کو کسی قسم کی دقت درپیش نہیں ہوتی ہے۔

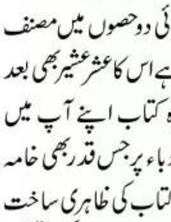

افسانوی ادب اور حیات اللّٰہ انصاری

مرتب: محمد اویس سنبھلی
صفحات: 208، قیمت: 299 روپے
ناشر: احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن ٹرسٹ، لکھنؤ
مبصر: گلشن جہاں، ریسرچ اسکالر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میرے پیش نظر محمد اویس سنبھلی کی مرتبہ کتاب 'افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری' ہے۔ یہ کتاب ان کے افسانوی ادب کی متعدد فکری و فنی خوبیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب کے مرتب اور محبّ اردو محمد اویس سنبھلی ایک باشعور قلم کار اور نوجوان ادیب ہیں۔ انھوں نے جس محنت اور توجہ کے ساتھ یہ کتاب ترتیب دی ہے وہ ان کے اعلی ادبی شعور کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے قلم سے 'اعتراف سعادت' 'بجھے دیوں کی قطار' 'قلم کا سپاہی حفیظ نعمانی' اور 'باغ سنبھلی کی شعری کائنات' جیسی اہم کتابیں نکل چکی ہیں۔ شائقین ادب نے ان کاوشوں کو سراہا ہے۔ امید ہے یہ کتاب بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

لکھنؤ حیات اللہ انصاری کا وطن عزیز رہا ہے گویا ان کی برسی کے موقع پر خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ان کی علمی و ادبی خدمات کا بھی اعتراف کیا جاتا ہے۔ گزشتہ برس احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد سمینار کا عنوان 'افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری' منتخب کیا گیا تھا۔ یہ کتاب اسی سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ بلاشبہ حیات اللہ انصاری کا شمار بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے لیکن عمومی طور پر افسانوی ادب میں ان کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اول تو ان پر سمینار یا مذاکروں کا اس طرح اہتمام نہیں کیا گیا جیسا کہ ان کا حق تھا۔ اور اگر منعقد بھی ہوئے تو ان کو وہیں کہہ سن کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ محمد اویس سنبھلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حیات اللہ انصاری کی علمی و ادبی خدمات کا ادراک رکھتے ہوئے اس اہم موضوع کا انتخاب کیا اور حیات اللہ انصاری کے فکشن کے حوالے

سے تجزیاتی مواد کی تشنگی کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کی، جو قابل ستائش ہے۔

زیرہ تبصرہ کتاب حیات اللہ انصاری کے تخلیق کردہ فکشن کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔

کتاب کا آغاز مرتب محمد اویس سنبھلی کے پیش لفظ صفحہ 7 سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے مرتب نے کتاب کی ترتیب وتشکیل کا مفصل تعارف کرادیا ہے۔ جس سے کتاب کو سمجھنے اور مستفید ہونے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اویس سنبھلی کے پیش لفظ کے بعد پروفیسر صغیر افراہیم کا جامع مقدمہ درج ہے جو انھوں نے صدارتی خطبے کی شکل میں سمینار میں پیش کیا تھا۔ اس مضمون میں سمینار میں پڑھے گئے مقالات پر تبصرہ بے حد خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے، جس کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں سمینار کی تمام سرگرمیوں کا نقشہ ابھر آتا ہے۔

مقالوں کا سلسلہ مشہور نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی سے شروع ہوتا ہے، جس میں انھوں نے عالمانہ بصیرت کے ساتھ' حیات اللہ انصاری اور ان کے چند افسانے' کے عنوان سے ان کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ داستان اور فکشن کے حوالے سے پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ گویا ان کا مضمون 'حیات اللہ انصاری کا افسانوی ادب: فکر وفن کے بعض گوشے' حیات اللہ انصاری کے ناولوں کے موضوعات، لکھنوی تہذیب، زبان و بیان اور ان کے کرداروں کو سمجھنے میں کافی مدد کرتا ہے۔ اردو کے بلند پایہ افسانہ نگار نیر مسعود کے مضمون 'لہو کے پھول' کی شمولیت سے کتاب کی ادبی حیثیت مسلم ہوگئی ہے۔ رفعت ملک نے' حیات اللہ انصاری کی افسانہ نگاری' پر قلم اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے 'اردو افسانہ اور حیات اللہ انصاری' پر مضمون قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے' حیات اللہ انصاری کے افسانے انسانی زندگی کے عکاس' کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر ثوبان سعید نے افسانہ ماں بیٹا کا کامیاب تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے حیات اللہ انصاری کے مشہور زمانہ افسانے' آخری کوشش' کے تجزیہ میں فنی پرکھ سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید کا مضمون 'لہو کے پھول کی ادبی وسماجی معنویت' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر یوسف وانی اور ڈاکٹر شاہنواز فیاض نے حیات اللہ انصاری کے ناول 'مدار' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ مضمون 'شکستہ کنگورے ایک مطالعہ' پڑھنے کے بعد یوں لگا کہ ایک تخلیق کار دوسرے فن کار کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ راشد خاں ندوی، عزہ معین، حمیرا عالیہ، اطہر حسین، محمد راشد، موسیٰ رضا، شاہد حبیب کے تجزیاتی مقالے خاصے اہم ہیں۔ کتاب کے آخر میں حیات اللہ انصاری کی جامع سوانح شامل کی گئی ہے، جو ڈاکٹر انوار احمد کی کتاب اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ سے ماخوذ ہے۔

اظہار نظر

مصنف : فیضان حیدر

صفحات: 200، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ثمرین، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر نظر مجموعہ بعنوان' اظہار نظر' فیضان حیدر کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں پندرہ مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین ادب کے علیحدہ علیحدہ موضوعات سے سروکار رکھتے ہیں جس میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادب سے متعلق موضوعات بھی شامل ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین 'سفرنامہ اور اس کا فن'، 'سفرنامہ نگاری کا آغاز اور تاریخی ارتقا'، 'فارسی میں سفرنامہ نگاری۔ ایک جائزہ'، 'پروین اعتصامی۔ شخصیت اور شعری جہات'، 'کیلاش نرائن کول بیدل دہلوی۔ شخصیت اور شاعری'، 'رباعیاتِ خیام کی تدوین اور محققین کے نظریات'، 'رباعیاتِ خیام کے فکری اور فنی محاسن'، 'فانی گورکھپوری۔ شخصیت اور شاعری'، 'مولانا شوکت علی اور تحریکِ آزادیِ ہند'، 'میری ایران یاترا۔ ایک تعارف'، 'سخنورانِ اعظم گڑھ ایک مطالعہ'، 'انبساطِ فکر۔ ایک جائزہ'، 'نارنگ ساقی ایک ہمہ جہت شخصیت'، 'مشورہ اور اس کی اہمیت' اور 'خاموشی اور اس کے فوائد' الگ الگ موضوعات سے متعلق اہم مضامین شامل کتاب ہیں جن کے مطالعے سے فیضان حیدر کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

'سفرنامہ اور اس کا فن' میں سفرنامہ کے معنی ومطالب مختلف لغات کی روشنی میں بیان کیے ہیں جو تحقیقی نوعیت سے پُر ہیں۔ اس میں سفرنامہ کی اہمیت وافادیت کے علاوہ سفر کی اقسام کو بھی پیش کیا گیا ہے نیز سفرنامہ نگار کے لیے تین مراحل کو اہم بتایا ہے جو انتخابِ واقعہ، واقعات کی پیش کش اور زبان و بیان سے متعلق ہے۔ دوسرا مضمون بھی سفرنامہ ہی سے تعلق رکھتا ہے اس میں سفرنامہ نگاری کا تاریخی ارتقا اور آغاز پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور اہم سفرناموں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ زیرِ نظر مجموعے میں شامل تیسرا مضمون بھی فارسی میں سفرنامہ نگاری سے متعلق اہم مضمون ہے۔ جس سے ہمیں فارسی سیاحوں اور ان کے سفرناموں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ شخصیات کے ضمن میں کتاب میں شامل پانچ مضامین ہیں۔ پروین اعتصامی کا اصل نام رخشندہ اور پروین تخلص ہے۔ فارسی ادب کے دلدادہ ان کے نام سے بخوبی بہرہ ور ہیں۔ انھوں نے فارسی نظم کو نیا ذہن، خوش گوار آہنگ اور دلکشی بخشی ہے۔ فیضان حیدر کے مطابق ان کی نظموں میں جدید خیالات وکائنات کا شعور اور جذبات واحساسات کی پرچھائیاں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں ساتھ ہی ان کی شاعری کے اہم ستون قومیت، ملیت، حمیت اور دین داری ہے۔ اس کے علاوہ ایثار وقربانی کا جذبہ بھی ان کے یہاں واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ نظم کے علاوہ پروین نے قصائد، قطعات اور رباعیات بھی تخلیق کی ہیں جو فارسی ادب میں اضافہ کا سبب بنیں۔ شخصیت سے متعلق مضامین میں ایک اور مضمون کیلاش نرائن کول بیدل دہلوی کا ہے۔ اس میں بیدل کی شخصیت اور شاعری کو وسیلہ اظہار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے اردو وفارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی اور قابل قدر ڈرامے بھی تخلیق کیے۔ ساتھ ہی ایک اور مضمون جس میں فانی گورکھپوری کی شخصیت اور شاعری کو، فارسی شاعری کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضامین فارسی ادب سے ذوق رکھنے والے افراد کے لیے ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔

فارسی کے مشہور زمانہ شاعر عمر خیام کے حوالے سے زیرِ نظر کتاب میں دو مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ علی برادران اور خصوصی طور سے مولانا شوکت علی اور تحریکِ آزادی میں ان کے اہم کردار کو بھی کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

'میری ایران یاترا' پروفیسر سیّد حسن عباس کے ذریعے کیا گیا اردو ترجمہ ہے جو انھوں نے معروف غالب شناس مولوی مہیش پرشاد کے ہندی میں تحریر کردہ سفرنامہ سے کیا ہے۔ 'سخنورانِ اعظم گڑھ' سے متعلق مضمون میں متحدہ اعظم گڑھ، جس میں مئو اور اس کے مضافات بھی شامل ہیں، کے ان تمام شعرا کے سوانحی کوائف، اساتذہ، شاگرد وغیرہ کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے جن تک اس کتاب کے مولف مولانا قمر الزماں کی رسائی ہو سکی۔ 'انبساطِ فکر' پروفیسر محمد علی اثر کی کتاب کا تجزیہ بھی موصوف نے بخوبی کیا ہے۔

ایک مضمون 'مشورہ اور اس کی اہمیت' بھی کتاب میں ہے۔ اس مضمون میں مشورہ کی شرعی حیثیت احادیث کی روشنی میں پیش کی گئی ہے ساتھ ہی مشورے کے فوائد، خود رائی کے نقصانات، مشورے کے ارکان ثلاثہ اور مشیر کے فرائض کا ذکر بھی بحسن وخوبی کیا گیا ہے۔

میں اس کتاب کے لیے فیضان حیدر صاحب کو مبارک باد پیش کرتی ہوں جو ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ ستائش ہے کہ کتاب میں پروف کی غلطیاں نہ کے برابر ہیں۔ سرورق نہایت سادہ اور عمدہ ہے۔ کتاب کی قیمت بھی مناسب ہے۔ فارسی ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب زیادہ مفید ہے کیونکہ اس میں بیشتر مضامین فارسی ادب سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

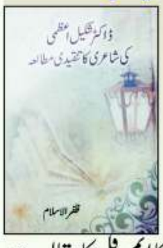

مصنف: ظفر الاسلام
صفحات: 143، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: محمد عامل بدایونی
64، آفتاب ہال، اے ایم یو، علی گڑھ، یوپی

'ڈاکٹر شکیل اعظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' ظفر الاسلام کا ایم۔فل کا مقالہ ہے، جو انھوں نے ڈاکٹر نشاط احمد کی نگرانی میں شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں 2017 میں تحریر کیا تھا۔ ظفر الاسلام ایم۔فل کے میرے ان ساتھیوں میں سے ہیں جن کے ساتھ میں علمی و ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتا تھا۔ میں ان کی ادبی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ کے کئی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ظفر الاسلام نے یہ بہتر کوشش کی ہے کہ انھوں نے کسی خاص اور مشہور موضوع پر قلم اٹھانے کے بجائے علاقائی موضوع کو تحقیق کے لیے منتخب کیا۔ یہ کتاب 143 صفحات کو محیط ہے۔ انتساب والدین کے نام ہے۔ 'پیش گفتار' میں پروفیسر مظفر علی شہ میری نے ظفر الاسلام کی علم دوستی اور شکیل اعظمی کی شاعری پر ناقدانہ گفتگو کی ہے۔ 'پیش لفظ' ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی نے لکھا ہے۔ 'ابتدائیہ' کے تحت مصنف نے علاقائی ادب کی اہمیت اور موضوع کے انتخاب کے بارے میں چند کلمات لکھے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب کو مصنف نے بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر شکیل اعظمی کی حیات اور شخصیت کے بارے میں لکھا ہے۔ مصنف نے حیات اور شخصیت کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ پورا نام شکیل احمد، تخلص شکیل اور قلمی نام شکیل اعظمی ہے۔ پیشے سے طبیب ہیں۔ 12 رستمبر 1942 کو گھوسی، ضلع مئو میں پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ شمس العلوم گھوسی سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور میں 1955 میں داخلہ لیا۔ 1959 میں فضیلت کی ڈگری لی۔ یونانی میڈیکل کالج الہ آباد سے 1964 میں ایف۔ایم۔بی۔ایس۔ کی ڈگری حاصل کی۔ شعر و شاعری سے دلچسپی بچپن سے تھی۔ ابتدا میں مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے بہ ذریعہ ڈاک اصلاح لینے لگے۔ اثر لکھنوی کے انتقال کے بعد نشور واحدی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ نگار، آجکل، پاسبان، جام کوثر، تجلی اور زندگی جیسے اہم رسائل میں مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مصنف نے شکیل اعظمی کی اردو ادب میں کیا خدمات ہیں اس کا مفصل جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے شکیل اعظمی کی ان تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔ 'گل قدس' نعتیہ مجموعہ ہے۔ 'حرف ثنا' منقبتوں کا مجموعہ ہے۔ 'آشوب آگہی' غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ 'شعور نظر' علمی، ادبی، تنقیدی، دینی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ شکیل اعظمی کی شخصیت سے متعلق مصنف نے تحقیق کی روشنی میں بے حد دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ انھوں نے شکیل اعظمی کے خد و خال، عادات و اطوار اور غذا وغیرہ کا بڑی خوش اسلوبی سے ذکر کیا ہے۔

دوسرے حصے میں شکیل اعظمی کے معاصر شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں فضا ابن فیضی، اثر انصاری، علامہ بدر القادری، مولانا سیف الدین، نثار کریمی، اقبال اعظمی، مضطر اعظمی، علی حسن گلشن، ڈاکٹر منور انجم، وہمی رحمانی، سردار شفیق، ناصر انصاری اور ماہر انصاری کو شامل کیا ہے۔ معاصر شعرا میں انھوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ شاعر کے حالات اور شعری مجموعوں کے بارے میں مختصراً ذکر کیا ہے اور نمونۂ کلام کے طور پر چند اشعار درج ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان معاصر شعرا اور شکیل اعظمی کی شاعری میں موضوعات اور شعریات کا فرق واضح کرتے۔ جس سے کہ شکیل اعظمی کی اہمیت معاصر شعرا میں اور زیادہ واضح ہو جاتی۔

تیسرے حصے میں مصنف نے شکیل اعظمی کی نعت گوئی، منقبت نگاری، نظم نگاری اور غزل گوئی کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس حصے میں انھوں نے بڑی دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے، جس کا اندازہ کتاب کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اردو میں نعت گوئی کا موضوع بے حد دلچسپ رہا ہے۔ نعت گوئی میں حضور نبی کریمؐ کے اوصاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نعت گوئی کے تمام موضوعات کو مصنف نے شکیل اعظمی کی شاعری میں تلاش کر کے، ان پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مثلاً حضور نبی کریمؐ کے لبہائے مبارک، رخسار، چہرۂ انور، مدینہ کا ذکر اور روضہ مبارک کا ذکر وغیرہ۔ مصنف نے شاعر کی منقبتوں کو تلاش کر کے ان پر مدلل تحقیق کی ہے۔ شکیل اعظمی نے حضور غوث اعظم، حافظ ملت، اعلیٰ حضرت، صدر الشریعہ اور مفتی شریف الحق وغیرہ کی شان میں منقبتیں لکھی ہیں۔

مصنف نے شکیل اعظمی کی غزلیہ شاعری کے بارے میں بڑی مدلل اور ناقدانہ گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ایک ایک شعر کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے موضوعات کا تعین کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ شکیل اعظمی کی شاعری میں کلاسیکی غزل کی شعریات اور جدیدیت دونوں کا اثر پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک طرف تو حسن و عشق اور ہجر و وصال کی باتیں ہیں تو دوسری طرف تہذیب کی شکست و ریخت، رشتوں کی بے قدری، آرزوؤں کی پامالی، زندگی کی مایوسی، زمانہ کی بے ثباتی اور وطن سے محبت کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیں:

جفاؤں کا بھی کچھ ہونا ضروری ہے   تجھے دیکھا، تجھے چاہا، تجھے سوچا، بجا لیکن
رہو خلوص و محبت کی آبرو بن کر   وقار اپنے وطن کا کبھی نہ کھونے دو

نظموں میں 'جشن غالب'، 'علم'، 'آگاہی' اور 'نوائے غم' کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ شکیل اعظمی کی زبان کے تعلق سے بھی اہم باتوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی زبان عام فہم اور آسان ہے۔ کتاب کے آخر میں شکیل اعظمی کا 'انٹرویو' ہے جو 27 رمارچ 2017 کو لیا گیا تھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب اردو ادب کے ذخیرے میں مفید ثابت ہوگی۔

خودنوشت

یادوں کا جشن

مصنف: کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
ترتیب و تدوین: کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی۔
مبصر: سنتوش کمار، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی 07

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ 19 ویں اور بیسویں صدی ہندوستان کی عظیم شخصیتوں کی صدی رہی۔ جن میں پریم چند، کرشن چندر، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر محمد اقبال، ملک راج آنند، نذیر احمد اور خواجہ احمد عباس وغیرہ بہت سی شخصیتوں نے

جنم لیا اور اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان سے متعلق بہت ایسی شخصیات (ادبا و شعرا) کے نام ہیں جن کا ذکر کرنا یا لکھنا یہاں پر مشکل ہے۔ اس لیے دیگر ادبا و شعرا نے بھی اتنی ہی اردو ادب میں خدمات انجام دی ہیں جتنی کہ دیگر نے کی ہیں۔ ان میں ایک نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا ہے۔ یہ اس مقام پر نظر آتے ہیں جہاں پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ مگر اپنے ہی کاموں سے جانے پہچانے جانے والے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام اردو ادب میں روشن ہے۔ یہ راجندر سنگھ بیدی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

کچھ لوگ بڑے گھر میں پیدا ہوتے ہیں تو کچھ اپنی محنت، کوشش اور کاوش سے بڑے بنتے ہیں۔ کنور صاحب بڑے گھر میں ضرور پیدا ہوئے مگر وہ اپنی تحریروں، اپنی ذاتی صلاحیتوں سے بڑے انسان بنے جن کا نام آج پوری دنیا میں ہر ادیب، ہر طالب علم ضرور جانتا ہے۔ دنیا نے انھیں بڑا انسان نہیں بنایا بلکہ بڑا ہونے کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ دہلی کی تہذیب میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایک اعلیٰ درجہ کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی کہ صاف لفظوں میں کہا جائے تو وہ دہلی تہذیب کی جان وشان تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ اپنی ادب نوازی کے لیے مشہور تھے۔ خاص طور پر اپنی شاعری کا موضوع دیش بھگتی (قومی یکجہتی) کو بناتے ہیں۔

کنور مہندر سنگھ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مرکزی حکومت کی ملازمت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

کنور مہندر کی ہندوستان پاکستان کی متعدد برگزیدہ اور صفِ اول کی شخصیتوں سے ملاقات ہوتی رہی۔ 'یادوں کا جشن' کا چوتھا ایڈیشن بک کارنر جہلم ملتان، پاکستان شائع کر چکا ہے۔ جو نہایت دیدہ زیب ہے۔ یہ پانچواں ایڈیشن عبدالصمد دہلوی مالک ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی نے کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کے سرپرستی میں شائع کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ ایڈیشن بھی ہندوستان پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں مقبول ہوگا۔ مشہور فن کار عابد علی خان 'یادوں کا جشن' کے بارے میں لکھتے ہیں:

'یادوں کا جشن' ایک اعلیٰ عہدیدار، ایک ادیب، ایک باغ و بہار شخصیت کے ایسے تاثرات ہیں جس سے مشترکہ تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔ اگرچہ یہ تہذیب اب کمزور ہو رہی ہے مگر کتاب بتلاتی ہے کہ اس تہذیب کی بقا کے لیے کنور صاحب نے اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا ہے اور اردو کے کام کو بڑی تقویت بخشی ہے۔''

زیرِ نظر کتاب 'یادوں کا جشن' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی نہایت دلچسپ خودنوشت سوانح عمری ہے جس کا پاکستان ایڈیشن کے اپیل نارنگ ساقی، تاثرات۔ جوش ملیح آبادی مرحوم، حرفِ چند سید شریف الحسن نقوی، پیش لفظ۔ کرنل بشیر حسن زیدی، ایک خوبصورت انسان۔ احمد فراز اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ مجتبیٰ حسین نے بڑے دلچسپ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انھیں ادبا کی مہربانی سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں کہ 'یادوں کا جشن' کنور صاحب کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس سوانح عمری میں ہندوستان پاکستان اور خاص طور پر دہلی کی ادبی، سماجی اور سیاسی زندگی پر بہت خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔''
اس کا پہلا ایڈیشن 1986 میں جشن کنور سنگھ بیدی کمیٹی کی جانب سے شائع ہوا اور رسم اجرا صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے پریسی ڈینٹ ہاؤس میں کیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ زیرِ نظر کتاب صحیح معنوں میں یادوں کا جشن ہے۔

کتاب 'یادوں کا جشن' کنور صاحب کی پوشیدہ حقیقت ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر مشغلے اور ہر تجربے دکھانے کی بھرپور کوشش ہے۔ یہ سوانح عمری دلی کی سماجی اور ادبی زندگی کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں بہت لوگ ایسے ہیں جو کنور سنگھ کی طرح زندگی نہیں بسر کر سکے۔ اعمال نامہ (سر رضا علی)، یادوں کی دنیا (ڈاکٹر یوسف حسین خاں)، کاغذی ہے پیرہن (عصمت چغتائی)، کارِ جہاں دراز ہے (قرۃ العین حیدر)، گرد راہ (اختر رائے پوری)، شہاب نامہ (قدرت اللہ شہاب)، سرگزشت (عبدالمجید سالک)، شام کی منڈیر سے (ڈاکٹر وزیر آغا)، عرضِ حال (مہاراجہ ہری کرشن پرشاد)، خواب باقی ہے (آل احمد سرور) اور زرگزشت (مشتاق احمد یوسفی) اور قصہ بے سمت زندگی کا (وہاب اشرفی) اردو کی نمائندہ کامیاب خودنوشت سوانح عمری ہیں۔ اسی کڑی میں 'یادوں کا جشن' بھی ان معیاروں پر پوری طرح کھری اترتی ہے۔

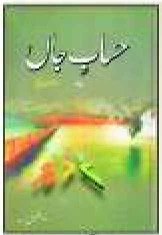

حساب جاں (خودنوشت سوانح)

مصنف و ناشر: ڈاکٹر شکیل احمد
صفحات: 192، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2018
تقسیم کار: مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن یوپی
مبصر: محمد عثمان احمد، نیو محلہ قاضی زادگان، چندپور، بجنور، یوپی

'حساب جاں' ڈاکٹر شکیل احمد کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ 'اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی' بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں مئو شہر ہنرواں، سمٹتا سائباں (سوانحی خاکے)، بادل چھاؤں (خاکے) نشاطِ قلم، اہلِ علم کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب خودنوشت سوانح ہے خودنوشت کے بارے میں ناقدین کی آرا ہے کہ یہ ایک بیانیہ اور نیم تخلیقی صنفِ ادب ہے اس لیے اس کی زبان تخلیقی و ادبی ہوتی ہے۔ خودنوشت سوانح نگار اپنی زندگی کے اہم واقعات کو جمع کرتا جاتا ہے اور ان کو تحریر کیے جاتا ہے۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنی زندگی کے سارے واقعات بتائے لیکن وہ اہم واقعات ضرور بتاتا ہے، بلکہ ایسے واقعات جو قارئین کو متاثر کریں۔ اہلِ علم کا ماننا ہے کہ خودنوشت سوانح نگار اس وقت خودنوشت تحریر کرے جب کہ وہ زندگی کا بیشتر حصہ جی چکا ہو، اس کی زندگی ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اب اس کی زندگی میں اہم واقعہ ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

زیرِ تبصرہ خودنوشت کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شکیل احمد ایک سنجیدہ اور ذمہ دار شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے اپنی خودنوشت میں اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں کیا کہ وہ شوخ اور چلبلے بھی رہے ہیں، کتاب کے مطابق ہمیشہ ان کی زندگی سنجیدہ معیاروں پر گزری ہے۔ دراصل یہ ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے روایتی تعلیم میں سب سے بڑی سند ڈاکٹریٹ کی مانی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد اردو میں ڈاکٹریٹ ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کبھی مستقل ملازمت نہ حاصل کر سکے، اس محرومی کا ذکر ہمیں بار بار ان کی خودنوشت میں ملتا ہے۔ ڈاکٹریٹ کے بعد مستقل ملازمت نہ ملنا اور گزر اوقات کے لیے اس طرح کے کام کرنا، جو معیاری نہ ہوں، اس طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنے والا شخص ڈاکٹر شکیل احمد جب اپنی داستان تحریر کرے گا تو اس میں ظاہر ہے کہ غم واندوہ اپنی خاصی جگہ بنائیں گے اور یہ وہ غم ہے جس سے ہر تعلیم یافتہ بے روزگار شخص واقف ہے۔ اپنے اس غم کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

پیہم شادمانیوں اور مسرتوں کے درمیان زخموں کا شمار عین فطری ہے۔ خوشیوں کے یادگار لمحات کی طرح بعض مایوسیوں کی معصوم سی کسک زندگی بھر ساتھ رہتی ہے، پی ایچ ڈی اور NET کر لینے کے بعد بھی ایسی باضابطہ ملازمت یا لکچرر شپ سے محرومی کی کسک جو مجھے فکرِ معاش سے یکسوئی عطا کر دیتی برسہا برس تک ذہنی بوجھ کی طرح پورے وجود پر مسلط رہی۔ زندگی کی چھ دہائیوں کی تکمیل کے ساتھ اس مایوسی کی ٹیس پھر بھی زائل نہ ہو سکی ملازمت کے متبادل کے طور پر مئوناتھ بھنجن جیسے صنعتی اور تجارتی شہر میں

اپنے لیے کوئی مختصر سی تجارتی اکائی نہ قائم کر سکنے کا زیادہ ملال اس لیے نہیں رہا کہ اس راہ میں ہاتھ پیر مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پھر بھی جب دولت کی دیوی روٹھی ہی رہی تو اس کی عدم دستیابی کا ملال بھی زیادہ نہیں ہوا۔

یہ وہ خواہش ہے جس کی عدم تکمیل کے سبب ساٹھ سال کی زندگی گزارنے کے باوجود بھی مصنف ایک طرح کی ٹیس محسوس کرتا ہے۔ حساب جاں میں ڈاکٹر شکیل احمد نے ذیلی عنوات قائم کیے ہیں یہ خودنوشت اس طرح ترتیب نہیں دی گئی کہ ایک کے بعد ایک واقعات رونما ہوتے جاتے ہیں بلکہ عنوانات کی مناسبت سے زندگی کے واقعات ترتیب دیے ہیں۔ جیسے میرے خواب عنوان میں مصنف کے کیا خواب تھے اس کا ذکر کیا ہے اور میرے زخم میں زندگی کی محرومیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

چونکہ خودنوشت نگار اپنی زندگی کا نقشہ خود اپنے قلم سے کھینچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خودنوشت نگار اپنی پوری زندگی کے احوال تو تحریر نہیں کرسکتا کیونکہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات ضرور تحریر کرے لیکن ڈاکٹر شکیل احمد کی خودنوشت میں زندگی کا ایک ہی رخ زیادہ نمایاں ہے وہ یہ کہ مصنف کا تعلیم حاصل کرنا اور تعلیم کے بعد جد و جہد اور مستقل ملازمت نہ ملنے کا غم، جبکہ خودنوشت کے ناقدین کا ماننا ہے کہ صاحب سوانح کی اپنی زندگی کے ہر دور کے نمائندہ واقعات ہوتے ہیں۔ اس کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے نیز اس کے عروج وزوال اور نشاط وغم کی داستان ہوتی ہے۔ 'حساب جاں' میں عروج وزوال کا ذکر تو ہے لیکن غم زیادہ اور نشاط کی کیفیت نا کے برابر ہے۔ یہاں تک کہ بچپن کے واقعات میں بھی تعلیم اور تعلیمی مشاغل کا ذکر ملتا ہے کہیں بھی ایک بچے والی شوخی نہیں ملتی۔ حالانکہ مصنف کا بچپن گاؤں کی زندگی پر مشتمل ہے لیکن کہیں بھی گاؤں کے بچوں کی طرح، کنچے، گلی ڈنڈا، کبڈی جیسے کھیلوں کا ذکر نہیں ملتا۔ ممکن ہے ان باتوں سے ان کو شغل نہ رہا ہو۔

ڈاکٹر شکیل احمد کی خودنوشت حساب جاں کا اسلوب عمدہ ہے۔ مصنف نے سادگی، سلاست اور اختصار سے کام لیا ہے۔ بول چال کی زبان کے ساتھ ادبی وتخلیقی زبان کا دلکش امتزاج رکھا ہے۔ دلچسپی کا عنصر کم ہوتے ہوئے بھی خودنوشت اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر شکیل احمد کی خودنوشت قارئین کو متاثر کرے گی۔

فکشن

ورق ورق کھانی کائنات (اردو افسانے کا تانیثی چہرہ)

نام مرتبہ: ڈاکٹر عشرت ناہید
صفحات: جلد اول، 376، جلد دوم، 400
قیمت: جلد اول، 500، جلد دوم، 238
اشاعت: جلد اوّل، 2018، جلد دوم: 2019
ناشر: جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، جلد دوم، کتابی دنیا دہلی
مبصر: محمد شفیق علیگ مانو لکھنؤ کیمپس

اردو ادب کا یہ حقیقی واقعہ ہے کہ تمام اصناف ادب میں خواہ وہ شعری ہوں، افسانوی ہوں یا پھر غیر افسانوی، خواتین کی آمد دیر سے ہوئی۔ صرف افسانے کے تعلق سے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس صنف میں خواتین کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ دور اول سے ہی مرد افسانہ نگاروں کے شانہ بہ شانہ نظر آتی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خواتین نے تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ جس میدان میں طبع آزمائی کی ہے وہ افسانہ ہی ہے۔

خواتین کے افسانوں کے انتخاب وترتیب کے سلسلے میں ابتدائی اور قابل ذکر کوشش خوشباب صاحب کی ہے، انھوں نے 1951 میں ہندوستان کی مقبول اداکاراؤں کے تیرہ افسانوں کا انتخاب 'افسانہ لکھ رہی ہوں' کے نام سے شائع کیا۔

اس سلسلے کی دوسری قابل تحسین کاوش کشور ناہید صاحبہ کی ہے، انھوں نے 1930 سے لے کر 1990 تک کی خواتین افسانہ نگاروں کے 23، نمائندہ افسانوں کا انتخاب 'خواتین افسانہ نگار' کے نام سے 1996 میں شائع کرایا۔

کشور ناہید کے بعد اکیسویں صدی میں اس سلسلے کو بہترین انداز میں آگے بڑھانے کا کام زیر تبصرہ کتاب 'ورق ورق کہانی کائنات' کی مرتبہ ڈاکٹر عشرت ناہید صاحبہ کا ہے، یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

تبصرہ بر جلد اول: اس کتاب پر اگرچہ کسی وجہ سے پہلی جلد مرقوم نہیں ہے مگر یہ پہلی جلد ہی ہے کیونکہ اس کے بعد جو کتاب میرے پیش نظر ہے اس پر جلد دوم مذکور ہے۔ پہلی جلد میں قدیم وجدید خواتین افسانہ نگاروں کے تیس، افسانے شامل ہیں، پہلا افسانہ مسرور جہاں کا 'زمین' ہے اور تیسواں افسانہ 'سنگ تراش' ڈاکٹر عشرت ناہید صاحبہ کا ہے۔

صفحہ سات سے دس تک ڈاکٹر عشرت ناہید کا پیش لفظ ہے، پھر گیارہ سے بائیس صفحے تک ہند و بیرون ہند کی پانچ ادبی شخصیات خورشید حیات، نعیم بیگ، مشرف عالم ذوقی، نیلم احمد بشیر اور اقبال مسعود کے تاثرات وتبصرے ہیں، اس کے بعد صفحہ تیئس سے بہتّر تک مرتبہ کے تین تحقیقی وتنقیدی مضامین ہیں۔

پہلا مضمون 'نسائی افسانے کے اولیں نشانات' کے عنوان سے ہے۔ اس میں دور اول کی خواتین افسانہ نگاروں کی افسانوی کائنات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ دوسرا مضمون 'ترقی پسندانہ شعور اور فکشن نگار خواتین' کے عنوان سے ہے۔ یہ دس صفحات پر مشتمل ہے، اس میں رشید جہاں سے لے کر نصرت آرا تک کی ترقی پسند خواتین افسانہ نگاروں کے فکر وفن اور موضوع ومواد پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔

تیسرے مضمون کا عنوان 'نئے عہد کے روشن دستخط' ہے، یہ عنوان سب سے دیدہ زیب اور مضمون سب سے طویل، تیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ جس کے مطالعے سے عصر حاضر کی عالمی افسانہ نگار خواتین پر ڈاکٹر عشرت ناہید کی معلومات اور ان سے ان کے تعلقات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی ان مضامین میں ابتدا سے تا حال خواتین افسانہ نگاروں کی تاریخ و تجزیہ، بدلتے رجحانات ومیلانات اور ارتقائی سفر کی روداد بطریق احسن بیان کی گئی ہے۔

تبصرہ بر جلد دوم: اس جلد کے صفحات اور افسانوں کی تعداد پہلی جلد سے زیادہ ہے، پہلی جلد میں افسانوں کی تعداد تیس تھی اور دوسری میں اڑتیس ہے۔

اس جلد میں مرتبہ کے ان تین مضامین کے علاوہ جن کا ذکر جلد اول کے ضمن میں ہوا، ایک نئے مضمون کا اضافہ 'تخلیقی سوچ کی نئی وسعتیں' کے عنوان سے کیا گیا ہے، جس کی ضخامت تیس صفحات ہے، اس میں جدید افسانہ کی معتبر نسائی آواز نجمہ محمود سے لے کر رینو بہل، قمر جلالی، نفیس بانو شمع، سلمیٰ اعوان، عذرا نقوی، الطاف فاطمہ آشا پربھات چشمہ فاروقی، شبینہ اسلم، انجم قدوائی، نکہت نسیم رضوانہ سید علی، تسنیم کوثر، رفعت ناہید، منزہ احتشام، نصرت شمسی، شہناز رحمٰن، فرحین جمال، نور العین ساحرہ، فارحہ ارشد، رومی ملک، رضیہ کاظمی، رضیہ صغیر، ترنم جہاں، امواج الساحل، فاطمہ عمران اور آخر میں کوثر بیگ کی افسانہ نگاری کا جائزہ لے کر ان کے قدر کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کو جو چیز دیگر انتخابی مجموعوں سے ممتاز کرتی ہے وہ کتاب کے اخیر میں دیے گئے 'تعارفی خاکے' ہیں، جس میں ان تمام خواتین کی حیات و خدمات پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی گئی ہے، جن کے افسانے دونوں جلدوں میں شامل ہیں۔ اس قابل تحسین

پیش رفت سے ایک طرف جہاں ڈاکٹر عشرت ناہید کی محنت کا اندازہ ہو رہا ہے وہیں دوسری طرف کتاب کی اہمیت بھی دوبالا ہو جارہی ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر عشرت ناہید نے بڑی جد و جہد سے اس افسانوی کائنات کی تشکیل کی ہے اور اردو افسانے کے تانیثی چہرے کو نکھارنے میں مکمل کامیابی حاصل کی ہے، یہ کتاب افسانوی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے،اس کے ساتھ ساتھ ان طلبہ کے لیے ایک کارآمد تحفہ بھی ہے جو اکیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں سے متعلق تحقیق کے خواہاں ہیں۔یقین ہے کہ ادبی دنیا میں اس کتاب کی بھرپور پزیرائی ہوگی۔

مکاتیب

آدھی ملاقات (نامے میرے نام)

مصنف/ ناشر : ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

صفحات: 112، قیمت: 100 روپے

مبصر: شمیم احمد صدیقی

نسیم منزل، مدح گنج، پولیس چوکی، سیتاپور روڈ، لکھنؤ، یوپی

ہمارے بزرگوں کی تمام باتیں معنی خیز ہی رہی ہیں۔ کسی کا خط پڑھ لیا، یا اس کا تخلیق کردہ کوئی ادب پارہ پڑھ لیا تو اس کو آدھی ملاقات سے تعبیر کر دیا۔ ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی نے اپنے نام موصول ہوئے نوّے (90) مشاہیر علم و ادب کے خطوط کو یکجا کر کے شائع کرانے کی نیت کی تو مجموعہ خطوط کا نام کچھ اور نہ بھائی دیا تو 'آدھی ملاقات' رکھ دیا۔اب کون یہ کہے کہ حضور! نوے اہل علم سے ہوئی آدھی ملاقاتیں یکجا ہونے کے بعد 45 مکمل ملاقاتیں نہ بھی ہوئیں تب بھی ان کے ہم پلہ تو ضرور ہو گئیں...... بہر حال ان کی اس آدھی ملاقات سے پوری ملاقات کرنے یعنی کتاب کو اوّل یا آخر پڑھنے کی توفیق تو نہ مل سکی البتہ جس قدر نظر سے گزرا اس سے اتنا تو ضرور محسوس ہوا جناب والا بڑے چھپے رستم ہیں کیوں کہ وہ گذشتہ 49-48 برسوں سے بڑی خاموشی سے اُردو زبان و ادب کے جغادریوں، لکھاڑیوں، پروفیسروں، شاعروں، ادیبوں، مزاح نگاروں، دانشوروں سے چوری چھپے نصف ملاقاتیں کرتے رہے ہیں تا کہ مالک الملک سے پوری ملاقات ہونے سے قبل دُنیا والوں پر اپنی ہنرمندی کا سکہ بٹھا سکیں کہ دیکھیے میرے فن پر ان صاحبان نے کیسی کیسی خامہ فرسائی کی ہے۔ایک سو بارہ صفحات کی اس کتاب کے ایک سو تین صفحات میں بعض اہل قلم کے ایک سے زائد خطوط بھی ہیں۔ان میں سے بعض نے خود کو انتہائی مصروف ظاہر کرنے کے لیے چند سطور لکھنے پر ہی اکتفا کی ہے جب کہ عصمت چغتائی جیسی واقعی مصروف ادیبہ اور یوسف ناظم جیسے جانے مانے مزاح نگار نے اپنے ایک ہی خط میں کم و بیش تین تین صفحات کے ذریعے اپنے تاثرات یا جذبات کے اظہار سے گریز نہیں کیا۔ قارئین کرام کی بصارت خراشی نہ ہو خاکسار مذکورہ دونوں جنسوں کے خطوط سے چند جملے پیش کرنا چاہے گا۔اول الذکر نے شیخ رحمٰن کی اولین طبع زاد تصنیف بلاعنوان پر اس طرح رائے زنی کی ہے:

"میرا مشاہدہ ہے کہ آج ہر لکھنے والا تنقید پر اصرار کرتا ہے۔کوئی کتاب تنقید نگاروں کی رائے کے بغیر نہیں چھپتی۔ نئے لکھنے والے ضرورت سے زیادہ تنقید نگاروں کے رحم و کرم پر لکھنے کی ہمت کر رہے ہیں۔خدا کے لیے اپنی ہتک نہ کیجیے۔اس میدان میں صرف آپ ہی اپنے بہترین ناقد ہو سکتے ہیں۔اپنا مقام بغیر کسی کے ناپے تولے خود ہی بنایئے۔شہرت کی تو بھول کر بھی امید نہ کیجیے"..... امید ہے کہ آپ مزاح نگاری پر زیادہ توجہ دیں گے۔ یہ آپ کی پہلی کوشش ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ بات پر لطف انداز میں کہی جائے کہ انسان آج بڑا الجھا ہوا اور دُکھی ہے۔ عصمت چغتائی (24-09-1988)

زیر نظر مجموعہ خطوط (آدھی ملاقات) میں 1981 اور 1992 کے دوران لکھے گئے یوسف ناظم کے چھوٹے بڑے چھ خطوط ہیں۔اولین خط کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں۔

"طنز و مزاح نگاروں نے انشائیہ نگاری پر سخت بلکہ بیجا تنقیدیں کی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ طنز و مزاح کو بھی انشائیہ سمجھا جا رہا تھا۔انشائیہ حال کی چیز ہے یعنی ساتویں دہے کی جب کہ مزاح تیسرے دہے کی... جہاں تک میں سمجھتا ہوں ظرافت کی بنیاد 'مزاح' ہے اور نتیجہ 'طنز'۔مزاح، دل و دماغ کی پیداوار ہے جب کہ 'طنز' فہم و شعور سے عبارت ہے۔ مزاح کے لیے شگفتگیِ طبع ضروری ہے اور طنز کے لیے ذہانت" بتاریخ 4/فروری 1981

اب 22 جنوری 1989 کو بمبئی سے روانہ کردہ ایک خط کا یہ پیراگراف دیکھیں:

"محبی! پہلے آپ کی خوبصورت کتاب 'ناٹ آؤٹ' موصول ہوئی۔ پھر آپ کا خط۔ کتاب عین وقت پر ملی۔ بستر علالت پر تھا۔ ایک آپریشن سے بھی گزرنا پڑا۔ بخیر و خوبی گزر گیا۔ ابھی گھر میں قید ہوں۔ لیکن خوش و خرم ہوں۔ آپ واقعی ناٹ آؤٹ ہیں۔ کتاب بیحد دلچسپ اور پُر لطف ہے۔ میرے علاج میں اس کا بھی کچھ نہ کچھ دخل ہے۔ خدا کرے آپ بخیریت و عافیت ہوں۔ یوسف ناظم کیا یوسف ناظم کی مذکورہ بالا عبارت اس امر کی غمازی نہیں کرتی کہ مزاح نگار کی شگفتہ تحریر ایک صاحب ذوق شخص کی بیماری کو دور کرنے میں تریاق جیسا اثر رکھتی ہے۔

آخر میں ہم اپنے باذوق قارئین سے جدا ہونے سے قبل یہ گوش گذار کرنا چاہیں گے ہم نے شیخ رحمٰن کے مجموعہ مضامین 'الف سے قطب مینار' میں شامل 'آم' کا مزہ اُتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'باغیچہ' (جون 2019) کے نونہال قارئین کو 'آم' برائے خاص و عام نام سے چھپوانے کے بعد ان کے دوسرے مجموعہ مضامین 'باقی آئندہ' میں شامل 'چار مینار کا پانچواں مینار' نام کے مضمون کو 'ہم نے حیدرآباد دیکھا' (باغیچہ جولائی اگست، ستمبر 2019) نام دے کر حیدرآباد شہر کی سیر بھی کرادی۔

ہم ان سطور کے قارئین کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی 'باغیچہ' کے مذکورہ شمارے حاصل کر کے 'آم' برائے خاص و عام' سے بھی لطف اندوز ہوں۔ اور حیدرآباد نہ دیکھا ہو تو اس کی بھی سیر کر لیں۔

شاعری

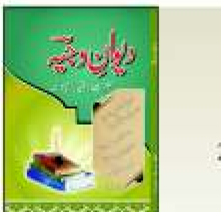

دیوان وجیہ

صفحات: 224، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: مدرسہ جامعۃ العلوم فرقانیہ، بازار مستن گنج، رامپور

مبصر: ابن حسن خورشید، 54 جیل روڈ، رام پور، یوپی

مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں لسانیات کے ماہر تھے۔ اردو فارسی کے علاوہ عربی میں بھی آپ نے اشعار کہے۔ ان کی وفات کے بعد آپ کے بڑے نواسے مولوی وجاہت اللہ خاں کو معلوم ہوا کہ علی گڑھ میں ایک صاحب کے پاس مولانا کا عربی کلام موجود ہے۔ بعد تصدیق بات صحیح نکلی۔ چنانچہ مولوی وجاہت اللہ خاں نے ان پر بھروسہ کرتے ہوئے عربی کلام کا بقیہ حصہ بھی تدوین کی غرض سے ان کے سپرد کر دیا۔ عرصہ بعد وجاہت اللہ خاں 2003 میں مالک حقیقی سے جا ملے اور مولانا کا عربی کلام واپس نہیں مل سکا۔ مختلف ذرائع سے جو کلام حاصل ہو سکا۔ ان کے نواسے ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی نے یک جا کر کے 'دیوان وجیہ' میں اہل ذوق کے سامنے پیش کر دیا جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دیوان وجیہ کے ابتدائی حصہ نثر میں بعنوان ابتدائیہ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی

تحریر فرماتے ہیں ''اللہ رب العزت نے حضرت خطیب اعظم کو بہترین شاعرانہ صلاحیت عطا فرمائی تھی لیکن آپ نے شاعری کو مشغلہ نہیں بنایا بس کبھی کبھار قلم برداشتہ اشعار تحریر فرماتے تھے۔ آپ نے اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شاعری فرمائی اور وجیہ تخلص اختیار کیا۔'' (ص 12)

'خطیب اعظم کا پر کیف کلام' کے عنوان سے رامپور کے ممتاز قلم کار اور عالم دین مولانا عبدالہادی خاں کاوش رامپوری تحریر فرماتے ہیں ''خدا کے فضل و کرم سے حضرت مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں قادری مجددی ایک باعمل عالم اور صوفی کامل تھے اور اسرار شریعت اور آداب رسالت سے پوری طرح واقف تھے۔ اطاعت خداوندی اور عشق رسول کو اپنی زندگی کا سرمایہ گردانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا نعتیہ کلام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے تمام شعرا کی طرح نعتیں نہیں کہی ہیں بلکہ یہ ان کے دل کی آواز ہے اور ان کے دلی جذبات ہیں جو عشق رسول سے مملو ہیں۔'' (ص 14)

تیسری تحریر ممتاز مفکر ڈاکٹر انوار احمد خاں (سابق صدر شعبۂ اردو ذاکر حسین کالج، نئی دہلی) کی ہے۔ دس صفحات پر مشتمل یہ تحریر بتاتی ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے حرفاً حرفاً دیوان وجیہ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی اشعار پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''مولانا صاحب کی ایک نعت سے آدھا مصرعہ ملاحظہ فرمائیں۔ نعت وجیہی مدح رسالت۔ صفحہ 26 پر عربی فارسی اور اردو کے ممتاز استاد جنید اکرم فاروقی فرماتے ہیں ''شاہ صاحب کی نثر کی طرح ان کی شاعری پر تاثیر ہے۔ وہ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے باکمال شاعر ہیں۔'' (ص 26)

اس کے بعد شاہ صاحب کے نعتیہ مجموعہ 'جذبات وجیہ' کے مرتب اور جانشین حضرت وجیہ، مولانا شاہ محمد مظاہر اللہ خاں صاحب کی تحریر ہے اور اس کے بعد عرض شاعر 225 صفحات کے مذکورہ دیوان میں جدول بنا کر اول فہرست اشعار دی گئی ہے جس کے تحت حمد، نعت، مدح قرآن، نظمیں اور غزلوں کے علاوہ قطعات و رباعیاں، سہرے اور بعد میں فارسی اور عربی کلام مندرج ہے۔

شاعری آپ کے لیے کبھی وجہ افتخار نہیں رہی اور نہ ہی آپ نے خود کو شاعر کہلوایا۔ نہ کبھی کسی شاعر استاد سے تلمذ رہا۔ اس کے باوجود آپ کی شاعری میں استاد شعرا کا رنگ جھلکتا ہے۔ محاسن سخن میں تشبیہات، استعارات وتلمیحات وغیرہ کا بخوبی سنگم نظر آتا ہے۔

غزل، نعت، منقبت وغیرہ کے علاوہ دیوان وجیہ میں دس بارہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ نظم 'نیا دور' کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

اب نیا دور ہے ہر بات نئی بھاتی ہے   آج سائنس ہر اک چیز کو شرماتی ہے
ٹیپ ریکارڈ میں آواز سما جاتی ہے   چند لمحات میں لندن سے خبر آتی ہے
آدمی اڑتا ہے تا چاند چلا جاتا ہے   یہ تو سب کچھ ہے مگر دین مٹا جاتا ہے

دیوانِ وجیہ میں متفرقات کے تحت رباعیات وقطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ایک قطعہ میں اپنے مرشد کامل کی شان میں فرماتے ہیں۔

وہ گلزار حق کی شگفتہ کلی   وہ دانائے رازِ خفی و جلی
تمنائے قلبی مراد دلی   وزیر محمد ہیں شاہ علی

حضرت وجیہ نے فارسی اور عربی شاعری میں بھی بلند آہنگ طرز فکر کو اپنایا ہے جس سے صاحبان علم بخوبی مستفید ہو سکتے ہیں۔ آپ کا فارسی اور عربی کلام زیر نظر 'دیوان وجیہ' کے آخر میں مرتب نے نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عربی کلام کا اردو ترجمہ بھی شامل دیوان ہے۔

دیوانِ وجیہ کے آخر دو صفحات پر مختلف شعرائے کرام کے وہ منقبتی اشعار شامل ہیں جو حضرت کی شان میں مختلف اوقات میں کہے گئے ہیں۔

مضامین

دانا پانی

مصنف/ ناشر: پروفیسر جمال نصرت
صفحات: 176، قیمت: 113 روپے
مبصر: غلام علی اخضر
شمرا اپارٹمنٹ، R-197/401، جوگا بائی، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'دانا پانی' اپنے موضوع اور مشمولات کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ گلستانِ اردو عشق و عاشقی کے اچھے بُرے خیالات کے اظہار سے مالا مال نظر تو آتا ہے، مگر سائنسی موضوعات سے جو ہماری زندگی کے لیے 'گل سرسبز' کی حیثیت رکھتے ہیں، خال خال نظر آتے ہیں۔ افسوس! اس طرف دھیان کم ہے۔ مصنف قابل مبارک باد ہیں کہ یہ بیڑا اٹھایا، اس طرح یہ کتاب اس کمی کو دور کرنے کی سمت میں ایک اہم کوشش ہے۔

آج اقوام عالم کے لیے یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کہ پانی کس کا ہے۔ اس جھگڑے کو خوش اسلوبی سے کتاب میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی ہماری تہذیب اور صنعت وحرفت پر کس قدر پانی اثر انداز ہوتا ہے۔ روزی کی ضرورت سرحد و ملک کو وجود بخشنے میں کیا کردار ادا کرتی ہے اور پانی کی اہمیت کیا ہے اس کی طرف قارئین کے ذہن کو زیادہ سے زیادہ مبذول کرنے کی جدوجہد ہے۔ ہر شخص کو صحیح وقت پر صحیح مقدار میں معیاری پانی کیسے ملے، پانی جمع کرنے میں ایمانداری اور پانی کے غلط اور بے جا استعمال پر روک جیسے عنوانات پر مصنف نے غیر جانب دارانہ بات کی ہے۔

'دانا پانی' میں 30 مضامین، تعارف: فاطمہ وصیہ جائسی، تاثرات: کپتان سنگھ، اپنی بات: مصنف شامل ہیں کتاب کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے ان کے عنوانات پیش کیے جا رہے ہیں: من الماء کل شیء، پانی کس کا ہے، کیسے پانی کی یہ گتھی سلجھے، دانا پانی، کل کومت کرو کٹھن، کیسے ہو پانی کے وسائل کا انتظام، عظیم نعمت آب زم زم، بے چارا پانی، اللہ بس اور مدد۔ آب پاشی کتنی کیسے اور کب کی جائے، بجلی اور پانی، پانی اور صحت، شبنم اور کہرے سے پانی، سوکھا اور بھکمری، دلدل، اکال سے ہونے والی دشواریاں، بارش کا پانی: ایک نعمت، شمولیت آب پاشی، پانی گرمی اور بجلی، پانی اور ہمارا جسم، سطحی اور زمینی پانی، سینی ٹیشن یا ہوش مند صفائی، پانی اور غذا، نم علاقے اور ان کا علاج، کچھ اہم سوالات، سیور کے پانی سے سینچائی، نمک کی بات، دستور اور پانی، پانی سے علاج، جیسے اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ جن سے ایک انسان کی واقفیت نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی اس کے ارد گرد گردش کرتی رہتی ہے۔ ابن آدم ایک مکمل انسان اور باشعور زندگی اس وقت تک گزار نہیں سکتا ہے جب تک ان پر اس کی پوری توجہ نہ ہو۔

یوں تو مصنف کا ہر مضمون خوبیوں کا جامع ہے مگر خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ مضامین میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خاصے اور زبردست مواد اپنے کشکول میں رکھنے کی وجہ سے لاجواب ہیں، جن میں سے ایک 'من الماء کل شیءٍ' ہے۔ یہ طویل مضمون 23 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں پانی کیسے برستا ہے، ٹھنڈی ہوا چلنے کی وجہ کیا ہے، پانی، کھیتی اور آسائش کے سامان وغیرہ آپ کو خوشیاں دے سکتی ہیں مگر لازم ہے کہ درست استعمال ہو، ساتھ ہی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ مصنف نے بڑی جرأت سے یہ بات تحریر کی ہے کہ سائنس کسی چیز کی موجد نہیں بلکہ کائنات میں قدرت کے پوشیدہ اسرار و رموز کو طشت از بام کرتی ہے۔ اسی مضمون کے ضمن میں کائنات کے معرض وجود میں آنے کے اہم مسائل پر بھی گفتگو ہوئی ہے۔

اچھی پیداوار کا حاصل ہونا ایک بڑا مسئلہ ہے، اکثر صحیح وقت اور صحیح مقدار میں

آبپاشی نہ ہونے کی وجہ سے مایوس کن صورت دیکھنے کو ملتی ہے اس پر تجرباتی گفتگو ہے۔ پانی کے تعلق سے کتاب سے کچھ اہم باتوں کو بھی ہم یہاں پر پیش کرتے ہیں: ☆71% رقبے پر پانی و29% پر خاک وپہاڑ۔☆ سمندر 97% جو کھاری کسی کام کا نہیں، باقی 3% ☆ ہم میں بھی 71% اور 29% ہڈیاں اور مسل میں۔☆ دیتے بنگلہ دیش وپاکستان کو اور لیتے چین ونیپال ☆ آج صاف پانی آسانی سے پینے کو نہیں۔☆ طاقت توانائی خون میں اور ہر جگہ اس کا عمل دخل، جسم کا زہر پاخانہ، پیشاب، پسینہ، بلغم، مواد کو دور کرتا ہے۔ ☆ بارش کے پانی کو جمع، زمین کو بینک، تالاب کو آباد کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ☆ زیادتی اور کمی کی جگہوں کو ملانے پر غور وفکر اور اس پر عمل ہو۔☆ موجودہ پانی کے حساب سے خرچ کا بجٹ پاس ہو۔☆ حکمت سے سوکھی ندی کا زندہ کرنا۔☆ سمندر تک آنے کے راستے کو طویل کرنا۔☆ دن بھر میں اپنے وزن کا اوسطاً 0.0345 گنا لیں۔☆ دنیا کا کل پانی 14 سو پچاس ملین مربع کیلومیٹر ہے۔☆ کل پانی یعنی زمین کی سطح پر 2.65 میٹر ہے۔☆ سب سے زیادہ بارش میگھالیہ اور سب سے کم راجستھان میں۔ وغیرہ ہیں۔

پروفیسر جمال نصرت علمی حلقے میں اردو، ہندی اور انگریزی کے اچھے قلم کار اور مصنف کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ کو ماحولیات پر خاصی دسترس حاصل ہے۔ مصنف کے علمی شہ پارے جو منظر عام پر آکر مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اس کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔ درجن بھر کتابیں مصنف کی کاوشوں سے وجودی پیراہن اوڑھ چکی ہیں۔ جن میں: پانی کی تلاش (اردو، ہندی) رحمتیں، ہمارا ماحول اور ہماری ذمہ داریاں، دارفانی سے کامیاب آئے، غالب، اردو اور ہندوستان، غلطیوں کی داستان، پانی جنگل اور زمین۔ وغیرہ شامل ہیں۔

مصنف کا انداز بیان آسان ہے۔ یہ خوبی صاحب کتاب کو وراثت میں ملی ہے جس کا اثر ہر تحریر میں نظر آتا ہے۔

انتساب اپنے والد جناب وجاہت علی سندیلوی [جن کا اردو ادب میں بڑا مقام ہے] اور اپنی والدہ محترمہ سعیدہ بیگم صاحبہ کے نام کیا ہے، جن کی بے پناہ دعاؤں نے مصنف کو ہر محاذ پر کامیاب وکامرانی سے بہرہ ور کیا۔ مصنف نے جن کتابوں اور رسالوں سے مدد لی ہے ان کی تفصیل صفحہ 174 پر درج ہے۔ آخری صفحے پر مصنف کا تعارف اور بیک ٹائٹل پیج پر اہل علم کے تاثرات شامل ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابل مبارک باد ہے جس کے مالی تعاون سے یہ علمی خزینہ اشاعتی مراحل سے ہمکنار ہوا۔

رسائل و مجلات

نقوش طیبات دوماہی

خصوصی شمارہ برائے داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد غزالی ندویؒ

ایڈیٹر: محمد ناصر سعید اکرمی

جلد: 7، شمارہ: 39-38 ستمبر تا دسمبر 2018

صفحات: 726، قیمت: 450 روپے

ناشر: معہد الامام حسن البنا الشہید، بھٹکل، کرناٹک

مبصر: عمران عراقی (ریسرچ اسکالر) شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

پیش نظر 'نقوش طیبات' کا یہ خصوصی شمارہ داعی ومبلغ مولانا محمد غزالی ندوی کی حیات وخدمات پر مشتمل ہے۔ واضح ہو کہ امام حسن البنا الشہید انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے شخصیات پر نکالے گئے نقوش طیبات کا یہ تیسرا شمارہ ہے، جو خصوصی طور مولانا مرحوم غزالی صاحب کی حیات وخدمات اور ان کے افکار وپیغامات پر مبنی مضامین اور خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین اور خطوط مولانا مرحوم سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے متقدین اور ان کی زندگی کے شب وروز کو بے حد قریب سے دیکھنے والے اکابرین کی جانب سے عقیدت و محبت سے پیش کیا گیا خراج ہے۔ ان تحاریر سے نہ صرف مولانا مرحوم کی شخصیت کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں بلکہ تبلیغ دین کے ضمن میں مرکز اور مرکز سے باہر ان کی خدمات کا ایک ایسا پہلو عیاں ہوتا ہے، جو ان سے عقیدت رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ اور ایک بہترین تحفہ ہے۔ شمارے میں شامل ان تحاریر کے علاوہ مولانا مرحوم کی خوش خطی کے چند نمونے کے ساتھ ارشادات وپیغامات پر مبنی 8 مضامین بھی شامل اشاعت ہیں۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام مختصر مضامین حیاۃ الصحابہ کے دروس پر مبنی ہیں۔ ان میں غریب پر رحم، انسان اللہ کی قدرت کے سامنے بے بس ہے، اپنا محاسبہ کروا اپنے حساب سے پہلے، یہ نبوت ہے بادشاہت نہیں، وغیرہ بے حد اہم مضمون ہے۔ علاوہ ازیں شمارے میں مولانا غزالی کی شان میں پیش کیے گئے خراج عقیدت بطور مرثیہ، آپ کے والد ماجد حضرت الحاج قاضی ابوبکر صاحب خطیب، بڑے بھائی حضرت قاضی احمد خطیبی کی سوانح حیات اور آپ کے اساتذۂ کرام اور دیگر متعلقین کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ ان تمام تحریروں سے مولانا مرحوم کی قد آور شخصیت کے راز اور ان کے شب وروز کے معاملات کھل کر سامنے آتے ہیں۔

مولانا محمد غزالی ندوی صاحب ایک عالمی تحریک سے وابستہ رہے۔ آپ ایک دینی و علمی خاندان کے فرد تھے۔ آپ کے والد ماجد مولانا ابوبکر خطیبی، قاضی بھٹکل تھے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم انجمن حامی مسلمین ہائی اسکول، بھٹکل میں پوری کی۔ بعد ازاں جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں داخلہ لیا اور وہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ چلے آئے۔ وہاں سے انہوں نے عالمیت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ مدراس کی ایک کمپنی میں ملازمت بھی اختیار کی لیکن جلد ہی انہوں نے درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کے لیے جامعہ اسلامیہ بھٹکل تشریف لے آئے۔ کچھ عرصہ یہاں گزارنے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کا مرکز ومحور دعوت الی اللہ کو بنالیا اور حضرت نظام الدین میں واقع تبلیغی جماعت کے مرکز دعوت وتبلیغ، دہلی سے وابستہ ہو گئے اور یہ سلسلہ تادم مرگ جاری رہا۔ آپ نے دعوت وتبلیغ کے کام کے لیے مرکز نظام الدین میں تقریباً نصف صدی گزارا۔ جس کی وجہ سے ایک بڑا حلقہ آپ سے متعارف اور آپ کی عادات واطوار اور اخلاقی کردار کا معترف بھی ہے۔ 23 رمضان المبارک 1439ھ کی شب جمعہ آپ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

شمارے میں شامل مضامین کی بات کی جائے تو بیشتر مولانا غزالی کے حالات زندگی اور تبلیغی خدمات پر مشتمل ہیں۔ ان کے کارناموں کے حوالے سے بھی جو مضامین لکھے گئے ہیں، وہ بنیادی طور پر تاثرات ومشاہدات پر مبنی ہیں جس کی وجہ سے ان میں شخصی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ البتہ اداریہ جو 'حرف طیب' کے عنوان سے لکھا گیا ہے، اس میں مولانا غزالی کی ایک تصنیف کا حوالہ ملتا ہے۔ لکھتے ہیں ''مولانا نے نماز کے موضوع پر ایک کتابچہ بھی قلمبند کیا ہے، جو زیور طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ عوام وخواص سب کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔'' (ص 18) لیکن مولانا غزالی نے خاص طور پر تصنیف وتالیف کی جانب توجہ نہیں دی، جس کے باعث ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا علم بذریعے احباب ومتعلقین ہی عوام تک پہنچا ہے۔

اس خصوصی شمارے میں مولانا محمد غزالی ندوی سے متعلق تحاریر کے علاوہ جماعت تبلیغی کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس کی سوانح، حضرت جی مولانا یوسف، حضرت جی مولانا انعام الحسن کی سوانح کو بطور ضمیمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یادرفتگاں کے کالم میں حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاؤپوری اور جناب عبداللہ دامودی صاحب مرحوم کے حوالے سے بھی، ان کی خدمات اور سوانح حیات اس شمارے کی زینت ہے۔ یہ تمام مضامین اس شمارے کو ایک دستاویزی حیثیت فراہم کرتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس شمارے کو دینی اور تبلیغی جماعت کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حلقے میں خوب پذیرائی حاصل ہوگی۔

عالمی اردو نامہ

دبئی میں بزم اردو کے زیر اہتمام جشن کیفیات کا انعقاد

دبئی: بزم اردو دبئی کے زیر اہتمام دبئی کے شیخ راشد آڈیٹوریم میں محفل اردو 2019 کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس برس محفل اردو کو جشن کیفیات کے عنوان سے منعقد کیا گیا

جو کہ کیفی اعظمی کو ان کی صد سالہ پیدائش کے موقعے پر خراج عقیدت کے طور پر منعقد کیا گیا۔ بزم اردو دبئی کے اس چھٹے سالانہ جلسے میں بالی ووڈ کے ستاروں کے ساتھ ہندو پاک کے علاوہ سعودی عرب اور جرمنی سے تشریف لائے اردو ادبا و شعرا نے شرکت کی۔ 1600 افراد کی گنجائش والا شیخ راشد آڈیٹوریم شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شرافت شاہ اور عائشہ شیخ عاشی نے پروگرام کی تفصیلی جانکاری دیتے ہوئے محفل کا آغاز کیا۔ محفل کے پہلے حصے میں معروف اردو ادیب گوپی چند نارنگ کو جوش اردو ایوارڈ 2019 پیش کیا گیا۔ حالانکہ اپنی علالت کے باعث ان کے لیے سفر ممکن نہیں تھا۔ علمدار اردو ایوارڈ 2019 کراچی آرٹس کونسل کے صدر محمد احمد شاہ کو پیش کیا گیا۔ پاسبان اردو ایوارڈ اونر اسکول، لکھنؤ کی پرنسپل ڈاکٹر مالا مہرا کو دیا گیا۔ اس برس کیفی اعظمی کے نام سے کیفی اعظمی اردو نغمہ نگار ایوارڈ بھی دیا گیا۔ یہ ایوارڈ معروف نغمہ نگار ارشاد کامل کو پیش کیا گیا۔ ایوارڈ پیش کرنے کی اس تقریب کے دوران بالی ووڈ کی معروف اداکارہ اور سماجی کارکن شبانہ اعظمی، تنویر اعظمی، سینئر اداکار کنول جیت سنگھ جیسے ستاروں کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، بزم اردو کے ڈائرکٹر یعقوب موسیٰ محمد حسین، شکیل خان، ریحان خان، ندیم احمد، ذیشان حیدر، عبدالمعز خان، نسیم اختر، عماد الملک اسٹیج پر موجود رہے۔ بزم اردو ہر سال اپنے سالانہ جلسے کے موقعے پر جوش اردو نام سے جو مجلہ شائع کرتی ہے وہ اس برس بھی شائع ہوا تھا، اسٹیج پر اس مجلے کی رونمائی عمل میں آئی۔ بزم اردو کے سالانہ جلسے کی تیاریوں سے لے کر اسے انجام تک پہنچانے میں تابش زیدی، احیا بھوج پوری، سروش آصف، شاداب الفت، سرور نیپالی، عائشہ عاشی، ترنم احمد، رملا سید، یوسف مرزا، ثروت زہرا، شمی احمد قریشی، صائمہ نقوی، سعدیہ طارق، فیصل احمد خان، جمیل احمد، فرزانہ منصور، الطاف حسین، کنور سلیم احمد نے کلیدی کردار ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 ستمبر 2019

اردو زبان امریکہ میں مقبول ہو رہی ہے

نئی دھلی: امریکہ میں اب اردو زبان روزگار کا ذریعہ بنتی جا رہی ہے۔ حکومت امریکہ کی دلچسپی اردو زبان کو فروغ دینے میں کافی بڑھ گئی ہے اور روزگار کے سبب امریکہ کی نئی نسل بھی اردو زبان میں دلچسپی لینے لگی ہے۔

یہ پروفیسر افروز تاج اور پروفیسر جان کالڈویل کا کہنا ہے جو یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا میں صدر شعبۂ اردو ہندی ایشین اسٹڈیز (امریکہ) ہیں۔ پروفیسر افروز تاج گذشتہ 30 سال سے مشی گن امریکہ میں ہندوستانی اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ امریکی اردو اسکالر پروفیسر جان انھی کے شاگرد ہیں اور پروفیسر جان جیسے کئی امریکی نوجوان اردو زبان میں اپنا کیریئر بنا چکے ہیں نیز اردو کو فروغ دینے میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر افروز تاج اور پروفیسر جان کالڈویل گذشتہ دو مہینے سے ہندوستانی دورے پر ہیں۔ وہ اپنے 12 امریکی اردو شاگردوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ شاگردان کورس پورا کر کے امریکہ واپس لوٹ گئے لیکن پروفیسر افروز اور پروفیسر جان اب کچھ تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ پروفیسر افروز تاج کا کہنا ہے کہ وہ گذشتہ 22 برسوں سے امریکہ کے شعبۂ اردو، ہندی کے طالب علموں کو ہندوستان کا دورہ کرا رہے ہیں یعنی اب تک اردو زبان کے سیکڑوں طالب علموں کو ہندوستان کا دورہ کرا چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اشتہار دیتے ہیں جس کی بنیاد پر 40 سے 50 درخواستیں موصول ہوتی ہیں چنانچہ ان میں سے ہم 10 سے 12 طالب علموں کا انتخاب کرتے ہیں اور ہندوستان کا دورہ کراتے ہیں۔

پروفیسر افروز تاج نے کہا کہ حکومت امریکہ اس وقت اردو زبان کے فروغ کے لیے کافی پیسے خرچ کر رہی ہے کیونکہ اردو زبان برصغیر ہندوستان، پاکستان بنگلہ دیش کی اہم زبان بن چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب بھی امریکہ میں 5 سے 6 اردو زبان کے ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ وہاں اردو زبان کے سمینار اور نشستیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر افروز تاج نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ نقل مکانی کر کے امریکہ پہنچے وہ تو اردو زبان سے واقف تھے لیکن ان کے بچے اردو سے دور رہے، کچھ گھروں میں اردو آج بھی ہے، نوجوان اردو بولتے ہیں لیکن رسم الخط رومن ہے۔ اکیڈمک کے علاوہ کیا گھروں میں بھی اردو زبان پہنچ رہی ہے؟ اس سوال پر پروفیسر افروز تاج نے کہا کہ امریکہ میں اردو زبان محلہ کی زبان نہیں بن سکتی جیسا کہ ہندوستان اور پاکستان میں ہے لیکن مقبول ادب، فلمیں، ڈرامے، سیریلس وغیرہ کے سبب یہ زبان مقبول ہو رہی ہے۔ پروفیسر افروز تاج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہے ہیں اور غالباً 1983 سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ پروفیسر جان کا کہنا ہے کہ امریکہ سے جو طالب علم ہندوستان آتے ہیں وہ صرف زبان نہیں بلکہ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب، ادب و آداب بھی سیکھتے ہیں نیز انھیں قریب سے دیکھتے ہیں۔ پروفیسر جان کا کہنا ہے کہ پروفیسر افروز تاج صرف ہم لوگوں کو زبان نہیں سکھاتے بلکہ اردو کی پوری تہذیب سے ہمیں واقف کراتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جولائی 2019

اردو اور قانون کا رشتہ بہت گہرا ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی کونسل کے صدر دفتر میں پینل برائے قانونی مطالعات کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دهلی: اردو اور قانون کا رشتہ بہت گہرا اور مضبوط ہے۔ قانونی دستاویزات میں اردو زبان کے الفاظ کا کثرت کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے۔ آج بھی وکلا، جج اور افسران مختلف النوع رپورٹوں، دستاویزوں اور فیصلوں میں اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اچھا شہری بننے کے لیے بھی قانون سے آگہی ضروری ہے۔ ان خیالات کا

اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ پینل برائے قانونی مطالعات کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل کے تحت مذکورہ پینل گزشتہ کئی برسوں سے قائم ہے، جس کے تحت اردو میں قانون کی اہم اور عمدہ کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت سی پرانی دستاویزات اور عدلیہ کی زبان میں اردو کے بہت سے الفاظ استعمال ہونے کی وجہ سے قانونی شعبوں سے وابستہ افراد اور طلبا کو خاصی دقتیں پیش آتی ہیں۔ اس لیے قومی کونسل نے ملک کی یونیورسٹیوں میں موجود لا فیکلٹیز، لاء اسکول اور لاء کے دیگر اداروں کے سربراہان کی ایک میٹنگ بلانے کا فیصلہ کیا ہے جس میں ان سے درخواست کی جائے گی کہ قانون کے طلبا کو لاء اینڈ لینگویجز کے تحت جہاں ملک کی دوسری زبانیں پڑھائی جاتی ہیں، وہیں اردو زبان کی تدریس کا بھی بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ لاء اینڈ لنگویجز کے چار سمسٹرز ہوتے ہیں، جن میں سے کم از کم ایک میں اردو ضرور پڑھائی جائے تاکہ قانون کے طلبا عدلیہ کی زبان میں مستعمل اردو الفاظ کے معانی و اصطلاحات سے کما حقہ واقف ہوسکیں۔

خواجہ عبدالمنتقم نے قانون داں حضرات کے لیے اردو سے واقفیت کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہا کہ پرانی دستاویزات اور بہت سی رپوٹوں میں اردو الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے جس کے سبب پولس، افسران، جج اور وکلا کو بعض اوقات بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان قانونی اداروں سے وابستہ افراد کو کم از کم ان اردو الفاظ سے واقف ہونا ضروری ہے جو قانون کی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل معین نے قانونی شعبوں سے جڑے ہوئے افراد کو اردو الفاظ کی تفہیم میں پیش آنے والی دشواریوں کے پیش نظر ایک ورکشاپ کے انعقاد کی تجویز پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ ایک ایسی ورکشاپ منعقد کی جائے جس میں تمام پولس، افسران، وکلا اور جج شریک ہوں اور عدلیہ یا قانون میں استعمال ہونے والے اردو الفاظ کے معانی ومفاہیم پر بات کی جائے۔ پروفیسر نزہت پروین خان نے کہا کہ جو پرانے ریکارڈ اردو میں ہیں، انھیں سمجھنے کے لیے قانون کے طلبا کو اردو سکھانی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل کی طرف سے لاء فیکلٹیز، لاء اسکولز وغیرہ کے سربراہان کی میٹنگ کا فیصلہ لائق ستائش ہے۔ اس طرح یہ قانون کی بھی مدد ہوگی اور اردو کی بھی۔ میٹنگ میں ایک ریفریشر کورس کی تجویز پر بھی غور کیا گیا جس کے تحت پولس، کچہریوں میں کام کرنے والے افراد اور ملازمین کو اردو پڑھانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی، جناب مصطفےٰ خان ایڈوکیٹ، جناب اقبال احمد، جناب محمد شہنشاہ خان، محترمہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک)، ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) محترمہ ذیشان فاطمہ اور یوسف رامپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 اگست 2019

قومی کونسل کے صدر دفتر میں جاوید صدیقی اور یحییٰ بھوجپوری کا استقبال

نئی دہلی: اردو ایک ایسی زبان ہے جس کے ذریعہ ہندوستان کی تہذیب وثقافت کا فروغ دنیا بھر میں ہورہا ہے۔ اردو کے شعرا دنیا کے جن ملکوں میں بھی ہیں

وہاں وہ نہ صرف اردو زبان کو فروغ دے رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا پرچم بھی بلند کر رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی کونسل کے صدر دفتر میں متحدہ عرب امارات کے مشہور شعرا یحییٰ بھوجپوری اور جاوید صدیقی کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ یحییٰ بھوجپوری اور جاوید صدیقی اردو کے بہترین شاعر ہیں اور ہندوستانی تہذیب وثقافت کو متحدہ عرب امارات میں بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے دونوں مہمانان کو گلدستہ پیش کیا اور ان کا جامع تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ یحییٰ بھوجپوری اور جاوید صدیقی بہت سی صلاحیتوں کے حامل ہونے کے ساتھ اچھے تخلیق کار بھی ہیں اور تخلیق کار کی عظمت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ تخلیق کے بطن سے ہی تنقید جنم لیتی ہے۔

یحییٰ بھوجپوری نے اپنے خطاب میں قومی کونسل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل اردو کا بہت بڑا ادارہ ہے۔ اس کے ذریعے زبان کا بہت کام ہورہا ہے اور پوری دنیا میں اردو زبان کو تقویت حاصل ہورہی ہے۔ عہد حاضر میں سوشل میڈیا کے بڑھتے اثرات کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو والوں کو چاہیے کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے سوشل میڈیا کا مثبت استعمال کریں اور کمپیوٹر پر اردو کے استعمال کو آسان بنانے کی طرف توجہ دیں۔ جاوید صدیقی نے بتایا کہ متحدہ عرب امارات میں اردو کا دائرہ بڑھ رہا ہے اور وہاں اردو شاعری کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ وہاں بڑے مشاعروں کے انعقاد کے ساتھ طرحی نشستوں کا بھی رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی اور علمی سمینار بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔

اس موقعے پر دونوں مہمان شعرا نے اپنا مرصع کلام بھی سنایا جس پر سامعین جھوم اٹھے۔ کونسل کے اسٹاف میں سے جناب عبدالرشید، جناب انصر اور جناب منیر صاحب نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ جلسہ استقبالیہ میں جن شخصیات نے شرکت کی ان میں جناب کمل سنگھ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن)، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک)، حقانی القاسمی، ڈاکٹر فیروز عالم، جناب اجمل سعید، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر یوسف رامپوری وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 اگست 2019

عرفان اظہار اور دیبا سلیم عرفان کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

نئی دہلی: اردو ہندوستان کی وہ زبان ہے جو دنیا بھر میں مقبول ہورہی ہے۔ خاص طور سے متحدہ عرب امارات میں اردو زبان وادب کے بولنے سمجھنے والوں کی تعداد آئے دن بڑھتی جارہی ہے۔ ان ممالک میں ہندوستان

کی تہذیب وثقافت کو نہ صرف پسند کیا جارہا ہے بلکہ اپنایا بھی جارہا ہے۔ فارسی سے اردو شاعری تک کی سرپرستی اپنے اپنے دور کے بادشاہوں، نوابوں نے کی۔ آج کے دور میں بادشاہ اور نوابین موجود نہیں ہیں لیکن عرفان اظہار اور دیبا سلیم عرفان جیسی شخصیتیں اردو زبان کی ترقی وفروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ دیار غیر میں ہندوستان کی سیکڑوں سالہ گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی بھی کر رہے ہیں۔ یہ باتیں قومی کونسل کے صدر دفتر میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے متحدہ عرب امارات میں مقیم مشہور ومعروف گروپ آف کمپنی ویژن کارپوریشن کے سربراہ اور اردو کے معتبر شاعر عرفان اظہار اور دیبا سلیم عرفان کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیہ تقریب میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ یو اے ای کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اردو کی ترویج واشاعت کے لیے مشاعرے منعقد کراتے رہتے ہیں۔ شعروشاعری کا رجحان انھیں ورثے میں ملا ہے۔ ان کے والد محترم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ کے پروفیسر تھے۔ وہ اردو کے اچھے شاعر تھے۔ گھر کے شاعرانہ ماحول کے سبب عرفان اظہار کو بھی شعروشاعری سے دلچسپی ہوگئی۔ انھیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ یو اے ای میں اردو کی تنظیمیں ان کی سرپرستی میں کام کررہی ہیں۔ عرفان اظہار اردو پریس کلب انٹرنیشنل کے صدر بھی ہیں اور دبئی میں انڈیا کلب کے اسپورٹ ڈائریکٹر بھی۔ انھیں متعدد تنظیموں، اداروں کی طرف سے کئی ایوارڈز سے بھی سرفراز کیا جاچکا ہے۔ انھوں نے 2003 میں سرزمین دوبئی پر کاروبار کا آغاز کیا، اور پانچ سال کی قلیل مدت میں گروپ آف کمپنی ویژن کارپوریشن کے مالک بن گئے۔

شیخ عقیل احمد نے عرفان اظہار کی اہلیہ دیبا سلیم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انھیں فارسی، فرنچ، اردو، ہندی کے علاوہ انگریزی پر عبور حاصل ہے۔ ان کی دو کتابیں انگریزی میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں سے ایک کتاب کا ترجمہ اردو میں بھی ہوچکا ہے۔ اس موقعے پر عرفان اظہار نے اپنی شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا اور اردو کے تئیں کونسل کی خدمات کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں اردو کے فروغ کے لیے زمینی سطح پر کام کررہی ہے۔ کونسل کے ڈائرکٹر کی بہتر کارکردگی اور اردو کی ترقی کے لیے اٹھائے جارہے اقدامات کی بھی انھوں نے تعریف کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 اگست 2019

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشست

نند کشور وکرم اور ڈاکٹر رئیس احمد کی وفات پر تعزیتی نشست

نئی دہلی: اردو کے بے لوث خادم اور ادیب مرحوم نند کشور وکرم اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی رحلت سے دنیائے اردو میں ایک خلا ضرور پیدا ہوگیا ہے جس کا پُر کرنا مشکل

ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ تعزیتی نشست میں پروفیسر انور پاشا نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ نند کشور وکرم کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اردو کی ترویج واشاعت میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے، اردو کے تئیں ان کا رویہ بے حد مخلصانہ تھا۔ انھیں صحیح معنوں میں اردو کا بے لوث خادم کہا جاسکتا ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بذریعہ فون تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ نند کشور وکرم اردو کے خاموش مجاہد تھے۔ انھوں نے پوری زندگی بغیر کسی ستائش وصلہ کے اردو کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔ انھوں نے مزید کہا کہ افسانہ، ناول، ترجمہ نگاری، تنقید، شاعری، تبصرہ، ادبی صحافت، شخصیت نگاری اور ادب کی مختلف جہات واصناف میں نند کشور وکرم نے خامہ فرسائی کی ہے۔ انھوں نے اپنی طویل زندگی کو اردو زبان وادب کی خدمت وترویج کے لیے وقف کردیا تھا۔ اگرچہ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، تاہم ان کے کام انھیں ہمیشہ زندہ جاوید رکھیں گے۔

اس موقعے پر قومی کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے ان کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا نند کشور وکرم جتنے بڑے ادیب تھے، اتنے بڑے انسان بھی تھے اور ان کی خوش اخلاقی وزم گفتاری کے سبھی قائل تھے۔ انھوں نے کہا کہ وقت کی ستم ظریفی کہیے کہ کونسل کے سابق ملازم جناب رئیس احمد بھی آج ہی اس دار فانی سے کوچ کرگئے، وہ ہمیشہ اپنے فرض منصبی کے لیے یاد کیے جائیں گے۔ قومی کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر انتظامیہ کمل سنگھ نے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رئیس احمد انتہائی نیک انسان تھے، کونسل میں ان کی کارکردگی بہت عمدہ تھی، گرچہ وہ جسمانی طور پر معذور تھے لیکن ان کی تحریر خوشخط تھی۔

ڈاکٹر محمد ریاض احمد نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نند کشور وکرم جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے ایک طویل عمر پائی اور عمر کا زیادہ تر حصہ اردو کی ترویج واشاعت میں گزارا۔ اسے ان کا اردو سے والہانہ لگاؤ کہا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ نند کشور وکرم اردو کے بڑے ادیب تھے، وہ اپنی نگارشات سے پورے اردو حلقے میں پہچانے جاتے تھے۔ وہ خوش خلق، نرم گفتار اور منکسر المزاج تھے اور ایک اچھے انسان دوست بھی تھے۔ ان کے اندر انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی پیدائش 1929 میں راولپنڈی میں ہوئی تھی اور انھوں نے ایک طویل عمر پائی۔ اس موقع پر نند کشور وکرم اور ڈاکٹر رئیس احمد کے لیے تمام لوگوں نے دو منٹ کی خاموشی اختیار کرکے خراج عقیدت پیش کی۔

اس تعزیتی نشست میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر جناب فیروز بخت احمد، پروفیسر نعمان خان (عربی)، پروفیسر ناشر نقوی، پروفیسر علیم اشرف خاں، پروفیسر نعمان خان، پروفیسر دیوان حنان خان، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر مظہر آصف، ڈاکٹر ایس حسنین اختر، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر محمد خالد، ڈاکٹر مظہر احمد، ڈاکٹر منہاج احمد، ڈاکٹر مظاہر علی کے علاوہ قومی اردو کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر فیروز عالم، اجمل سعید، محمد احمد، ڈاکٹر شاہد اختر، ڈاکٹر توقیر عالم راہی، محمد افضل، نیلم رانی، آبگینہ عارف، ڈاکٹر یوسف رامپوری اور محمد مجیب بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 اگست 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

علامہ جمیل مظہری حیات وخدمات

گوپال گنج: اردو کالج گوپال گنج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور اسمارٹ فاؤنڈیشن گوپال گنج کے اشتراک سے 'علامہ جمیل مظہری: حیات وخدمات' کے عنوان سے ایک قومی سمینار کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب پروفیسر نبی احمد، سابق صدر شعبۂ اردو جے پی یونیورسٹی چھپرہ نے فرمائی اور نظامت کے فرائض اردو کالج کے لیکچرر ڈاکٹر ذاکر حسین ذکی ہاشمی نے انجام دیے۔ اردو کالج گوپال گنج کے سکریٹری پروفیسر ابوالکلام نے مہمانوں کے لیے خیر مقدمی کلمات کہے۔ اس تمہید کے بعد مقالہ نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے جے پی یونیورسٹی چھپرہ کے ریسرچ اسکالر محمد شاہد نے اپنا مقالہ بعنوان 'جمیل مظہری کا تنقیدی شعور' پیش کیا جس میں انھوں نے جمیل مظہری کے تنقیدی شعور سے متعلق کچھ اہم نکات پیش کیے، دوسرے مقالہ نگار کے طور پر ضلع اسکول چھپرہ کے استاد اور اردو اسکالر محمد ولی اللہ قادری نے اپنا مقالہ 'جمیل مظہری کی شاعری کی صوفیانہ لَے' کے عنوان سے پیش کیا جس میں انھوں نے جمیل کے صوفیانہ انداز کے مثبت ومنفی پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس پٹنہ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے 'جمیل مظہری فلسفی یا رومانی شاعر' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ان کے بعد آخری مقالہ نگار کے طور پر اس سمینار کے مہمان ذی وقار اور اردو ادب کے عالمی شہرت یافتہ شاعر وادیب جناب ڈاکٹر غضنفر علی سابق ڈائرکٹر اکیڈمی آف پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرس نے اپنا جامع و پر مغز مقالہ 'جست جہات جمیلی' کے عنوان سے پیش کیا جس میں انھوں نے جمیل مظہری کی شاعری سے متعلق معلومات و مواد فراہم کیا۔ جے پی یونیورسٹی چھپرہ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر نبی احمد نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ اسمارٹ فاؤنڈیشن کے سکریٹری و پرنسپل اردو کالج نے دو سو الفاظ میں جمیل مظہری پر مقابلہ مضمون نگاری کے تین ٹاپرس کو چاندی کا میڈل دیے جانے کا اعلان کیا اور مہمان ذی وقار ڈاکٹر صفدر امام قادری نے اپنے ادارے بزم صدف کی جانب سے ان تینوں کامیاب طلبا کو بالترتیب تین ہزار دو ہزار اور ایک ہزار انعام دینے کا اعلان کیا۔ دوسرے مہمان ذی وقار ڈاکٹر غضنفر علی نے ہر سال کے کالج ٹاپر کو ایوارڈ دینے کا اعلان کیا اور بعد ازاں پرنسپل صاحب کے کلمات تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 ستمبر 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

وزیر اعظم نریندر مودی کی قومی اساتذہ ایوارڈ یافتگان سے ملاقات

نئی دہلی: وزیر اعظم نریندر مودی نے لوک کلیان مارگ پر قومی اساتذہ ایوارڈ 2018 پانے والوں کو ان کے امتیازی کام کے لیے مبارکباد دی۔ انھوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہر طالب علم کی زندگی میں یکسر تبدیلی لانے کے لیے اپنی سخت

کوششیں جاری رکھیں۔ بات چیت کے دوران وزیر اعظم نے تدریسی معاون آلات کے طور پر ٹیکنالوجی کے استعمال کی اہمیت کے بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے اساتذہ سے کہا کہ وہ طلبا کے اندر غور و فکر کے جذبے کی حوصلہ افزائی کریں، تاکہ وہ روزمرہ کے متعدد مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔ انھوں نے انعام پانے والوں سے درخواست کی کہ وہ بچوں کو ایک موقع دیں اور انھیں محدود نہ کریں۔ وزیر اعظم مودی نے طلبا کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کو متحرک کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ تخلیقی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی بچوں کے لیے ترغیب کا کام کرے گی اور انھیں خود سے مسابقت کے لائق بنائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ متعدد امور کے تئیں طلبا کے نقطۂ نظر کو سمجھنا اہم ہے۔ انھوں نے اساتذہ سے کہا کہ وہ بچوں کے اندر زندہ دلی پیدا کریں اور انھیں ایسا بنائیں کہ وہ سیکھنے کا عمل جاری رکھیں۔

وزیر اعظم کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے انعام یافتگان نے اسکولوں میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے اپنے یکسر تبدیلی لانے والے کاموں کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ کیسے اٹل ٹنکرنگ لیبس نے طلبا کو جدت طرازی کرنے اور ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے کا اہل بنایا ہے۔ فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر رمیش پوکھریال اور فروغ انسانی وسائل کے وزیر مملکت سنجے شمراو دھوترے بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 ستمبر 2019

مجروح فہمی اور مجروح سلطانپوری

نئی دہلی: صدر جمہوریہ ہند رام ناتھ کووند نے راشٹرپتی بھون میں حال ہی میں شائع مجروح سلطانپوری کی شخصیت اور کمالات پر مشتمل اردو کتاب 'مجروح فہمی' اور ہندی کتاب 'مجروح سلطانپوری: ایک ادھین' کتابیں قبول کرتے ہوئے اردو

شعر و ادب کو سندِ اعتبار بخشی۔ ان کتابوں کی تحقیق، ترتیب اور مقدمہ نگاری کا کام صحافی، قلم کار اور سماجی و ثقافتی کارکن آصف اعظمی نے مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کے زیر اہتمام انجام دیا ہے۔ ممبر پارلیمنٹ مجید میمن کی قیادت میں ایک چھ رکنی وفد کو خالصتاً ان کتابوں کی رسم پیشکش کے لیے صدر جمہوریہ ہند نے شرف ملاقات بخشا اور اس تصویر کو راشٹرپتی بھون نے اپنے ٹوئٹر ہینڈل سے ٹویٹ بھی کیا۔ وفد کے دیگر اراکین میں صاحب کتاب آصف اعظمی، مجلس فخر بحرین کے بانی شکیل احمد صبرحدی، اشاعتی ادارہ گرین پیجز کی سی ای او ونیرہ عنبرین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد اور معروف نقاد پروفیسر شافع قدوائی، اگنو کے سابق رجسٹرار اور ہندی کے استاد پروفیسر جتیندر سریواستو شامل تھے۔ سب سے پہلے مجید میمن نے صدر جمہوریہ کو گلدستہ پیش کر کے عقیدت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد آصف اعظمی نے جملہ اراکین وفد کا باری باری تعارف کرایا نیز کتاب کے مندرجات، مجلس فخر بحرین کی خدمات سے بھی آگاہ کرایا۔ صدر جمہوریہ نے اراکین وفد سے دیر تک غیر رسمی گفتگو کی اور کتاب کی اشاعت کے لیے، بالخصوص مجروح فہمی کے ہندی ترجمہ کی ترتیب و اشاعت کے لیے شکیل احمد صبرحدی اور آصف اعظمی کو نیک خواہشات پیش کیں اور کہا کہ اپنی کاوشوں سے اسی طرح بھارت کا جھنڈا بلند رکھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 اگست 2019

مغلوں کے فارسی دستاویزات

لکھنؤ: امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز و شعبۂ فارسی لکھنؤ کے باہمی اشتراک سے 'مغلوں کے فارسی دستاویزات' کے عنوان سے لکھنؤ یونیورسٹی کے کرشن اوستھی آڈیٹوریم میں 8 اگست کو ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ امریکن انسٹی ٹیوٹ اور ہند و بیرون ہند سے تشریف لائے مختلف شرکا نے اس ورکشاپ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مغلوں کے عہد کے فارسی ذرائع کے حوالے سے اس دور کے تاریخی، جغرافیائی، معاشیاتی اور دوسرے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ امریکی یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر شاہ محمود حنفی نے افغانستان کے قومی آرکائیوں میں موجود بابرنامہ کے نسخے کا تعارف کرایا اور اس کے مبادیات پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ فارسی ادب کے نایاب نسخے صرف کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب کو عوام الناس کے لیے دستیاب کرایا جائے۔ ایک عام طبقہ ان سے محروم ہے، اس لیے اتنی آسانیاں پیدا کرائی جائیں کہ اس طرح کی کتابوں تک ایک ایک شخص کی رسائی ہو جائے تاکہ آنے والی نسلیں مستفید ہو سکیں۔ ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے مرکز تحقیقات کے ایڈیٹر احسان اللہ شکراللہی نے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ گرانقدر فارسی مخطوطات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی اہمیت و افادیت بیان کی اور دانشمندوں اور طلبا کی ان نسخوں کے تئیں عدم دستیابی پر شدید رنج کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے کہا کہ سوامی رنگناتھن نے کتابوں کی حفاظت کے جو اصول وضع کیے پوری دنیا نے اس کو اپنایا لیکن ہندوستان میں اس کی پیروی نہیں ہو رہی ہے اور فارسی ادب کے نایاب نسخے صرف کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ ماہر خطاط حمید رضا قلیچ خانی نے بھی خطاطی کے حوالے سے گفتگو کی اور کتبوں اور مقبروں پر کندہ کتبے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شعبۂ تاریخ کی پروفیسر محترمہ سیما علوی نے اس ورکشاپ میں کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں ہندوستان میں اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی حالات کا ذکر کیا اور مغلوں کے عہد آخر میں 'یونانی طریقۂ معالجہ انگریزی طریقہ علاج کے زیر اثر' اس کے زوال کے علل و اسباب پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آغاز میں امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز کے ہیڈ ڈاکٹر اختشام احمد خان نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے ادارے اور مہمانوں کا تفصیلی تعارف کرایا۔ اس کے بعد ورکشاپ کے صدور شاہ محمود حنفی، امانده لینزیلو، اور پروفیسر عارف ایوبی نے ورکشاپ کے اغراض و مقاصد اور ایجنڈے پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ورکشاپ پورے دن جاری رہا اور اس کے مختلف سیشن ہوتے رہے۔ پہلے سیشن میں ایران، مغل انڈیا، افغانستان، سینٹرل ایشیا، آٹومن امپائر، لارجر انڈین اوشین، سینٹر اینڈ پریفری شاہ محمود حنفی (افغانستان) بہادرین کیہرانی، بریان سٹیز نے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے سیشن میں ترانا ہنس، دیپانجن مجموار، وپن کشنا، امانده لنزیلو، سایک گھوش، ہما رمضان علی، رنجل کراچن، انوراگ ایڈوانی، زہرہ مہدی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ تیسرے سیشن میں نمرتا کنچن، ڈاکٹر حامد رضا قلیچ خانی، ڈاکٹر احسان اللہ شکر لانی، رائیکل ہرچ، ساجدہ حسینی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ چوتھے سیشن میں جان نواک، کیارک، بریک ان رائٹ، اسپینسر وغیرہ نے اپنے مقالات پڑھے۔ پانچویں سیشن میں ڈاکٹر عارف ایوبی، پروفیسر آصف نعیم، پروفیسر احسن الظفر، ڈاکٹر شعیب علوی، ڈاکٹر سید غلام نبی احمد، سید حذیفہ علی ندوی، ڈاکٹر سیما علوی نے اپنے مقالات اور خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں ڈاکٹر اختشام احمد خان کے شکریہ پر ورکشاپ کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 اگست 2019

الواح الصنادید، جلد دوم

نئی دھلی: نئی چیز کی تلاش و جستجو کرتے رہنا تحقیق و ریسرچ ہے۔ ہمیں ہر موضوع اور ہر فن میں تحقیق و ریسرچ کرتے رہنا چاہیے اور نئی نئی چیزوں کو سامنے لاتے رہنا

چاہیے، اور یہی قوم و ملک کی بڑی خدمت ہے۔ ان خیالات کا اظہار مشہور دانشور و مفکر اور ہندوستان کے سابق نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے اپنی رہائش گاہ پر مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کی کتاب الواح الصنادید جلد دوم کے نئے اضافہ شدہ ایڈیشن کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مذکورہ کتاب کی تحسین و ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں سنجیدہ و علمی موضوعات پر ہی اپنی توجہات مرکوز رکھنی چاہیے اور اشتعال انگیز بیانات سے کلی طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اگست 2019

سجاد ظہیر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: ایسے یادگار اور خوشگوار لمحے بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ایک ساتھ اردو شعر و ادب کی متعدد دیو قامت ہستیاں جلوہ افروز ہوں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ میر انیس ہال، دیار میر تقی میر، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سجاد ظہیر یادگاری خطبے میں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر عتیق اللہ اور سجاد ظہیر کی بیٹی نور ظہیر جیسی قاموسی شخصیات بیک وقت مجتمع ہو گئیں۔

سجاد ظہیر یادگاری خطبے میں پروفیسر شارب ردولوی نے 'اردو میں نظریاتی تنقید: پس منظر اور پیش منظر' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں ترقی پسند تحریک سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ معتوب بھی رہی۔ سجاد ظہیر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کی تمام تر شدتوں اور جارحانہ ادعائیت کے ماحول میں اعتدال کا استعارہ ہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب میں نوکلاسیکیت، علی گڑھ تحریک، رومانویت، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے علاوہ اردو تنقید کے مختلف میلانات اور فکری لہروں پر مدلل اور منضبط بحث کی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مہمان خطیب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ نئے تناظر، نئے نظریات، چیلنجز اور مسائل کا سلسلہ کبھی رکنے والا نہیں ہے۔ صحت مند فکر و نظر کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے استقبال کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔ مہمان اعزازی پروفیسر عتیق اللہ نے خطبے کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ اس مقالے نے بہت سے بحث انگیز مسائل پر غور و فکر کے لیے مہمیز کیا ہے۔ کوئی بھی نظریہ یا معیار حرف آخر نہیں ہے۔ پیمانے بنتے ہی ہیں ٹوٹنے کے لیے۔ بحیثیت مہمان اعزازی ڈین فیکلٹی برائے علوم والسنہ پروفیسر وہاج الدین علوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کی کہکشاں اتر آئی ہے۔ ایسا خوبصورت نظارہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے اور یقیناً یہ موقع تاریخی اور یادگار ہے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہزاد انجم نے سجاد ظہیر یادگار خطبے کے حوالے سے کہا کہ اس خطبے کی بنیاد سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے

رکھی تھی اور اس سلسلے میں بیشتر اردو کے عظیم نقاد اور دانشوروں نے یہ یادگاری خطبہ پیش کیا ہے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر کوثر مظہری نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر شاہ نواز فیاض کی تلاوت اور اختتام خطبے کے کنوینر پروفیسر شہپر رسول کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اگست 2019

دہلی:

نئے پرانے چراغ

نئی دہلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیراہتمام دہلی کے بزرگ اور جواں عمر قلم کاروں کا پانچ روزہ ادبی اجتماع

نئے پرانے چراغ کا افتتاحی جلسہ قمر رئیس سلور جبلی ہال میں منعقد ہوا۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور معروف شاعر پروفیسر شہپر رسول نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ نئے پرانے چراغ کا سلسلہ بہت پرانا ہے، اگلے سال اس پروگرام کے 25 برس مکمل ہوجائیں گے۔ مہمانِ اعزازی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اس نئے پرانے چراغ کا انتظار ہر سال شدت کے ساتھ نئے چراغوں کو رہتا ہے۔ اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو اکادمی، دہلی کے تمام کارنامے اہم ہیں۔ افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ نئے پرانے چراغ پروگرام کی واقعی بہت شہرت ہے۔ دہلی کی موجودہ حکومت نے تعلیم اور ثقافت کے میدان میں اردو اکادمی کے ذریعے جس طرح کی بیداری پیدا کی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ پروگرام کے آخر میں اردو اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری مستحسن احمد نے مہمانانِ کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ نئے پرانے چراغ کے افتتاحی اجلاس کے بعد شام کو مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت معروف شاعر پروفیسر خالد محمود نے کی اور مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر رحمان مصور نے کی۔

نئے پرانے چراغ کے دوسرے روز پہلے تحقیقی و تنقیدی اجلاس کی صدارت ہمدرد یونیورسٹی کے پروفیسر غلام یحییٰ انجم اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر خواجہ اکرام نے اور نظامت ڈاکٹر عادل حیات نے کی۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر خواجہ اکرام نے ریسرچ اسکالرز کی اصلاح کی اور انھیں مقالہ لکھنے سے متعلق اہم نکات بتائے۔ اس موقعے پر انھوں نے مزید کہا کہ کبھی بھی اپنے مقالے کا آغاز کسی کے اقتباس سے نہ کریں۔ پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے تمام مقالوں کی خامیوں کو بیان کیا اور ریسرچ اسکالرز کی اصلاح کی اور بتایا کہ زبان و بیان پر دسترس ادب کے ریسرچ اسکالرز کے لیے ضروری ہے۔ تخلیقی اجلاس کی صدارت معروف و معتبر افسانہ و ناول نگار مشرف عالم ذوقی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے سکریٹری کی صاحبزادی افسانہ نگار نور ظہیر نے اور نظامت شاہ نواز ہاشمی نے کی۔ نور ظہیر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پرانی چیزوں کو ایک مستحکم نظریے کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔ افسانہ نگاری کے وقت اصلاحی نقطۂ نظر اور سکھانے کے جذبے کو الگ رکھنا چاہیے۔ اپنی صدارتی تقریر میں مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ یہ دور بولنے کا دور ہے۔ بولنا سیکھیے۔ اگر نہیں بولیے گا تو زبان خاموش ہوجائے گی۔ ہمارا فکشن وقت کے ساتھ بہت دور جاچکا ہے۔ شام کے مشاعرے کی صدارت معروف شاعر جی آر کنول اور نظامت اعجاز انصاری نے کی۔

تیسرے روز کے پہلے تحقیقی و تنقیدی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور ڈاکٹر مظہر احمد نے اور نظامت جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر جاوید عالم نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر مظہر احمد نے بطور فن مظاہرہ پر مزید غور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ بحیثیت مجموعی تمام مقالات قابل توجہ ہیں۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ نئے پرانے چراغ کا جو مقصد ہے اس میں اکادمی کامیاب ہے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ندیم احمد اور معصوم مراد آبادی نے اور نظامت ثاقب عمران نے کی۔ تیسرے روز کے تخلیقی اجلاس میں 13 تخلیقات پیش کی گئیں، جن میں 12 افسانے اور ایک انشائیہ شامل تھا۔ اپنی صدارتی تقریر میں معصوم مراد آبادی نے کہا کہ یہ اردو اکادمی کا بڑا پرانا سلسلہ ہے نئے پرانے چراغ۔ یہ دور بڑے بحران کا دور ہے، جو زبان ہم لکھ رہے ہیں، اس کی اصلاح کی ضرورت ہے کہ نہیں اس پر غور کرنا چاہیے۔

چوتھے روز کے پہلے تحقیقی و تنقیدی اجلاس میں مجلس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہزاد انجم اور صحافی سہیل انجم نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر جاوید حسن نے انجام دی۔ چوتھے تحقیقی و تنقیدی اجلاس میں مختلف موضوعات پر 12 مقالے پیش کیے گئے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں سب سے اچھا بننے کی کوشش کرنی ہے اور سب سے اچھا بننے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ آج کے اجلاس میں جتنے مقالات پڑھے گئے سارے اچھے تھے۔ ظہرانے کے بعد تخلیقی اجلاس کی صدارت معروف افسانہ نگار انجم عثمانی نے اور نظامت ریشما فاروقی نے کی۔

سمینار کے پانچویں یعنی آخری دن تحقیقی و تنقیدی اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر وہاج الدین علوی اور ڈاکٹر خالد جاوید شامل تھے جب کہ نظامت دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد شاداب شمیم نے کی۔ آخری روز کے تحقیقی و تنقیدی اجلاس میں 11 ریسرچ اسکالروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ آخری روز کے تخلیقی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ریاض عمر اور ڈاکٹر مظفر حسین سید نے اور نظامت ڈاکٹر محمد آدم نے کی۔ تخلیقی اجلاس میں 14 تخلیقات پیش کی گئیں۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور اردو کے معروف و ممتاز شاعر پروفیسر شہپر رسول نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ نئے پرانے چراغ کے تمام اجلاس کامیاب ہیں۔ نئے پرانے چراغ کے انعقاد کا مقصد صرف یہ ہے کہ نئے پرانے چراغ پوری طرح اپنے فن کو صیقل کریں اور وہ ادب کے تمام میدان میں اپنا نام روشن کریں۔ میں تمام تخلیق کاروں کو بصمیم قلب مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ان پروگراموں کے انعقاد کا اصل سہرا اردو اکادمی کے تمام ملازمین کے سر جاتا ہے، یہ کامیابی ان ہی کی محنتوں کا ثبوت ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 22 اگست، روزنامہ 'صحافت' 23 اگست و روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26-24 اگست 2019

عبدالرحمن منیف کے ناول مُدنُ الملح پر توسیعی خطبہ

نئی دهلی: جس طرح ناول کسی بھی زبان کو ترقی دلانے میں لسانیاتی طور پر معاون و مددگار ہوتا ہے اسی طرح ناول کی اپنی ایک تاریخی حیثیت بھی ہوتی ہے۔ ناول سماج کے تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور اسی طرح کے بہت سے دیگر امور کا احاطہ کرتا ہے اور اس وقت کے وقائع وسوانح پر محیط ایک تاریخی دستاویز فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے کہ ناول کو تاریخ کے طور پر کس حد تک قبول کیا جاسکتا ہے، مگر اتنا تو ضرور ہے کہ ناول اپنے وقت کا عکاس ہوتا ہے۔ عبدالرحمن منیف ایک مشہور ناول نگار ہیں۔ عبدالرحمن منیف کا یہ مشہور ناول 'مُدنُ الملح' پانچ حصوں میں تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور عالم عرب بالخصوص سعودی عرب کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار کالی کٹ یونیورسٹی کیرلہ سے ملحق فاروق کالج میں شعبۂ عربی کے استاذ ڈاکٹر عبدالمجید نے کیا۔ واضح رہے کہ شعبہ عربی ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی کی ادبی انجمن 'النادی العربی' کے تحت ایک توسیعی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ نعت نبی مقتدا حسن نے پیش کی۔ بعد ازاں شعبہ کے سینئر استاذ ڈاکٹر محمد قاسم عادل نے مہمان گرامی قدر کا پرجوش استقبال کیا اور نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ موصوف نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ حکومتوں کے زیر نگرانی زمانوں کے حوادث وواقعات کو رقم کرنے والوں کے علاوہ دیگر اصحاب قلم بھی حالات حاضرہ کو اپنے مقالات اور ناولوں کا موضوع بناتے ہیں جو حکومتی تاریخ کے متوازی ایک الگ تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں اور سماج میں رونما ہونے والے حوادث کا صحیح منظرنامہ پیش کرتے ہیں، اسی طرح بہت سے ادیب سماج میں وقوع پذیر واقعات وحوادث کو پیش نظر رکھ کر مستقبل کی پیشین گوئی بھی کرتے ہیں اور دور خوش آئند میں ممکنہ طور پر پیش آنے والے حقائق کو وقت سے پہلے ہی خیالی پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ اسی طرح کے ادبا میں عبدالرحمن منیف کا بھی شمار ہوتا ہے۔ توسیعی خطبے کے بعد شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر محمد عبیداللہ نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 ستمبر 2019

اقبال کی نظم پر مذاکرہ

نئی دهلی: اقبال اکادمی کے زیر اہتمام اقبال اکادمی کے ہال میں 'تصویر درد' کے ایک شعر پر ایک فکرانگیز مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس میں شعر کی فکری جہات اور سیاسی پس منظر پر شرکا نے بہت ہی خیال افروز گفتگو کی اور مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے صدارت کی اور اقبال کی فکر کو خوش آمدید کہا۔ ضمیرالدین شاہ سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے بھی اس موقعے پر شرکا کو خطاب کیا۔ پروفیسر عبدالحق نے استقبالیہ تقریر میں اقبال کی سیاسی بصیرت کو آفریں باد کہا کہ بھارت میں انگریزی حکومت کے خلاف یہ پہلی آواز ہے، جو سیاسی رہنماؤں کی بھی زبان پر نہ آسکی تھی اور نہ کسی نے جرأت ہی کی۔ ڈاکٹر راس مسعود کی بیٹی شہزادا انور نے اقبال اور سرسید کے گھرانے کے تعلقات پر تاریخی گفتگو کی۔ ڈاکٹر سید ظفر محمود نے نظم کی خوبیوں کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر معین الدین جینابڑے، پروفیسر سید غضنفر علی، پروفیسر اختر حسین، پروفیسر توقیر احمد خاں، پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر معظم الدین نے عالمانہ مقالے پڑھے اور فکرانگیز گفتگو کی۔ معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر نسرین بیگم، ڈاکٹر شکیل اختر، ڈاکٹر سرفراز جاوید، ڈاکٹر محمد شاہد اور ڈاکٹر محمد اکرم نے اقبال کے تصور محبت کا جائزہ لیا۔ برندا شرما اور محمد مومن نے مترنم آواز میں کلام اقبال پیش کیا۔ مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق نے مذاکرے کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 اگست 2019

علامہ فضل حق خیرآبادی کی حیات وخدمات

نئی دهلی: سیلم پور کے جے بلاک میں واقع مدرسہ فیض العلوم مجددیہ میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی حیات و خدمات پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے صفدر جنگ ہاسپٹل سی سی آر یو ایم، یونانی کے سرپرست ڈاکٹر سید احمد خان نے عالم وفاضل عظیم مجاہد آزادی فضل حق کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ مولانا خیرآبادی ملت کے وہ بطل جلیل ہیں، جنھوں نے انگریز حکومت کے خلاف سب سے پہلا فتویٰ جاری کیا۔ ڈاکٹر خان نے مزید کہا کہ موصوف نے ادبی وسیاسی سرگرمیوں کے ذریعے 1857 کی نوآبادیات مخالف جنگ میں اہم کردار نبھایا۔ البتہ وہ ملک کی آزادی کے تئیں پرعزم تھے اور انھوں نے راجدھانی کی شاہجہانی مسجد میں دیگر محب وطن افراد کے ساتھ جہاد کے فتوے پر دستخط کیے تھے۔ پروگرام کی قیادت کررہے عوامی خدمتگار کمیٹی کے چیف الحاج لیاقت علی مسعودی نے ہندو مسلم اتحاد کے پیروکار فضل حق کی خدمات کے تعلق سے کہا کہ انھوں نے غیرملکی راج اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہندو اور مسلمانوں سے متحد ہوجانے کی پرزور اپیل کی تھی۔ لیاقت علی نے یہ بھی کہا کہ آزادی کی پہلی لڑائی 1857 میں مولانا نے جام شہادت نوش کیا، وہ ملک وقوم سے بے پناہ محبت کرتے تھے، انھوں نے اپنی پوری زندگی ملک کے لیے وقف کردی تھی۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے ٹریژرار حکیم عطاءالرحمن اجملی قاسمی نے کہا کہ موجودہ وقت کے لیے ضروری یہ ہے کہ مسلمان تعلیم پر توجہ دیں، ساتھ ہی اپنی تاریخ سے واقف ہوں، کیونکہ جو قوم اپنی تاریخ بھول جاتی ہے وہ قوم بھی نیست ونابود ہوجاتی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 اگست 2019

'گرونانک صاحب: روحانی ادب اور اردو' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

گرونانک صاحب: روحانی ادب اور اردو

نئی دهلی: اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے یک روزہ سمینار بعنوان 'گرونانک صاحب: روحانی ادب اور اردو' کے افتتاحی اجلاس میں سامعین ومہمانان کرام کا استقبال کرتے ہوئے اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے قمر رئیس سلور جبلی ہال میں کہا کہ جو لوگ دوسروں کے لیے جیتے ہیں ان میں گرونانک دیو کا نام اہم ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ کرکے دکھایا۔ اخوت وبھائی چارہ، محبت والفت کا انھوں نے پیغام دیا اور اس پر عمل کرکے بھی دکھایا، گرونانک دیو

صاحب ہندوستان کی مٹی سے اٹھنے والی مؤثر ترین شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ان کی خدمات اور صلح کل کے رویے نے ہندوستان کو دنیا میں سیکولر کردار کے لیے شہرت دی۔ اس موقعے پر معروف شاعر متین امروہوی نے بابا گرونا نک دیو کی خدمت میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ کلیدی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ناشر نقوی، سابق ڈائرکٹر بابا فرید صوفی سینٹر، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے کہا کہ گرونا نک صاحب صرف پنجابی زبان کے سربراہ نہیں ہیں وہ تمام زبانوں کے سربراہ ہیں۔ گرونا نک کی شخصیت ہر زمانے میں کشش کا سبب تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ گروجی کے مطابق سب سے اہم مذہب وہ ہے، جو خدا سے عشق پر ابھارتا ہے۔ اوشو اور خشونت سنگھ نے ایک اومکار کو اہم قرار دیا ہے۔ افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر جسپال سنگھ، سابق وائس چانسلر، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ نے کہا میں جاننے کی کوشش کرتا رہتا ہوں کہ دیگر زبانوں میں بابا نانک کے بارے میں کیا کچھ لکھا جارہا ہے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ ظہرانے کے بعد مقالوں پر مشتمل اجلاس کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آرٹس فیکلٹی کے ڈین اور ماہر تصوف پروفیسر وہاج الدین علوی اور ماہر تعلیم ڈاکٹر جی آر کنول نے اور نظامت نورین علی حق نے کی۔ پہلے اجلاس میں گرونا نک دیو پر پانچ مقالات پیش کیے گئے۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 1 ستمبر 2019

اتر پردیش:

بھکتی عہد کے ادب کی افادیت

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبۂ ہندی کے زیراہتمام ’بھکتی عہد کے ادب کی افادیت‘ موضوع پر

آرٹس فیکلٹی کے آڈیٹوریم میں خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ مہمان خصوصی ممتاز قلم کار اور کیندریہ ہندی سنستھان آگرہ کے ڈائرکٹر پروفیسر نند کشور پانڈے نے عہد بھکتی کے ادب پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے دور حاضر کے تناظر میں اس کی افادیت کو بیان کیا۔ انھوں نے مذکورہ ادب میں پوشیدہ ان تمام عناصر، اسباب اور قوتوں کا تفصیلی طور پر ذکر کیا جو دور حاضر میں بھی اپنی اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سنتوں نے سنسکرت جیسی زبان کے مقابلے میں عوامی زبان کو ادب کی تخلیق کے لیے منتخب کیا۔ ودیاپتی، تلسی اور آلوار بھکتوں کی مثالوں کے حوالے سے انھوں نے بھکتی ادب میں روایتی زبان کے مقابلے عوامی زبانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ بھکتی عہد کا ادب خواتین تخلیق کاروں کی حصہ داری کو بھی اہمیت عطا کرتا ہے۔ بھکتی عہد کے ادب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر پانڈے نے سنتوں کی تخلیقات میں ہم آہنگی کو خصوصی طور پر نشان زد کیا۔ کبیر، دادو، وغیرہ کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے ثابت کردیا کہ کس طرح سنتوں نے ہر قسم کی تفریق کو دور کرتے ہوئے معاشرے میں ہم آہنگی اور بھائی چارہ کی ترویج واشاعت کی۔ سماجی اور مذہبی برابری، ثقافتی اتحاد اور لسانی انفرادیت کو بھکتی عہد کے ادب کی بنیادی فکر کے طور پر نشان زد کرتے ہوئے پروفیسر پانڈے نے کہا کہ زندگی میں تحمل وغیرہ، داخلی عناصر کا قیام ان کے ادب کا اصل ہدف ہے۔ اس طرح بھکتی عہد کا بنیادی تجزیہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے دور حاضر میں معاشرہ کو درپیش تشویش ناک صورت حال اور سماجی وسیاسی تناظر میں مذکورہ ادب کی اہمیت وافادیت سے حاضرین کو تفصیلی طور پر روشناس کرایا۔ صدارتی خطبے میں پرو وائس چانسلر پروفیسر اختر حسیب نے کہا کہ بھکتی ادب نہ صرف انسانیت کی تعلیم دیتا ہے بلکہ بھائی چارہ، اخوت اور معاشرتی اتحاد کا پیغام بھی دیتا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر محب الحق نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شعبۂ ہندی کے سربراہ پروفیسر عبدالعلیم نے حاضرین کا استقبال کیا جبکہ نظامت پروفیسر شمبھو ناتھ تیواری نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر ضیاء الرحمٰن کی تیار کردہ ہندی اردو لغت کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 19 اگست 2019

کشمیری زبان وادب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جدید ہندوستانی زبانوں کے شعبہ کے کشمیری سیکشن کی جانب سے انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ (آئی سی ایس ایس آر)، نئی دہلی کے اشتراک سے کشمیری زبان و ادب کے موضوع پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کی افتتاحی تقریب سے بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ کسی بھی زبان کی تاریخ سب سے اہم ہوتی ہے اور کشمیری زبان کی بھی قابل فخر تاریخ ہے۔ انھوں نے کہا کہ کشمیری زبان ایک خوبصورت زبان ہے، جس پر فارسی، اردو اور ترکی کے علاوہ وسطی ایشیا کی زبانوں کا بھی اثر نظر آتا ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ سبھی کو اپنی مادری زبان کے تحفظ کے لیے کام کرنا چاہیے۔ پروفیسر منصور نے سمینار کے انعقاد کے لیے آئی سی ایس ایس آر اور سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر مشتاق احمد زرگر کو مبارکباد پیش کی۔ وزارت فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر روپ کرشن بھٹ نے کہا کہ کشمیر صرف اپنے قدرتی حسن کے لیے ہی نہیں بلکہ دانشوری کے لیے بھی دنیا میں شہرت کا حامل رہا ہے۔ تہذیبی تنوع کشمیر کی شناخت رہی ہے، جہاں پر تقریباً پندرہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

روزنامہ ’خبریں‘ دہلی، 8 اگست 2019

تحقیقی طریقہ کار

علی گڑھ: زبان وقت کے ساتھ تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے، جس سے الفاظ کے معانی بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ہر زبان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایمریٹس عرفان حبیب نے کیا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں شعبۂ اردو کے زیراہتمام جامعہ اردو، علی گڑھ کے اشتراک سے تحقیقی طریقۂ کار پر دس روزہ ورکشاپ کے اختتامی پروگرام سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے لفظ ’خدا‘ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عام روایت یہ ہے کہ خدا پارسیوں کا رب ہے۔ انھوں نے کہا کہ رب تو سب کا ایک ہی ہے لیکن پارسیوں کے یہاں اہرمزد، ایزد، یزداں کا استعمال ہوتا رہا ہے جو رب کا ترجمہ ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب نے اردو اور فارسی شاعری میں زبان کی تقلیب سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ زبان میں ایک لفظ نہیں بلکہ بہت سے ایسے الفاظ اور تراکیب ہیں جو وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ پروفیسر عرفان حبیب نے فردوسی کے شاہنامے سے متعلق خصوصی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عربوں سے متعلق شاہنامے میں ایران کی سرزمین سے محبت اور وہاں کی وراثت سے لگاؤ فردوسی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی شاعری میں مذہب کی نکتہ چینی پائی جاتی ہے۔ عمر خیام اور حافظ کو دیکھیں تو یہ بات بہت ملتی ہے۔ فارسی میں معشوق مؤنث ہوتا ہے۔ پروفیسر عرفان حبیب نے کہا کہ امیر خسرو نے صنم، بت خانہ، بت پرستی، برہمن اور زنار کی

اصطلاحات کا آغاز کیا۔ اس سے قبل پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، جبکہ ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی نے دس روزہ ورکشاپ میں خطبہ دینے والے سبھی ماہرین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سرفراز خالد نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 اگست 2019

ادبی مطالعے میں ترجمہ کی اہمیت و افادیت

وارانسی: ترجمہ انسان کی ابتدائی اور بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کی ترقی اور خوش حالی ممکن نہیں۔ اس لیے ترجمہ کی اہمیت و افادیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر طارق خان نے کیا۔ مورخہ 7 اگست 2019 کو شعبۂ اردو نے سمینار ہال میں شعبۂ عربی اور فارسی کے اشتراک سے ایک خصوصی لیکچر بعنوان 'ادبی مطالعے میں ترجمہ کی اہمیت و افادیت' منعقد کیا۔ جس کی صدارت پروفیسر اشفاق احمد (صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی) نے فرمائی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں عربی تراجم کی شاندار تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ عرب نے اس وقت روشنی دکھائی جب پوری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن عربی میں موجودہ دور بھی ترجمہ کے لیے کافی زرخیز رہا ہے۔ خاص طور پر مصر اور بیروت نے اس کام میں اہم کردار ادا کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد عقیل (صدر شعبۂ فارسی) نے فارسی تراجم کی تاریخ اور فارسی کے ادبی ورثے پر گفتگو فرمائی۔ ڈاکٹر مشرف علی (نگراں دستک ادبی فورم) نے اپنے استقبالیہ کلمات میں مہمان مقرر ڈاکٹر طارق خاں کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر طارق کی تعلیم و تربیت پٹنہ اور حیدرآباد میں ہوئی ہے اور وہ ہندوستان کے بڑے مقابلہ جاتی امتحان پاس کر کے اس منصب پر پہنچے ہیں۔ انھوں نے نیشنل ٹرانسلیشن مشن کو جو بلندی عطا کی ہے وہ قابل رشک ہے۔ پروگرام کا آغاز یونیورسٹی کی روایت کے مطابق پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمے پر گل پوشی اور یونیورسٹی کے کل گیت سے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ہوا، اس تقریب کی نظامت شعبہ کے استاد جناب عبدالسمیع نے کی اور شکریہ کی رسم محترمہ رقیہ بانو نے ادا کی۔

پریس ریلیز: آفتاب احمد آفاقی، صدر شعبۂ اردو، بی ایچ یو، 8 اگست 2019

بزم ادب خواتین

علی گڑھ: علی گڑھ کی ممتاز ادبی و ثقافتی تنظیم 'بزم ادب خواتین' کی ماہانہ نشست ملک کی ممتاز شاعرہ اور بزم کی باوقار رکن محترمہ صبیحہ سنبل کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی جس کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد بزم کی سکریٹری نے رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ نشست میں ممتاز افسانہ نگار محترمہ حنا مرتضی نے اپنا تازہ ترین افسانہ 'امید کی کرن' پیش کیا جسے داد و تحسین سے نوازا گیا۔ ان کے بعد محترمہ انجم قدوائی نے اپنا بے حد معیاری افسانہ 'باغبان' پیش کیا جس نے تمام حاضرین سے داد و تحسین وصول کی۔ ان کے بعد ممتاز افسانہ نگار و ناول نگار محترمہ نسترن احسن فتیحی نے اپنا خوبصورت اور جذباتی افسانہ 'ادراک' پیش کیا جبکہ باوقار قلم کارہ محترمہ شمیم آصف نے 'جنگ آزادی میں ہندوستانی مسلمانوں کا رول' عنوان سے اپنا ایک پر مغز مضمون پیش کیا اور محترمہ آصف اظہار علی نے اپنے معیاری افسانے 'درد کا رشتہ' کے علاوہ اپنے چندہ اشعار بھی پیش کیے۔ نشست میں ممتاز شاعرہ محترمہ عفت صدیقی نے کشمیر کے موجودہ حالات پر اپنی تازہ نظم پیش کی۔ نشست کے اختتام پر میزبان محترمہ صبیحہ سنبل نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 ستمبر 2019

بین الاقوامی اردو فیسٹیول

کانپور: بھارتیہ وچارک سمیتی اور اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے بین الاقوامی اردو فیسٹیول ہفتہ کا راگیندر سروپ آڈیٹوریم میں انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کے مہمان

خصوصی رکن راجیہ سبھا اشوک باجپئی تھے۔ اس موقعے پر اشوک باجپئی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مودی حکومت جس طرح سنسکرت کے تحفظ کے لیے کوشاں ہے اسی طرح اردو کی ترقی کے لیے بھی کام کر رہی ہے۔ پروگرام کا آغاز 'اردو ہے مرا نام' نظم سے دیانند گرلس پی جی کالج کی طالبہ کے ذریعے کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت کنوینر ڈاکٹر حنا افشاں نے کی۔ پروگرام کے مہمان اعزازی اور اتر پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری ایس رضوان نے اردو زبان کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ مہمان اعزازی انیس انصاری سبکدوش وائس چانسلر خواجہ معین الدین اردو عربی فارسی یونیورسٹی نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر سادھنا سنگھ پرنسپل دیانند گرلس کالج نے کہا کہ ہمارا ملک دنیا میں ثقافت کی انوکھی مثال ہے۔ اردو زبان ہماری مشترکہ وراثت کا ثبوت ہے۔ پروگرام کے مقرر خصوصی پروفیسر شارب ردولوی نے دونوں زبانوں کی وراثت پر خطاب کیا۔ ان کے علاوہ پروفیسر شکیل صمدانی، پروفیسر صغیر ابراہیم نے اردو اور ہندی ادب میں اردو ہندی کے تعاون پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 ستمبر 2019

مجروح سلطان پوری: حیات و خدمات

پریاگ راج: ہندوستانی اکادمی کے زیر اہتمام اکادمی کے ہال میں مشہور ترقی پسند شاعر مجروح سلطان پوری کی صد سالہ تقریب میں 'مجروح سلطان پوری: حیات و خدمات موضوع' پر ایک سمینار کا انعقاد ہوا جس کی صدارت اکادمی کے صدر ڈاکٹر ادے پرتاپ سنگھ نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر شبنم حمید صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی نے شرکت کی۔ اس دوران صدارتی خطاب میں ڈاکٹر ادے پرتاپ سنگھ نے کہا کہ مجروح سلطان پوری ایک قومی شاعر تھے۔ ہندوستانی سماج کو بڑی باریکیوں سے انھوں نے پرکھا تھا اور انھیں اس بات کی بھی مہارت حاصل تھی کہ ملک کو کیسے بلند و بالا بنایا جائے۔ ان کے ہر شعر میں ہندوستانی تہذیب کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ پروفیسر شبنم حمید نے کہا کہ مجروح سلطانپوری فکری اعتبار سے ترقی پسند شاعر تھے۔ انھوں نے سماج میں تاریخی وراثت کو کہانی اور خیال کے روپ سے پیش کیا۔ مجروح ہمیشہ اپنی شاعری کے ذریعے یاد کیے جاتے رہیں گے۔ وہ ایک عظیم شخصیت والے شاعر تھے جنھوں نے غزلوں کو ایک نئی جلا بخشی ہے۔ پروگرام کے آغاز سے تمہیدی کلمات پیش کرتے ہوئے شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی نے کہا کہ سماجی مسائل کو غزل کے انداز میں پیش کیا۔ ان کے یہاں شرافت، صداقت جرأت اور ہمت بھی تھی۔ انھوں نے زمانے کا شکوہ بڑے سلیقے سے کیا۔ صد سالہ تقریب میں محمد ریحان، اکادمی کے خازن روی نندن نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر ہندوستانی اکادمی کے پریسنواد کا اجرا بھی کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اگست 2019

بہار:

ہندوستانی تہذیب اور فراق گورکھپوری

چھپرہ: جے پی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک روزہ توسیعی خطبہ بعنوان 'ہندوستانی تہذیب اور فراق

گورکھپوری' کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کے آغاز میں شعبۂ اردو کے صدر ارشد مسعود ہاشمی نے مہمانوں کو تعارف کرایا اور مختصر تقریر میں فراق گورکھپوری کی شخصیت اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ توسیعی خطبہ میں پروفیسر مولی بخش صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کہا کہ فراق ہمیشہ خود کو ہندو ہیومنسٹ کہتے تھے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ شعوری طور پر اردو شاعری کو حقیقی ہندوستانی تہذیب اور اس کے تہذیبی لوازمات پر زور دیا۔ فراق گورکھپوری اردو غزل کے چوتھے ستون کہے جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی رباعیوں اور غزلوں میں پوسٹرل حسن و جمال اور گھر گرہستی سے وابستہ عورت کے محبوب کا تصور دیا ہے۔

پروفیسر رضی الرحمٰن، صدر شعبۂ اردو، دین دیال اوپادھیائے یونیورسٹی گورکھپور نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فراق گورکھپوری نے ہندوستانی تہذیب کو بہت ہی اچھے انداز میں بیان کرکے اردو شاعری کو بلندی عطا کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے جدید طرز احساس کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، وہیں سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر نبی احمد نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ فراق گورکھپوری کی شاعری آج بھی ہماری زندگی کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ تقریب کی نظامت صدر شعبۂ کے استاذ ڈاکٹر مظہر کبریا نے کی۔ انھوں نے کہا کہ فراق گورکھپوری گل نغمہ کے خالق ہیں جنھیں ہندوستانی ادبیات کا سب سے بڑا ایوارڈ گیان پیٹھ (1969) سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اگست 2019

تلنگانہ:

ادب اطفال مادری زبان کے حوالے سے

دانش گاہ اسلامیہ اسکول کے کیمپس میں ڈاکٹر الحاج عبدالروف کی صدارت میں 'ادب اطفال' سیمینار منعقد ہوا۔ حیدرآباد

سے تشریف لائے مہمان آل انڈیا اردو ماس کمیونیکیشن کے صدر ڈاکٹر مختار احمد فردین، جناب اقبال صاحب کوکاتا، ٹی ڈی، بی کالج کی پروفیسر محترمہ ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا اور ادیب سیف الاسلام سیف نے اس سیمینار میں شرکت کی جب کہ ابتدائی پروگرام کی نقابت ادارے کے مدرس شکیل احمد نے کی۔ پروگرام کا آغاز درجہ ہفتم کے طالب علم محمد شاد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد علامہ اقبال کی نظم 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری' جناب اقبال صاحب کوکاتا نے نہایت ہی خوش گلوآواز میں پیش کی۔ افتتاحی کلمات جناب ڈاکٹر الحاج عبدالروف نے پیش کیا۔ ساتھ ہی بچوں کے ادب کے سلسلے چند مفید باتیں پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ دانش گاہ اسلامیہ اسکول میں بچوں کے ادب کے سلسلے سے سال میں تین چار پروگرام ہوتے رہتے ہیں جس سے بچوں کی ادبی تربیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بچوں کا ادب دوسو سال قبل سے رائج ہے۔ ان شعرا و ادبا کا بھی ذکر کیا جنھوں نے بچوں کے ادب کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ بالخصوص ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، علامہ اقبال، مولانا اسمٰعیل میرٹھی، ڈاکٹر ذاکر حسین قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ ادب کے تین حصے ہوتے ہیں۔ پہلا علمی ادب، دوسرا تفریحی ادب، اور تیسرا تربیتی یا اخلاقی ادب۔ بچے معلومات میں اضافہ کے لیے علمی ادب کے نظریے سے مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ دوسرا تفریحی ادب کا مطالعہ کرنے والے بچے تفریحی ادب کا مطالعہ کرکے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں اور تیسرے ادب میں بچے نظموں اور کہانیوں کی مدد سے اچھی تربیت پاتے ہیں، ان ہی چند باتوں کے ساتھ مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے اپنی بات ختم کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر مختار احمد فردین نے اپنے موضوع 'ادب اطفال' پر ایک جامع تقریر کی۔ انھوں نے بچوں کو لکھنے اور ڈرائنگ پر توجہ دینے پر زور دیا۔ اس کے علاوہ محترمہ صابرہ خاتون حنا پروفیسر ٹی۔ ڈی۔ بی کالج رانی گنج اور جناب سیف الاسلام نے بچوں کے ادب پر تفصیلی گفتگو کی اور بچوں میں یہ ذوق کیسے پیدا ہوا، ان نکات پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

پریس ریلیز: مختار احمد فردین، 21 اگست 2019

کرناٹک:

گوریا بچہ کنڑا ہائی اسکول

بیدر: یاران ادب ایک اردو تنظیم ہے، لیکن اس کے باوجود اس تنظیم نے کنڑا طلبہ میں اسکول بیگ اور نوٹ بکس تحفہ کے طور پر تقسیم کرکے لسانی بھائی چارے کی مثال پیش کی ہے۔ یہ ایک قابل تقلید کام ہے جو پچھلے سال بھی کیا گیا تھا۔ دیگر تنظیموں اور افراد کو بھی اس طرح دیگر میڈیم کے اسکولوں میں تعاون کی طرف توجہ دینا چاہیے تاکہ طلبہ کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور وہ بھائی چارے کے ذہن کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھ سکیں۔

یہ بات رکن قانون ساز کونسل جناب اروند کمار ارلی نے کہی۔ گاندھی ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے چلائے جانے والے 'گوریا بچہ کنڑا ہائی اسکول' موقوعہ باورچی گلی بیدر میں یاران ادب کی جانب سے طلبہ میں اسکول بیگ، نوٹ بکس اور پین کی تحفۃً تقسیم پرگرام میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ ایم ایل سی ارلی نے طلبہ و طالبات سے کہا کہ وہ نیا اور غلط اتہاس نہ پڑھیں۔ جو سچ ہے اس اتہاس کو پڑھنے کا معمول بنالیں۔ پروگرام کے مہمان اعزازی جناب رفیق احمد گادگی موظف محکمہ ایکسائز افسر نے کنڑی زبان میں طلبہ کو اخلاقیات پیش کیں اور بتایا کہ طلبہ اپنی خوبیوں کو پہچانتے ہوئے والدین، سماج اور ملک کی خوشی اور ترقی کے لیے کام کریں۔ اس موقعے پر یاران ادب بیدر کی جانب سے 40 طلبہ و طالبات میں اسکول بیگ، نوٹ بکس اور پین کی تقسیم ایم ایل سی اروند کمار ارلی، رفیق احمد گادگی، محمد یوسف رحیم بیدری اور صدر معلم پرہلاد تلگھاٹ کرکے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پروگرام کی صدارت اسکول کے صدر معلم پرہلاد تلگھاٹ کرنے کی۔ نظامت کا فریضہ شیام راؤ مقطعہ دار ٹیچر نے بخوبی انجام دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 ستمبر 2019

یاران ادب اور بیٹیاں کے زیر اہتمام پروگرام کا انعقاد

بیدر: اردو ادب کی ادبی، فلاحی اور تعلیمی تنظیمیں یاران ادب اور بیٹیاں کے اشتراک سے الامین ڈگری کالج بیدر میں 26 اگست کو ڈگری کالج کی طالبات کے درمیان مختلف پروگراموں کا انعقاد الامین عبدالمجید خان میموریل ہال، الامین کیمپس، بہمنی روڈ بیدر میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر منعقدہ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر مقبول احمد

پرنسپل الامین ڈگری کالج بیدر نے بتایا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ میری زبان اردو نہیں ہے لیکن الامین ادارے کی مہربانی ہے کہ آج میں اردو زبان میں کچھ لب کشائی کرسکتا ہوں اور اردو لکھتا، پڑھتا اور اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں۔ محترمہ سیدہ وسیم بانو نے طالبات سے اپیل کی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کم نہ سمجھیں۔ چھوٹا سا اچھا کام کسی کی زندگی بدل سکتا ہے اور دوسروں سے زیادہ ہمیں اپنی زندگی خود بدلنے کی ضرورت ہے۔ کہانیاں لکھنا، تقاریر میں حصہ لینا یا نعت گوئی وغیرہ وہ کام ہیں جس کے ذریعے ہم اپنی صلاحیتوں کو نمایاں کرسکتے ہیں۔ پروگرام کے تحت آج ڈگری کالج کی جن طالبات نے حمد و نعت خوانی، افسانہ نویسی، تقریر اور ڈرائنگ مقابلوں میں حصہ لیا اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ حمد مقابلوں میں عصفیہ انجم، طہورہ انجم، نعتیہ مقابلوں میں صدف جہاں، نشرح ناز، سیدہ ہاجرہ فاطمہ۔ افسانہ نویسی میں طالبہ مریم خانم، سیدہ بشریٰ عائشہ بانو، قرۃ العین، زیبا مریم، سنجنا، فرح طیب اور سمرین بیگم۔ تقریری مقابلوں میں عائشہ بانو اور قرأت العین۔ دونوں طالبات کا موضوع مختلف تھا اور دونوں نے مختلف انداز میں اپنی تقریریں پیش کیں۔ ڈرائنگ مقابلوں میں مہروش فطین، بشریٰ، سمیہ نورین، امرین بیگم، سیدہ بشریٰ نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 اگست 2019

مہاراشٹر:

بچوں کی دنیا کے مشن چاند پر خصوصی شمارے کی مقبولیت

اورنگ آباد: اورنگ آباد کے اردو اسکولوں کے طلبا میں قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی سے شائع ہونے

والے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کے بھارت کے مشن چندریان 2 اور یوم اساتذہ کی مناسبت سے شائع ستمبر کے خصوصی شماروں کی پانچ ہزار کا پیاں شہر کے مختلف اردو اسکولوں کے طلبا نے خریدیں، واضح رہے کہ شہر کی معروف سماجی و تعلیمی تنظیم ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے اس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مشن چاند کے 50 سال پورے ہوگئے ہیں۔ 20 جولائی 1969 کو امریکہ کا مشن اپولو 11 بے حد کامیاب رہا تھا۔ NASA مشن چاند کی نصف صدی کا جشن منا رہا ہے۔ فاؤنڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے شہر کے مختلف اسکولوں میں پہنچ کر طلبا کو بچوں کی دنیا کے اس خصوصی شمارہ کی معلومات دیتے ہوئے کہا کہ انسان کے چاند پر پہنچنے کی پچاسویں سال گرہ پر بھارت کے ذریعے بھی 'باہوبلی' نام کا ایک مصنوعی سیارہ 22 / جولائی 2019 کو سری ہری کوٹا سے داغا گیا جو GSLV Mark3 نامی راکٹ چندریان۔2 کو لے کر چاند کی سطح پر پہنچنے کے لیے روانہ ہوگیا ہے، اس کا وزن 8-3 ٹن ہے۔ انھوں نے طلبا کی مزید رہنمائی کرتے ہوئے کہا کہ تقریباً دس سال قبل اکتوبر 2008 میں بھارت نے پہلی بار چندریان 1 خلا میں بھیجا تھا، جو چاند کے مدار میں 312 دن رہا۔ اورنگ آباد مہانگر پالیکا کے تحت جاری شاہ بازار اردو ہائی اسکول کے طلبا و اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے یوم اساتذہ کی مناسبت سے رہنمائی کرتے ہوئے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی زندگی اور ان کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ طلبا و اساتذہ کو چاہیے کہ ہم بھارت کے عظیم سپوتوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور ان کے بتائیں ہوئے راستوں پر چل کر ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کریں۔ اس موقعے پر اسکول کی صدر معلمہ قیصر بیگم خالد، عبداللطیف سر، شاہ بانو، فوزیہ بیگم، عابدہ بیگم موجود تھیں، دیگر طلبا و اساتذہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ اورنگ آباد شہر کے تقریباً سبھی اردو اسکولوں میں ماہنامہ بچوں کی دنیا کے اس خصوصی شمارے کو پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا مقصد طلبا میں خلائی سائنس سے دلچسپی پیدا کرنا اور انھیں مزید مطالعہ، تلاش و جستجو کے لیے تیار کرنا تھا۔ فاؤنڈیشن کے توسط سے شہر کے مختلف اسکولوں کے طلبا میں مطالعہ کا شوق اور کتابیں خرید کر پڑھنے کا رجحان پیدا کرنے کے لیے قومی تہواروں کے ساتھ عظیم رہنماؤں کی یوم پیدائش و وفات پر ان کی زندگی پر شائع کتابوں کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے، گذشتہ 6 برسوں میں اٹھارہ ہزار طلبا کو مفت کتابیں تقسیم کی گئی ہیں۔ یہ اطلاع ریڈ اینڈ لیڈ کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے دی ہے۔ ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا خصوصی شمارہ اقرا اردو ہائی اسکول، معین العلوم اردو ہائی اسکول، میمن اردو ہائی اسکول، ملک عنبر اردو ہائی اسکول، النساء اردو ہائی اسکول، فاطمہ اردو ہائی اسکول کے علاوہ شہر کے دیگر اسکولوں کے پانچ ہزار طلبا نے 'بچوں کی دنیا' خرید کر اپنے اساتذہ کو خراج تحسین اور بھارت کے مشن چندریان 2 کو سلامی دی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 ستمبر 2019

مغربی بنگال:

ادبیات بنگالہ: جہات و امکانات

کولکاتا: 'ادبیات بنگالہ: جہات و امکانات' کے کلیدی عنوان سے دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کی ادبی سب کمیٹی کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے معروف شاعر و ادیب پروفیسر قیصر شمیم نے کہا کہ چند زبانیں ایسی ہوتی ہیں جن کو صرف زبان کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو انھی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ زبان اپنی تہذیب سے ایسی جڑی ہوئی ہے جسے نہ کل حاشیے پر رکھا جاسکتا ہے نہ آج۔ بنگال میں اردو ادب کی دیرینہ روایت رہی ہے اور یہاں کا ادب علاقائی دشواریوں کے باوجود قومی سطح پر اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ ڈاکٹر نوشاد مومن اور انسٹی ٹیوٹ کے تمام اراکین مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسے موضوع کا انتخاب کیا جس کی ضرورت آج کے تناظر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس پروگرام کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام الٰہی سے ہوا اور اختتام مرحوم علقمہ شبلی اور اظہار الاسلام کی دعائے مغفرت پر ہوا۔ اعزازی لٹریری سکریٹری ڈاکٹر نوشاد مومن نے سیمینار کی غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار سے بیرون بنگال اور اندرون بنگال کے معروف قلمکار متعدد عنوانات کے تحت یہاں کی ادبی سرگرمیوں اور مختلف اصناف پر قلمکاروں کی طبع آزمائی کس حد تک ادب کے اقدار کو روشن اور اس کے معیار میں اضافہ کرتے ہیں۔ خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے اعزازی جنرل سکریٹری جناب نثار احمد نے کہا کہ ہمارا ادارہ سو سال سے زائد کا سفر طے کرچکا ہے۔ اس نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

'ادبیاتِ بنگالہ: جہات و امکانات' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

ہماری ادبی کمیٹی اس وقت جتنی فعال نظر آرہی ہے اس میں ڈاکٹر نوشاد مومن کی انتھک محنت شامل ہے۔ یہ ان کی ذہنی اپج کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا اور ایسے ایسے مقالہ نگاروں کو دعوت قلم دیا جن کی ادبی خدمات سے آج کا معاصر ادبی منظرنامہ خوش رنگ نظر آتا ہے۔ ادارے کے صدر جناب ندیم الحق ممبر پارلیامنٹ راجیہ سبھا نے اپنی تقریر میں کہا کہ جس طرح طلبا و طالبات اور اہل علم کی بڑی تعداد اس سمینار میں موجود ہے اس سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہاں آج بھی ادب کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر نوشاد مومن کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے سامعین اور اہم مقالہ نگاروں کی تشریف آوری پر شکریہ ادا کیا۔ دلی دوردرشن نیوز کے ڈپٹی ڈائرکٹر جناب خورشید اکرم نے کہا کہ ہمیں یاد آتا ہے کہ تقریباً بیس برس پہلے نعیم انیس نے اسی ادارے کے زیر اہتمام بنگال کا اردو ادب کے عنوان سے سمینار کروایا تھا جس میں ریاست کے اہم قلمکاروں نے اپنے مقالے پیش کیے تھے۔ آج 20 سال بعد نوشاد مومن نے ادبیات بنگالہ جہات و امکانات کے کلیدی عنوان سے ادب میں ہوئی نئی تبدیلیوں کا احاطہ کرنے کے پیش نظر اس کا دائرہ قومی پیانے پر وسیع کیا ہے۔ انھوں نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ ہر ایک اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ ادبی سب کمیٹی کے چیئرمین اچاریہ جمال احمد نے بھی جلسے کو خطاب کیا اور اپنے تہنیتی قطعات سے سامعین کی خوب داد وصول کی۔ صدر جلسہ ڈاکٹر ابوبکر جیلانی نے صدارتی خطبے میں انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی کے روشن پہلو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سمینار کے متعدد عنوانات کے تحت پیش کیے جانے والے مقالوں سے بنگال کی ادبی سمت و رفتار کا بہ خوبی اندازہ لگانے جانے کی توقع ہے۔ افتتاحی دور کے صدارتی کلمات کے بعد سمینار کے پہلے تکنیکی اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم نے کی جس میں چار مقالے پیش کیے گئے۔ پہلا پرچہ ڈاکٹر غالب نشتر نے بنگال کے اردو فکشن میں تہذیب و معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے پیش کیا۔ اپنے مقالے میں انھوں نے ارض بنگالہ کے ان چار افسانہ نگاروں پر روشنی ڈالی جن کے افسانوں میں بنگال کا کلچر وافر تعداد میں نمایاں ہیں۔ انیس رفیع، صدیق عالم، اظہارالاسلام، شبیر احمد پر تفصیل سے گفتگو کی ان کے خیال میں بنگالی تہذیب کو یوں بھی ایک کلاسیکی تہذیب کا درجہ حاصل ہے۔ اردو افسانے کو ایسے فنکاروں کا احسان ماننا چاہیے۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر عبدالحی نے بنگال کی ادبی صحافت: ماضی اور حال کے عنوان سے پیش کیا۔ اپنے پرمغز مقالے میں انھوں نے ابتدا تا حال ادبی صحافت کے ان جیالوں کا ذکر کیا جنھوں نے اس میدان عمل میں ایک طویل مدت گزاری ہے۔ تیسرا مقالہ اردو لسانیات اور مغربی بنگال کے حوالے سے ڈاکٹر درخشاں زریں نے پیش کیا۔ اپنے مقالے میں انھوں نے سرزمین بنگالہ کے ان تمام ماہر لسانیات کا تفصیلی جائزہ لیا جنھوں نے قومی اور عالمی سطح پر اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔ اپنی تحقیق کے حوالے سے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ ماضی کی طرح عصر حاضر میں بھی چند ایسے درخشاں ستارے ہیں جن کی لسانی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ پہلے سیشن کا آخری مقالہ ڈاکٹر منصور عالم نے پیش کیا حالانکہ انھوں نے اپنی سہولیت کے لیے عنوان میں کچھ رد و بدل کرکے اسے بنگال کی نظموں میں اخلاقی قدروں کی تلاش بنا دیا۔ مقالے میں انھوں نے کچھ نئے اور بیشتر پرانے نظم گو شعرا کے حوالے سے اپنے عنوان کے ساتھ انصاف کرنے کی اچھی کوشش کی۔ اخیر میں صدر اجلاس جناب قیصر شمیم نے پیش کیے گئے تمام مقالات پر تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مقالہ نگاروں کی کاوشوں کو سراہا اور انھیں کچھ نیک مشوروں سے نوازا۔ قیصر شمیم کے صدارتی کلمات اور ڈاکٹر نوشاد مومن کے اظہار تشکر کے بعد پہلا تکنیکی سیشن اختتام کو پہنچا۔ اتوار کو دوسرے تیسرے اور چوتھے تکنیکی اجلاس میں خورشید اکرم، حقانی القاسمی، ظہیر انور، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر احمد کفیل، ڈاکٹر سنجر ہلال بھارتی، ڈاکٹر امتیاز وحید، ڈاکٹر عمر غزالی، جناب مقصود دانش، ڈاکٹر نیلوفر فردوس، ڈاکٹر سید علی عرفان نقوی وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔

سمینار کے دوسرے دن کل تین سیشن ہوئے۔ پہلے سیشن کے صدور جناب انیس رفیع اور جناب خورشید اکرم تھے۔ اس سیشن میں نیلوفر فردوس، مقصود دانش، ڈاکٹر عمر غزالی اور ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اپنے پرمغز مقالے پیش کیے۔ صدارتی خطبے میں صدور نے لٹریری کمیٹی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے تمام مقالہ نگاروں کو مبارکباد دی اور اپنے تحفظات سے انھیں روشناس بھی کرایا۔ تیسرے تکنیکی اجلاس میں بھی چار مقالے پڑھے گئے جس کی صدارت جناب حقانی القاسمی اور جناب ابوذر ہاشمی نے کی۔ ڈاکٹر سنجر ہلال بھارتی، ڈاکٹر احمد کفیل، جناب خورشید اکرم، اور ظہیر انور نے اپنے مبسوط مقالے پیش کیے۔ تیسرے اور آخری سیشن کی صدارت ڈاکٹر نسیم احمد نسیم اور جناب کلیم حاذق نے کی جس میں ڈاکٹر امتیاز وحید، معروف ناقد جناب حقانی القاسمی، عرفان نقوی نے مقالے پیش کیے۔ معروف ناقد حقانی القاسمی نے بنگال کے معاصر ادبی منظرنامے پر جامع اور پرمغز گفتگو کی۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم اور جناب کلیم حاذق نے صدارتی کلمات ادا کیے۔ اخیر میں جمال نے اظہار تشکر کیا۔

رپورٹ: خورشید جہاں/ غالب نشتر 25 اگست و روزنامہ اخبار مشرق 26 اگست 2019

اردو ادب اور ہندوستانی فلمیں

کلکتہ: کلکتہ گرلس کالج کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام 'اردو ادب اور ہندوستانی فلمیں' کے موضوع پر توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو ادب کی معروف شخصیت اور معتبر افسانہ نگار جناب خورشید اکرم نے اپنے

پرمغز خطبہ سے حاضرین اور طالبات کو مستفیض کیا۔ اس پروگرام کی صدارت کالج کی پرنسپل ڈاکٹر ستیہ اپادھیائے نے کی۔ پروگرام کے ناظم اور شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر نعیم انیس نے حاضرین سے خورشید اکرم کا تعارف کراتے ہوئے ان کی حیات و ادبی خدمات پر مختصر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ہندوستانی فلموں کے آغاز و ارتقا پر مفصل گفتگو

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام سالانہ جلسہ تقسیم انعامات برائے اردو کتاب 2018

کرتے ہوئے عصر حاضر تک فلموں کا ایک خاکہ پیش کیا اور اردو زبان و شاعری کس طرح سے ان فلموں کی تیاری میں معاون ثابت ہوئی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اپنے خطبہ میں ہندوستانی فلم اور اردو ادب جیسے دقیق موضوع کو فاضل خطیب نے بہت خوش اسلوبی سے سمیٹا اور بقول شخصے 'دریا کو کوزے میں بند کردیا'۔ خورشید اکرم کے مطابق فلمیں چونکہ کمرشیل مقاصد کو ذہن میں رکھ کر بنائی جاتی ہیں اس لیے اردو زبان و ادب سے وہ اتنا ہی استفادہ کرتی ہیں جتنا کہ ان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ ان کے نزدیک رقص و گیت ہندوستانی فلموں کی پہچان ہیں اور فلمی گیتوں کا کینڈا اردو شاعروں نے ترتیب دیا ہے۔ نیز فلموں میں مکالمہ نگاری اور گیتوں میں اردو زبان کا ہمیشہ سے ہی غلبہ رہا ہے۔ تاہم خورشید اکرم کو اس بات کا احساس ہے کہ فلموں میں ہٹ گیتوں کے ہونے کے باوجود اردو شاعری میں ایسے گیتوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اور انھیں اردو شاعری کے زمرے سے اکثر دور ہی رکھا گیا ہے۔

پریس ریلیز: انیس نعیم، کلکتہ، 28 اگست 2019

اعزاز و اکرام:

اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام سالانہ جلسہ

تقسیم انعامات برائے اردو کتب 2018 کا انعقاد

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام سالانہ جلسہ تقسیم انعامات برائے اردو کتب سال 2018 کا انعقاد قمر رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا کو گلدستہ پیش کر کے پروفیسر شہپر رسول، وائس چیئرمین اردو اکادمی اور اکادمی کے سکریٹری ایس ایم علی نے ان کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے کہا مصنفین کی ضرورت ہر زمانے کو تھی اور رہے گی۔ لکھنے والوں سے میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لکھنے سے ڈریں نہیں۔ آج بھی پڑھنے والے بہت ہیں۔ کتابیں زندہ ہیں، زندہ رہیں گی اور ہمیں بھی زندہ رکھیں گی۔ میں آپ سب کو دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس سے قبل اپنی استقبالیہ تقریر میں پروفیسر شہپر رسول نے تمام انعام یافتگان کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتاب کی طباعت کسی زمانے میں بڑا کارنامہ ہوتا تھا، کتابیں چھاپنے کے لیے قدیم مصنفین کو بڑی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ استاد ذوق کی زندگی میں ان کا دیوان نہیں چھپ سکا تھا۔ آج بہت سی ایسی کتابیں بھی چھپ رہی ہیں، جن کا چھپنا واقعہ نہیں۔ اردو اکادمی کے سکریٹری ایس ایم علی نے نائب وزیر اعلیٰ اور تمام سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تمام انعام یافتگان کو مبارکباد دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اگست 2019

پروفیسر عتیق اللہ 'اقبال سمان' سے سرفراز

نئی دھلی: مدھیہ پردیش بھون، چانکیہ پوری میں منعقدہ ایک مخصوص تقریب میں جناب پنکج راج، پرنسپل

سکریٹری، آرٹ اینڈ کلچر مدھیہ پردیش کے دست مبارک سے اقبال سمان کے نام سے موسوم قومی سطح کا ایوارڈ پروفیسر عتیق اللہ کو مرحمت کیا گیا۔ یہ انعام اردو تخلیق کاروں کو ان کی مجموعی خدمات پر دیا جاتا ہے۔ صاحب انعام کو دو لاکھ روپے، سپاس نامہ اور شال بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس سے قبل سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، گوپی چند نارنگ، سید محمد اشرف، وغیرہ کو اس ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ اس موقعے پر جناب پنکج راج نے فرمایا کہ اقبال کے نام سے اس نوعیت کے مایہ ناز ایوارڈ کو گذشتہ چالیس برسوں سے قائم رکھنا مدھیہ پردیش حکومت کی اردو دوستی کا بین ثبوت ہے۔ ہمارے لیے بے حد فخر کی بات ہے کہ ہم پروفیسر عتیق اللہ کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں یہاں جمع ہوئے ہیں۔ میں انھیں حکومت مدھیہ پردیش کی طرف سے تہہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ پروفیسر نعمان خاں نے اقبال سمان کی نوعیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر شافع قدوائی کو مبارکباد پیش کی اور یہ بھی فرمایا کہ پروفیسر عتیق اللہ عمر کے جس دور میں ہیں ان کے قلم کی تیز روی اور تازگی دیکھتے ہوئے رشک آتا ہے۔ جناب پرمود کمار جی نے پروفیسر عتیق اللہ کو 2014 کے اور پروفیسر شافع قدوائی کو 2015 کے اقبال سمان دیے جانے پر مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 اگست 2019

پروفیسر ناشر نقوی

امروھه: حکومت ہریانہ کی جانب سے 2018 کے لیے جن نیشنل اور اسٹیٹ اردو ادیبوں کو ان کی غیر معمولی ادبی

خدمات کے لیے منتخب کیا گیا، ان میں امروہہ کے ڈاکٹر ناشر نقوی کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے اردو ڈپارٹمنٹ سے 14 ریسرچ اسکالرس کو مختلف ادبی موضوعات پر سپروائزر رہتے ہوئے پی ایچ ڈی کی ڈگری مکمل کرائی۔ علاوہ ازیں ہریانہ اور پنجاب کی ادبی لسانی صوفیانہ اور ثقافتی تہذیب کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ 22 اگست کو چنڈی گڑھ کے ہریانہ بھون میں ہریانہ کے گورنر ایس ڈی نارائن آریہ نے ہریانہ اردو اکادمی کی طرف سے پروفیسر ناشر نقوی کو

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تہنیتی جلسے کا انعقاد

تمغہ، سپاسنامہ، شال اور ایک لاکھ روپے کے چیک سے نوازا۔ ڈاکٹر نقوی کو اعزاز دینے والوں میں وزیر اعلیٰ ہریانہ صوبائی سرکار کے چیف سکریٹری راجیش کھلر اور ڈائرکٹر محکمہ رابطہ عامہ بھی شامل رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اگست 2019

شعبۂ اردو میں تہنیتی جلسہ

نئی دہلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اردو اکادمی دہلی کے انعام یافتگان پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر وہاج الدین علوی کے لیے تہنیتی جلسے کا انعقاد کیا۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے تہنیتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ تینوں انعام یافتگان اس ایوارڈ کے مستحق تھے، ان کی ادبی خدمات غیر معمولی ہیں۔ دیگر شرکا نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ جن ادیب و شعرا کو اکادمی نے ایوارڈ دیا ہے وہ بھی اردو تنقید اور معاصر ادبی رجحانات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر وہاج الدین علوی کی شال پوشی کی۔ ان تینوں انعام یافتگان کا بالترتیب پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر شہپر رسول اور پروفیسر احمد محفوظ نے گلدستے سے خیر مقدم کیا۔ سال 2019 میں دہلی اردو اکادمی نے اپنا سب سے بڑا قومی ایوارڈ بہادر شاہ ظفر ایوارڈ معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر شارب ردولوی کو پیش کیا جو کہ دو لاکھ اکیاون ہزار روپے، شیلڈ، سند اور شال پر مشتمل تھا۔ اکادمی کا دوسرا بڑا انعام پنڈت دتاتریہ کیفی ایوارڈ ممتاز نقاد پروفیسر عتیق اللہ کو پیش کیا۔ یہ ایوارڈ بھی دو لاکھ اکیاون ہزار روپیہ، شیلڈ، سند اور شال پر مشتمل ہے۔ اکادمی کی جانب سے پروفیسر وہاج الدین علوی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے، شیلڈ، سند اور شال پر مشتمل اردو تحقیق و تنقید ایوارڈ دیا گیا۔ پروفیسر شہپر رسول نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی دہلی کا انعام قبول کر کے دراصل انعام یافتگان نے اکادمی کی عزت افزائی کی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اگست 2019

پروفیسر علی احمد فاطمی

لکھنؤ: پروفیسر ڈاکٹر علی احمد فاطمی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں 'ڈاکٹر راہی معصوم رضا ساہتیہ ایوارڈ 2019' سے نوازا گیا۔ یہ اعزازی تقریب رائے

اوما ناتھ بلی آڈیٹوریم میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا ساہتیہ اکادمی کی جانب سے راہی معصوم رضا کی یوم پیدائش کے موقعے پر منعقد کی گئی۔ پروگرام میں راہی معصوم رضا کو خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا۔ تقریب میں اکادمی کے جنرل سکریٹری رام کشور نے کہا کہ ڈاکٹر راہی معصوم رضا ہندی اور اردو کے مایہ ناز ادیب تھے، ان کے جیسا بے باک، بہادر اور سچی بات کہنے والا ادیب شاید ہی ہندی و اردو میں ہو۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی بات کی اور کبھی مذہبی تفریق نہیں کی۔ واضح ہو کہ ایوارڈ سے نوازے گئے ڈاکٹر علی احمد فاطمی اردو کے معروف ادیب و نقاد ہیں، وہ الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ہیں۔ اس موقعے پر کرامت کالج کی شبنم رضوی، آگرہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدر نسرین بیگم نے ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی زندگی اور ان کی تحریروں پر روشنی ڈالی۔ تقریب میں ڈاکٹر رمیش دکشت، پروفیسر ایس ایس جعفری، اکھلیش سریواستو، بھگوان سروپ کٹیار، ویریندر ترپاٹھی، کے کے شکلا سمیت کثیر تعداد میں لوگ موجود رہے۔ آخر میں اکادمی کے سالانہ رسالہ کا اجرا کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 ستمبر 2019

رحمٰن عباس

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ناول نگار رحمٰن عباس ان دس ادیبوں میں شامل ہیں جن کے ناموں کا اعلان کروسنگ بارڈر، برلن (جرمنی) کی جوری نے بین الاقوامی گرانٹ برائے سال 2019 کے لیے کیا ہے۔ کروسنگ

بارڈر پروگرام کے تحت رابرٹ باش فاؤنڈیشن اور لٹریچر کولوکیم برلن مشترکہ طور پر ہر سال ادیبوں، فلم سازوں اور فوٹوگرافری کے لیے عالمی سطح پر گرانٹ تفویض کرتے ہیں۔ رحمٰن عباس کو یہ گرانٹ ناول پر ریسرچ کے لیے ملی ہے جو آئندہ سال دسمبر تک شائع ہوگا۔ غالباً پہلی بار اردو میں ناول لکھنے کے لیے کسی اہم یوروپی ادارے نے اردو مصنف کو گرانٹ ایوارڈ کی ہے۔ کروسنگ بارڈر کی انتظامیہ نے رحمٰن عباس کو جو گرانٹ عنایت کی ہے اس کا استعمال وہ یورپ کی سیر کے لیے کریں گے جہاں وہ نازی ازم کے نظریات کی پیدائش، فروغ اور ان عوامل کا مطالعہ کریں گے جو یہودیوں کی یورپ میں نسل کشی کا سبب بنے۔ رحمٰن عباس کا مذکورہ ناول بھارت میں مسلم اور دیگر اقلیتوں کو درپیش وجودیاتی سوالات کا احاطہ کرے گا۔ رحمٰن عباس کی اب تک سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں چار ناول ہیں۔ انھیں دو ناولوں پر ریاستی اکادمی کے ایوارڈ تفویض ہوئے ہیں۔ تازہ ناول 'روحزن' پر انھیں 2018 میں بھارت کا سب سے اہم ادبی ایوارڈ ساہتیہ اکادمی مل چکا ہے۔ یہ ناول جرمن زبان میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 21 اگست 2019

ڈاکٹر ارم

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فیکلٹی ممبر ڈاکٹر ارم اقبال حجازی، جنھوں نے کینسر بائیولوجی میں کام کیا ہے، حیاتیات کے شعبہ میں ان کے تحقیقی کام کے اعتراف میں معروف ادارہ رولا (ریسرچ انڈرلٹرل ایکس) نے انھیں بین الاقوامی اعزاز سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر حجازی نے سینٹر فار انٹرڈسپلیزی ریسرچ ان بیسک سائنسیز جامعہ سے ڈاکٹر فریدہ اطہر اور ڈاکٹر سونو چند ٹھاکر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان

کے سات تحقیقی مقالے معتبر بین الاقوامی جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ لائف سائنسز فیکلٹی (گیسٹ) کی حیثیت سے انھیں تقریباً دس سالہ تدریس کا تجربہ ہے، انھیں تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی بے حد شوق ہے۔ فی الحال وہ سینٹر برائے فزیوتھیراپی اینڈ ری ہیبلیٹیشن سائنسز، جامعہ میں وزٹنگ فیکلٹی کی حیثیت سے پڑھاتی ہیں۔ وہ شعبہ بائیوٹیکنالوجی میں بھی کئی مضامین پڑھا چکی ہیں۔ رولا عالمی ریسرچ کونسل کی جانب سے ایک تسلیم شدہ ادارہ ہے، جو پوری دنیا کے محققین کو ٹیکنالوجی کے صحیح استعمال کے ساتھ بااختیار بنانے کے لیے پرعزم ہے۔ یہ یونائیٹڈ میڈیکل کونسل کے ذریعے بھی تسلیم شدہ ہے جس سے اقوام متحدہ سے وابستہ صحت و عوامی بہبودی کی خاطر کام کرنے والے ماہرین منسلک ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اگست 2019

عظیم امروہوی و مولانا کوثر مجتبیٰ

امروهه: ادبی سنگم امروہہ کا ایک جلسہ صدر حسن مجتبیٰ واحد کے مکان محلہ دانشمندان میں ہوا جس کی صدارت حسن مجتبیٰ واحد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض نائب صدر پنڈت بھونیش شرما بھون نے انجام دیے۔ جلسے میں دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقدہ امام علی بین الاقوامی کانفرنس میں امروہہ کی ادبی شخصیات ڈاکٹر عظیم امروہوی اور مولانا کوثر مجتبیٰ کو ان کی ادبی خدمات پر اس سال کا 'خصوصی سفینہ ایوارڈ' سے نوازے جانے پر مبارکباد پیش کی گئی۔ پنڈت بھون نے بتایا کہ سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ کے زیراہتمام سہ روزہ انٹرنیشنل کانفرنس میں اسلامی جمہوریہ ایران کے عظیم رہنما آیۃ اللہ شیخ محسن اراکی، دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ظفرالاسلام، علامہ عقیل الغروی، علامہ ذوالقدر رضوی و دیگر علما و دانشوران کے ہاتھوں امروہہ کی قابل فخر شخصیات ڈاکٹر عظیم امروہوی کو مجموعی ادبی خدمات بالخصوص صنف مرثیہ پر کام کرنے کے لیے ایک لاکھ روپے اور مومنٹو سے نوازا گیا اور مولانا کوثر مجتبیٰ کو ان کی کتاب 'فضائل پنجتن در صحاح ستہ' کے ترجمہ کے لیے 14 ہزار روپے اور مومنٹو دیگر بہترین اور قابل قدر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 اگست 2019

منظر بھوپالی اور اسلم حسن کو استقبالیہ

نئی دهلی: ایک حساس انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ غموں کے اس دور میں روشنی کی کرن بن کر سماج کو خوشیوں سے روبرو کرانا ہی شاعر کا اصل کام ہے۔ ان خیالات کا اظہار سماجی و ثقافتی تنظیم آئیڈیا کمیونیکیشن کے زیراہتمام نائب صدر ڈاکٹر سید فارق نے معروف شاعر منظر بھوپالی اور شاعر و جوائنٹ کمشنر جی ایس ٹی، اسلم حسن کی استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ منظر بھوپالی ایک مقبول عام شاعر اور اچھے انسان ہیں۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئی دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ آج پھر سے مجلسی طریقۂ تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ماضی قریب تک محفلوں اور مجلسوں میں آداب و اخلاق کے علاوہ باہم گفتگو سے بہت سی باتیں جاننے اور سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ شعری و ادبی نشستوں کا اہتمام اس کمی کو بہت حد تک پورا کر سکتا ہے۔ منظر بھوپالی نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے چھوٹی چھوٹی سطحوں پر کام کرنا اور اس کو حالات کی رفتار کے ساتھ جوڑنا ضروری ہے۔ اسلم حسن نے اپنی پذیرائی کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی تقریبات میں اچھے ادیبوں، فنکاروں اور تخلیق کاروں سے ملاقات اور ان کے زندگی بھر کے تجربات سے سیکھنے اور مہمیز لینے کا موقع ملتا ہے۔ آئیڈیا کمیونیکیشن کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے تعارفی کلمات پیش کیے اور آئیڈیا کے اہم رکن پروفیسر سید فاروق نے شکریہ کا فریضہ انجام دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 اگست 2019

شمیم مرتضیٰ فاروقی

دیوبند: جے ہند ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام تعلیمی میدان میں اپنی بہتر خدمات پیش کرنے والے اسلامیہ انٹر کالج کے سابق پرنسپل شمیم مرتضیٰ فاروقی کو 'شکشا رتن' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے صدر مسرور ملک نے کہا کہ شمیم مرتضیٰ فاروقی نے تعلیم کے میدان میں جو قابل تعریف کام کیا ہے، اسے علاقہ کے عوام کبھی بھلا نہیں پائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے دور پرنسپلی میں شمیم مرتضیٰ فاروقی نے مسلم بچوں اور بچیوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامیہ انٹر کالج کا آج ضلع کے ٹاپ موسٹ کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے سرپرست ماسٹر ممتاز احمد، خازن محمد نسیم انصاری ایڈوکیٹ اور جنرل سکریٹری اکرام انصاری نے شمیم مرتضیٰ فاروقی کے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے تئیں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مہمان خصوصی عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ شمیم مرتضیٰ فاروقی نے اسلامیہ انٹر کالج کو اتنی اونچائیوں پر پہنچایا کہ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم معاشرے کو بہتر بناتی ہے، تعلیم ہی ہر قوم کی بنیاد ہوتی ہے، اس لیے آج اس سائنس و کمپیوٹر کے دور میں ہم اپنے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کریں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 اگست 2019

ڈاکٹر آفتاب نعمانی

نجیب آباد: یوم آزادی کے موقعے پر عوامی امدادی سوسائٹی کرتپور کے زیراہتمام منعقدہ پروگرام میں راشٹریہ سہارا کے نمائندے ڈاکٹر آفتاب نعمانی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں علامہ اقبال ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نعمانی کو اعزاز سے سرفراز کیے جانے پر نجیب آباد کے ادبی حلقوں میں خوشی کا ماحول ہے۔ اس سے قبل بھی ڈاکٹر آفتاب نعمانی کو نجیب آباد میں منعقدہ سیمنار میں علامہ تاجور نجیب آبادی ایوارڈ سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں ان کا شعری مجموعہ 'لفظ لفظ آفتاب' منظر عام پر آیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اگست 2019

بھگوتی چرن بھارتی

سیتامڑھی: ہندی- اردو ایکتا منچ پوپری کے زیراہتمام 'نرالا ودیا مندر' میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی

صدارت ہندی کے مشہور کوی مشہور ایڈوکیٹ بھگوتی چرن بھارتی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض راہل کمار و جمیل اختر شفیق نے مشترکہ طور پر بحسن و خوبی منفرد لب و لہجہ میں انجام دیے۔ اس موقعے پر مشاعرے کی صدارت کر رہے ایڈوکیٹ بھگوتی چرن بھارتی کو یادگار بدرالحسن بدر ایوارڈ سے نوازا گیا جبکہ کلکتہ سے شرکت کرنے آئیں شاعرہ فوزیہ اختر ردا، اور جدید لب و لہجہ کی نوجوان نسل کی مشہور شاعرہ درخشاں انجم، وشیوہر سے آئیں انجیلا شا مشرا کی شال، مومنٹو، ڈائری اور کتابوں سے عزت افزائی کی گئی۔ اس موقعے پر شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 ستمبر 2019

کے ایل نارنگ ساقی کی مرتب کردہ کتاب 'شگفتگی و برجستگی قلم کاروں کی (ادبی لطائف)' کا اجرا

مجروح سلطان پوری کی دو مرتبہ کتابوں کا اجرا

مرزا عبدالقیوم ندوی

ممبئی: خلافت ہاؤس ممبئی میں آل انڈیا مسلم مجلسِ مشاورت کی جانب سے مرزا عبدالقیوم ندوی کو اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ عوام میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لیے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے خصوصی ایوارڈ کے لیے منتخب کرنے پر ملک کی موقر سماجی و ملی تنظیموں، تعلیمی اداروں کے سربراہان کی موجودگی میں آل انڈیا مسلم مجلسِ مشاورت کی جانب سے استقبال کیا گیا۔ ڈاکٹر مولانا عبدالحمید اظہری اور عابدہ انعامدار نے مرزا عبدالقیوم ندوی کو گلدستہ پیش کیا۔

حیرت انگیز طور گذشتہ چھ سال میں ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کی پانچ لاکھ چھپن ہزار آٹھ سو کاپیاں فروخت کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دینے پر آل انڈیا مسلم او بی سی آرگنائزیشن کے قومی صدر شبیر احمد انصاری نے کہا کہ مولانا ندوی کا یہ کارنامہ بلاشبہ اس لائق ہے کہ اس کا گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اندراج ہونا چاہیے۔ مجلسِ مشاورت کے سکریٹری جنرل مجتبیٰ فاروق نے کہا کہ ایسے وقت میں جبکہ ہر طرف سے یہ صدائیں سنائی دے رہی ہیں کہ اردو ختم ہورہی ہے، نئی نسل میں مطالعہ کا شوق کم ہوگیا ہے، ہر ماہ ماہنامہ بچوں کی دنیا کی ہزاروں کاپیاں فروخت کرنا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 27 اگست 2019

شمیم دیوبندی

دیوبند: شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی کی غزل کو علی گڑھ سے شائع ہونے والی ایک میگزین کی جانب سے آل انڈیا سطح پر بیسٹ غزل کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کی اس کامیابی پر شہر کے شعرا و ادبا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے بتایا کہ علی گڑھ سے شائع ہونے والی سہ ماہی میگزین کی جانب سے آل انڈیا غزل مقابلہ کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں ہندی کے سینئر شاعر اور ادیب ڈاکٹر ارملیش کی 'لوگ جس کو گنگنائے آج کے ماحول میں' اس لائن پر پوری غزل کہنی تھی۔ مقابلہ میں ملک کے مختلف کویوں اور شعرا نے حصہ لیا تھا، جس میں ان کی غزل کو بیسٹ غزل کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔ انھوں نے میگزین کے مدیر اور ارکانِ کمیٹی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اگست 2019

رسم اجرا:

شگفتگی و برجستگی قلم کاروں کی

نئی دھلی: ایوانِ غالب میں ایم آر پبلی کیشنز کی جانب سے کے ایل نارنگ ساقی کی مرتب کردہ کتاب 'شگفتگی و برجستگی قلم کاروں کی (ادبی لطائف)' کی رسم اجرا بدست شمس الرحمٰن فاروقی عمل میں آئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس موقعے پر نارنگ ساقی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ حاضر جوابی کے یہ لطف ہر زبان میں نہیں ہیں۔ یہ انھی زبانوں میں زیادہ ہیں جن میں ایہام اور ذومعنی فقروں کے امکان زیادہ ہوں، مثلاً سنسکرت، فارسی، انگریزی یا اردو۔ فقرے بازی، پھبتی، طنز، بات میں بات پیدا کرنا، ان سب کے ایک سے ایک عمدہ نمونے اس کتاب میں موجود ہیں۔ ادیبوں اور خاص کر اردو ادیبوں کے لطیفے جمع کرنا اور انھیں کتابی شکل دینا نارنگ ساقی کے لیے بجا بھی ہے۔ وہ ہند و پاک کے تقریباً سارے شاعروں اور زیادہ تر افسانہ نگاروں اور نقادوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے جناب سید شاہد مہدی (آئی اے ایس، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کتاب میں ادیبوں کے لطائف کو ادبی گنجینہ کہا۔ عظیم اختر نے 'شگفتگی و برجستگی قلم کاروں' پر ایک تحریری مضمون پیش کیا۔ فاروقی ارگلی، ڈاکٹر خالد علوی نے لطائف کے حوالے سے بہت سی باتیں پیش کیں۔ خالد علوی نے بہت سے نئے لطیفوں کا اضافہ کرکے محفل کو زعفران زار کردیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عطیہ رئیس نے نارنگ ساقی کا مکمل خاکہ پیش کیا اور ان کی نئی کتاب کا تعارف بھی کرایا بلکہ بچپن میں کنور مہندر سنگھ بیدی اور نارنگ ساقی کے حوالے سے واقعہ بھی پیش کیا، چونکہ 24 اگست نارنگ ساقی کا یوم پیدائش بھی ہے، اس لیے یہ کتاب ان کے جنم دن پر ایم آر پبلی کیشنز کے مالک عبدالصمد نے تحفہ کے طور پر پیش کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ذکی طارق نے بخوبی انجام دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 اگست 2019

مجروح سلطانپوری پر مرتبہ دو کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: مجروح سلطانپوری نے جتنا کچھ سماج اور ادب کو دیا، بدلے میں اردو ادب نے ان کا جائز مقام و مرتبہ دینے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ یہ ادراک ضروری ہے کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی اور ان کو ان کا بھرپور حق دیا جانا چاہیے۔ یہ کتابیں مجروح کا حق دینے کی سمت میں ایک بہتر پہل ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دی آرٹس کے صدر اور ہندی رتن رام بہادر رائے نے مجلس فخر بحرین کے زیر اہتمام شائع مجروح سلطانپوری کو معنون اردو اور ہندی میں آصف اعظمی کی مرتب کردہ کتابوں کی تقریب پذیرائی سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ تقریب کا انعقاد ہوٹل راج پتھ ریزیڈنسی میں پرواسی سنسار اور آئیڈیا کمیونی کیشنز نے کیا تھا۔ تقریب میں کلیدی خطبہ سابق مرکزی وزیر اور معروف دانشور عارف محمد خان نے پیش کیا، جبکہ مجلس فخر بحرین کے بانی و سرپرست شکیل احمد صبرحدی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ دیگر مقررین میں اکھلیش مشرا (آئی اے ایس)، پروفیسر معین الدین جینا بڑے (جے این یو)، رما پانڈے (فلم و تھیٹر پرسنالٹی)، ندیم ماہر (شاعر و نائب صدر، انجمن محبان اردو ہند قطر)، مظہر محمود (سابق ڈائرکٹر، دوردرشن)، معین شاداب (شاعر و صحافی) اور اہم شرکا میں شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رحمٰن مصور نے، جبکہ استقبالیہ و شکریہ کے فرائض آئیڈیا کے چیئرمین گجانند پرساد شرما اور پرواسی سنسار کے مدیر راکیش پانڈے نے ادا کیے۔ اپنے صدارتی خطاب میں رام بہادر رائے نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان میں بھی اردو شاعروں کو متعارف کرانے کے لیے مجلس فخر بحرین کی ستائش کرتے

شکیل حسن شمسی کی کتاب 'تلفظ' کا اجرا

غالب اکادمی دہلی میں دو شعری مجموعے 'سخن دریا' اور 'خموش لب' کا اجرا

ہوئے کہا کہ ہندی کتاب اردو کتاب کی خوبصورت تکمیل کر رہی ہے۔ کلیدی خطاب میں عارف محمد خان نے کہا کہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب دل ہے، ضمیر ہے کیونکہ سارے مذاہب ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ مجروح اسی مذہب کے علمبردار تھے۔ وہ انسانیت، محبت اور درد دل کی شاعری کرتے رہے۔ شاعر وہی بڑا ہوتا ہے جو دل پہ گزرتی ہے، اسے رقم کرتا ہے۔ جو سماجی سروکار، انسانی دکھوں کی شاعری کرتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اگست 2019

تلفظ

نئی دهلی: شکیل شمسی کی چھ ہزار اردو الفاظ کے ذخیرے پر مشتمل کتاب 'تلفظ' پر گفتگو کے لیے عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمان نے اپنے گھر پر ایک مخصوص نشست کا اہتمام کیا جس میں زیادہ تر مدعوئین اردو صحافت سے متعلق تھے۔ یاد رہے کہ امسال اردو اکادمی نے شکیل شمسی کو اپنے ایوارڈ برائے صحافت کے لیے منتخب کیا اور دلی حکومت کے سکریٹریٹ میں تقسیم اعزازات کے موقعے پر ان کی اس کتاب کا اجرا بھی بدست منیش سسودیا نائب وزیر اعلیٰ دہلی عمل میں آیا تھا۔ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے شائع کی گئی ہے اور فروخت کے لیے اس کے بازار میں آتے ہی سب سے پہلے عالمی اردو ٹرسٹ نے اس کی چند جلدیں حاصل کر کے مجلس گفتگو کا انعقاد کر ڈالا جس کی صدارت بہار لیجسلیٹو کاؤنسل (ایوان بالا) کے رکن ڈاکٹر خالد انور نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر شعیب رضا فاطمی (مدیر عوامی نیوز کلکتہ) اور معروف شاعر منیر ہمدم موجود تھے۔ دیگر شرکا میں شکیل شمسی کے علاوہ جاوید قمر (مدیر سیاسی تقدیر)، عامر سلیم خاں (نیوز ایڈیٹر ہمارا سماج)، جاوید رحمانی (میڈیا کوآرڈینیٹر، انجمن ترقی اردو)، عبدالسلام عاصم (انچارج اردو یو این آئی)، ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی (نیشنل بیورو چیف روزنامہ انقلاب)، ریحانہ فریدی (آل انڈیا ریڈیو) شکیل احمد (مینیجنگ ایڈیٹر نیوز میکس)، ڈاکٹر وسیم راشد (مدیر صدا ٹوڈے) اور نشا جعفری (بزنس رپورٹر روزنامہ 'سائبان') نمایاں تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 اگست 2019

'سخن دریا' اور 'خموش لب'

نئی دهلی: اردو شعر و ادب کے حوالے سے غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین دہلی میں دہلی کی ادبی، ثقافتی، سماجی و سائنسی تنظیم، سب رنگ کے زیر اہتمام، شعر و ادب کی تر و تازگی سے بھرپور دو دو کتابوں کی رسم رونمائی انجام پذیر ہوئی۔ ایک شعری مجموعہ بہ عنوان 'سخن دریا' منفرد لب و لہجہ کے شاعر، ادیب، نثر نگار، مصور اور سائنس داں ڈاکٹر عبیدالرحمٰن کا تھا تو خموش لب کے عنوان سے دوسرا شعری مجموعہ سعودی عرب کے شہر ریاض میں اردو شعر و ادب کے حوالے سے ہندوستان کا پرچم بلند کر رہے مستند و معتبر شاعر ظفر محمود ظفر کا تھا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے فرمائی جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر سابق پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ جناب انیس الرحمٰن اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے جواہر لال نہرو یونیورسٹی، پروفیسر انور پاشا نے پروگرام کو وقار بخشا۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض مشہور شاعر شکیل جمالی نے فرمائی۔ 'سخن دریا' اور 'خموش لب' دونوں کتابوں پر جن دیگر معزز حضرات نے اپنے تاثرات اور خیالات پیش کیے۔ ان میں ڈاکٹر ابرار رحمانی، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر مولی بخش، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر مشتاق صدف، مشرف عالم ذوقی، نعمان شوق، اکرام الحق، محترمہ ناظمہ جبیں، ڈاکٹر خالد مبشر کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔ اختر مسعود نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اگست 2019

میرے تصور میں رنگ بھر دو

پٹنه: معروف ادبی تنظیم دانش مرکز (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام شاعر و صحافی ڈاکٹر بسمل عارفی کے شعری مجموعہ 'مرے تصور میں رنگ بھر دو' کی رسم اجرا پھلواری شریف، پٹنہ میں ہوئی، جس کی صدارت معروف فکشن نگار مشتاق احمد نوری نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر احمد جاوید شریک رہے اور نظامت کے فرائض اثر فریدی نے انجام دیے۔ صاحب کتاب ڈاکٹر بسمل عارفی کو شال اور پھولوں کا ہار پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی گئی۔ اس موقعے پر دیگر مہمانان کا بھی پھولوں کا ہار پیش کر کے استقبال کیا گیا۔ شعری مجموعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے احمد جاوید نے کہا کہ ڈاکٹر بسمل عارفی کئی محاذ پر سرگرم عمل ہیں، جن میں ایک ان کی شاعری بھی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے شعری دنیا میں اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ مجھے ان کی شاعری میں موجودہ عہد سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مشتاق احمد نوری نے بسمل عارفی کی شاعری میں عصری آگہی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بطور حوالہ کئی اشعار پیش کیے۔ ناشاد اورنگ آبادی، ظفر صدیقی، اثر فریدی اور پرویز احمد نے بھی شعری مجموعہ اور ڈاکٹر بسمل عارفی کی شخصیت کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 اگست 2019

ہندی اردو ڈکشنری

علی گڑھ: انجمن محبان اردو علی گڑھ کے اراکین عبدالحفیظ خان اور عادل فراز نے اے ایم یو علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی سے ایک خصوصی ملاقات کے دوران ان کی تازہ کتاب 'ہندی اردو ڈکشنری' کے حوالے سے گفتگو کی۔ موصوف نے بتایا کہ "یہ ڈکشنری ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو ہندی جانتے ہیں اور اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ثانوی زبان کے طلبہ کو خیال میں رکھ کر مرتب کی گئی ہے تاکہ انھیں بغیر کسی دشواری کے آسانی کے ساتھ اردو سکھائی جا سکے۔ اس کتاب میں تقریباً ساڑھے سات ہزار سے لے کر آٹھ ہزار تک الفاظ شامل ہیں۔ اس میں وہ الفاظ ہیں جو صحافت، شاعری اور متن میں استعمال ہوتے ہیں۔ مجھے اس کتاب کو تیار کرنے میں پانچ سال لگے۔ یہ کتاب حکومت ہند کی

عزیز نبیل کے مجموعہ کلام 'آواز کے پر کھلتے ہیں' کے اجرا کا منظر

جانب سے مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکزی ادارہ 'سی آئی ایل' کے ضوابط کے مطابق تیار کی گئی ہے۔ واضح ہو کہ اس کتاب کا اجرا کیندریہ ہندی سنستھان کے ڈائرکٹر پروفیسر نند کشور پانڈے یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر اختر حسیب اور شعبۂ ہندی کے صدر پروفیسر عبدالعلیم کے ہاتھوں آرٹس فیکلٹی کے آڈیٹوریم میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر طارق چھتاری بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 اگست 2019

اور مناظر سب انھیں غیر معمولی بناتے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اردو ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے اور عزیز نبیل کی شاعری اس تہذیب کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ پرتاپ سوم ونشی نے اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ عزیز نبیل نے جس طرح سے اردو کے اہم شاعروں کی خدمات کا تنقیدی محاکمہ کتابی صورت میں پیش کیا ہے، وہ یقیناً ان کے خلوص کا ترجمان ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اگست 2019

آواز کے پر کھلتے ہیں

نئی دهلی: شاعری آفاقی چیز ہے اور شاعر لامحدود زمانوں کی بات کرتا ہے۔ عزیز نبیل کی شاعری انھی ماورائی اور تصور سے دور خیالات، احساسات اور نظریات کی عکاسی کرتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممبر نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن جیوتکا کالرا نے عزیز نبیل کے دوسرے مجموعۂ کلام 'آواز کے پر کھلتے ہیں' (اردو) اور 'پہلی بارش' (ہندی) کی تقریب رسم اجرا میں بحیثیت مہمان خصوصی کیا۔ معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے آئیڈیا کمیونی کیشن کے زیراہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد اس تقریب کی صدارت کی جبکہ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے شرکت کی۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے محترمہ کامنا پرساد (بانی جشن بہار ٹرسٹ) اور راکیش پانڈے (ایڈیٹر پرواسی سنسار) اس اہم پروگرام میں شریک ہوئے۔ کلیدی مقررین میں اردو کے معروف شاعر و ناقد پروفیسر شہپر رسول اور ایگزیکیٹو ایڈیٹر، ہندوستان پرتاپ سوم ونشی نے شرکت کی۔ آئیڈیا کمیونی کیشن کے نائب صدر ڈاکٹر سید فاروق نے تعارفی کلمات پیش کیے جبکہ ڈائرکٹر آصف اعظمی نے اظہارِ تشکر کا فریضہ انجام دیا۔ مذکورہ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ اس موقعے پر سید محمد اشرف نے کہا کہ عزیز نبیل ہمارے عہد کے غیر معمولی شاعر ہیں۔ ان کے اشعار کے موضوعات، لہجہ، لفظیات

درد کے سائے

نئی دهلی: اردو دوست معروف افسانہ نگار گیان چند

کینتھ نشتر دہلوی کے افسانوی مجموعہ 'درد کے سائے' کا اجرا سینئر صحافی و ادیب نند کشور وکرم کے ہاتھوں انصاری اسلامک کلچرل سینٹر 6/275 للیتا پارک لکشمی نگر دہلی میں ہوا۔ نند کشور وکرم نے نشتر دہلوی کے لیے دعائیہ کلمات کے ساتھ کہا کہ اگر اپنے ادبی تخلیقی سفر کو جاری رکھیں گے، تو اس کے نتائج کارآمد ثابت ہوں گے۔

صدارت ممتاز افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شیام سندر سنگھ نے انجام دیے۔ ابتدا میں مہمان خصوصی شاعر و ناقد عمران عظیم ایڈووکیٹ، معروف ادیب فاروق ارگلی اور نوجوان ادیب و صحافی حبیب سیفی تھے۔ تقریب کے صدر مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ گیان چند کینتھ نشتر دہلوی کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں اس ادبی سفر میں اطہر انصاری (ساحر داؤد نگری) ملے اور نشتر دہلوی کی کتاب شائع کرا کے اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے دھارے میں جو رکاوٹ دکھ رہی تھی اس میں تیزی لانے کا کام کیا۔ شاعر و ناقد عمران عظیم ایڈووکیٹ نے کہا کہ نشتر دہلوی نے اپنی کتاب 'درد کے سائے' میں دنیاوی درد کے سائے سے نجات کی تدبیریں پیش کی ہیں۔ معروف ادیب فاروق ارگلی نے بھی موصوف افسانہ نگار کو آئندہ بھی اس سفر پر چلنے کی دعائیں دیں، اور کہا کہ ایسے مشترکہ تہذیب کے متوالوں سے ہی ہندوستان کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ادیب و صحافی حبیب سیفی نے کہا کہ 'درد کے سائے' افسانوی مجموعہ میں قدروں کے زوال، قوموں کے انتشار، اور ذہنوں کے خلفشار کے ساتھ انسانیت کا درد کثرت سے پایا جاتا ہے، آپ کی اردو سے دوستی موجودہ حالات میں بڑی چیز ہے۔ بزرگ نشتر دہلوی کی پوتی امریتا کینتھ نے بھی اردو سے والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر شرکا نے کہا کہ اگر کینتھ جیسے گھرانوں میں ایسے اردو کے چاہنے والے ہیں تو ہمیں امید ہے کہ دنیا میں اردو پھلتی پھولتی رہے گی۔ آخر میں پروگرام کے کنوینر اطہر انصاری نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اگست 2019

وفیات :

نند کشور وکرم

نئی دهلی: معروف فکشن نگار، ناقد اور حوالہ جاتی مجلّہ عالمی اردو ادب کے مدیر نند کشور وکرم 27 اگست کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی عمر 90 سال تھی لیکن وہ ذہنی، جسمانی اور ادبی ہر لحاظ سے فعال تھے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کا اصلی نام نند کشور دت تھا اور قلمی نام نند کشور وکرم۔ ان کی پیدائش 17 ستمبر 1929 کو راولپنڈی (پاکستان) میں ہوئی تھی لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ ہندوستان آکر دلی میں آباد ہوگئے تھے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں اور دہلی یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ بہ حیثیت صحافی انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز

کیا۔ روزنامہ ’قومی اخبار‘ اور ’امرت‘ سے ان کی وابستگی رہی ہے اور کانپور میں انھوں نے دیویندر اسر کے اشتراک سے ماہنامہ ’ارتقا‘ شائع کیا۔ انی کہانی کی بھی انھوں نے ادارت کی۔ 1964 سے 1979 تک بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر ماہنامہ ’آجکل‘ میں خدمات انجام دیں اور پریس انفارمیشن بیورو (PIB) بطور انفارمیشن آفیسر کام کیا۔ ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، پھر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ 1986 میں انھوں نے عالمی اردو ادب عنوان سے ایک ششماہی مجلہ شروع کیا جس میں مشہور ادبی شخصیات پر خصوصی شمارے شائع کیے۔

نند کشور وکرم بنیادی طور پر فکشن نگار تھے۔ کئی افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ان کا ناول ’انیسواں ادھیائے‘ کافی مشہور ہوا۔ ان کی مشہور کتابوں میں مصور تذکرے، ہنس راج رہبر کے منتخب افسانے، کچھ دیکھے کچھ سنے، بھولے بسرے مجاہدین، دیویندر اسر: ایک دانشور ایک مفکر، غالب: حیات وشاعری، یادوں کے کھنڈر، محمد حسین آزاد، آوارہ گرد، آدھا سچ، شباب للت: شخصیت اور ادبی خدمات، منتخب افسانے 1984 قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی میں یادوں کے کھنڈر، انیسواں ادھیائے، آدھا سچ شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اردو سے ہندی، ہندی سے اردو، پنجابی سے اردو، انگریزی سے اردو میں بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں چہار سو راولپنڈی، کاروانِ ادب بھوپال اور مکالمات دہلی کے خصوصی شمارے اور گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ ’فرہاد لوح وقوم: نند کشور وکرم‘ کے عنوان سے فاروق ارگلی نے ان کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں ایک کتاب بھی مرتب کی ہے۔ ہندوستان ہی نہیں پاکستان سے بھی انھیں کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ نند کشور وکرم نہایت خوش خلق، نرم گفتار اور منکسر المزاج تھے۔ پچھلے تقریباً پچیس سال سے انھوں نے خود کو مکمل طور سے اردو کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

یو این آئی اور دیگر اخبارات سے، 28 اگست 2019

خیام

ممبئی: بالی ووڈ کے عظیم موسیقار خیام کا 19 اگست کو انتقال ہو گیا۔ وہ 93 سال کے تھے۔ خیام لمبے عرصے سے بیمار تھے۔ پھیپھڑے میں انفیکشن کی وجہ سے انھیں 28 جولائی کو ممبئی کے ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں انھوں نے رات تقریباً ساڑھے 9 بجے آخری سانس لی۔

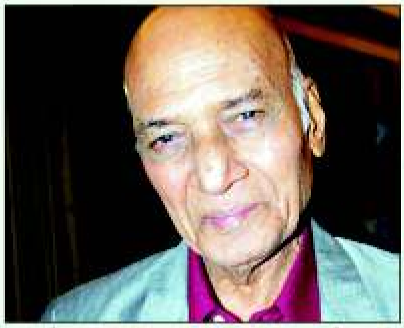

ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق کارڈیاک اریسٹ کی وجہ سے ان کی موت ہوئی۔ معروف موسیقار کے انتقال سے فلمی دنیا میں ماتم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ بالی ووڈ کے اداکاروں نے پدم وبھوشن یافتہ ہردلعزیز موسیقار کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کا پورا نام محمد ظہور خیام ہاشمی ہے لیکن فلمی دنیا میں وہ خیام کے نام سے مشہور تھے۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے خیام کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ٹوئٹ میں کہا کہ خیام صاحب کو ہندوستان ہمیشہ یاد رکھے گا جنھوں نے فلمی دنیا کو یادگار موسیقی عطا کی اور موسیقی کے میدان میں نئے کمپوزروں کی جس طرح انھوں نے رہنمائی کی دنیا اس کے لیے انھیں یاد رکھے گی۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 20 اگست 2019

اوصاف سعید وصفی

نئی دھلی: سینئر صحافی اوصاف سعید وصفی کے انتقال پر متعدد صحافتی، سماجی اور مذہبی تنظیموں اور رہنماؤں نے تعزیت کا اظہار کیا ہے اور ان کی موت کو صحافت کے لیے ایک بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ پریس کلب آف انڈیا کے صدر انت باگیکر نے کہا کہ پریس کلب آف انڈیا اپنے چند قدیم ترین اراکین میں سے ایک سے محروم ہو گیا۔ وہ پی سی آئی اور پی آئی بی کے قدیم ترین اراکین میں سے ایک تھے۔ آل انڈیا ملی کونسل نے بھی اوصاف سعید کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اوصاف سعید کے انتقال کو ملک وملت کے لیے ایک بڑا نقصان قرار دیا۔ انھوں نے ان کے لواحقین کے ساتھ تعزیت کا اظہار کیا۔ جماعت اسلامی ہند کے متعدد رہنماؤں نے اوصاف سعید کے انتقال کو ہندوستان میں تعمیری اور غیر جانبدار صحافت کے لیے ایک بڑا خسارہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اوصاف سعید وصفی کی معروضی، بے باک اور غیر جانبدارانہ صحافت موجودہ نسل کے صحافیوں کے لیے ایک مثال ہے۔ اوصاف سعید وصفی کا طویل علالت کے بعد 24 اگست کو انتقال ہو گیا۔ انھیں شاہین باغ کے گور غریباں قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس موقعے پر متعدد اہم سماجی، مذہبی اور سیاسی شخصیات کے علاوہ بڑی تعداد میں صحافی بھی موجود تھے۔ اوصاف سعید وصفی 1939 میں بھوپال میں پیدا ہوئے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، دو بیٹے توصیف وصفی اور توقیر وصفی اور ایک بیٹی عظمیٰ اور داماد ضیاء السلام ہیں۔ توصیف ایک سعودی روزنامہ کے ادارتی بورڈ میں شامل ہیں جب کہ بیٹی کالم نویس اور داماد انگلش کے معروف صحافی ہیں۔ اوصاف سعید تقریباً نصف صدی تک انگلش ہفت روزہ ریڈینس سے وابستہ رہے اور 1996 میں ڈپٹی چیف ایڈیٹر کے طور پر سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی وہ ملکی اور بین الاقوامی امور پر لکھتے رہے۔ انھوں نے لندن سے شائع ہونے والے جریدہ امپیکٹ انٹرنیشنل کے لیے بھی کام کیا۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں ’انڈیاز فارن ریلیشنز اینڈ دی مسلم ورلڈ‘ شامل ہے۔ انھوں نے متعدد مسلم ملکوں کے سربراہوں کا انٹرویو بھی لیا تھا۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 25 اگست 2019

انیقہ قاسمی

نئی دھلی: معروف ادیب ونقاد حقانی القاسمی کی بیٹی انیقہ قاسمی کا 2 ستمبر 2019 سوموار کو انتقال ہو گیا۔ انیقہ ’ذاکر حسین میموریل سوسائٹی‘ کے زیر انتظام ’سینٹر فار ووِمن کنڈ نیس کورس‘ میں 8ویں کلاس کی طالبہ تھی۔ 2 ستمبر بروز

سوموار اسکول میں سیڑھیاں چڑھنے کے دوران گر کر بیہوش ہو گئی تھی۔ اسے ہولی فیملی اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے مردہ قرار دے دیا۔

3 ستمبر کو بعد نماز ظہر شاہین مسجد، شاہین باغ میں نماز جنازہ مولانا عظمت ندوی نے پڑھائی۔ نماز جنازہ

میں دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ صحافی، ادبا و شعرا، سیاسی، سماجی ملی شخصیات کی ایک بڑی تعداد بھی شریک ہوئی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے حقانی القاسمی سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ اس غم کی گھڑی میں قومی اردو کونسل کے تمام کارکنان حقانی القاسمی کے ساتھ ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے بھی تعزیت کا اظہار کیا۔ اہلیہ کو شاہین باغ کے گورغریباں میں دفن کیا گیا۔ اس کی تدفین میں ہر طبقے اور شعبے کے افراد نے شرکت کی جن میں دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول، جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر شہپر رسول، موجودہ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر سید تنویر، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر عادل حیات کے علاوہ معروف ادیب فاروق ارگلی، معروف صحافی اسد رضا، محمد خلیل (سائنٹسٹ)، ڈاکٹر حنیف ترین، انجم عثمانی اور معروف ناول نگار راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر مشرف عالم ذوقی، روزنامہ خبریں، نئی دہلی کے چیف ایڈیٹر قاسم سید، ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی، احمد علی برقی اعظمی، ذاکر حسین میموریل سوسائٹی اسکول کے پرنسپل اقبال حسن، عابد انور، زین شمسی، خان رضوان، منظر امام قاسمی، فخر امام، محفوظ عالم، ڈاکٹر حیدر علی، ڈاکٹر شاہد الاسلام، ڈاکٹر نعمان قیصر، ڈاکٹر سعود عالم، زمرد مغل، امیر حمزہ، مفتی افروز عالم قاسمی، سلام الدین خان، ڈاکٹر یامین انصاری، ڈاکٹر انوار الحق مولانا شعیب قاسمی، مولانا اشفاق مظاہری، مولانا منتظر قاسمی، نوشاد عالم ندوی، احرار الہدیٰ ندوی، راشد الاسلام، فیروز عالم (گرسیل) کے علاوہ قومی اردو کونسل کے تمام کارکنان اور مختلف اخبارات کے صحافی، شعرا و ادبا قابل ذکر ہیں۔ اہلیہ کے پسماندگان میں والدین حقانی القاسمی، نزہت ناز دو بھائی ارسلان شکیب، اعیان ذہیب دو بہنیں الیفہ قاسمی اور ارومہ قاسمی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب'، 'راشٹریہ سہارا'، 'اودھ نامہ'، 'خبریں'، 'صحافت'، 'اخبار مشرق' 4 ستمبر 2019

خراج عقیدت :————————

ممتاز شاعر محب کوثر کی یاد میں تعزیتی نشست

گلبرگہ: انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ کی مجلس عاملہ کا ایک تعزیتی اجلاس بہ سانحہ ارتحال ممتاز شاعر و ناظم مشاعرہ جناب محب کوثر دفتر انجمن زیر صدارت جناب میر شاہنواز شاہین (نائب صدر) منعقد ہوا جس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر وہاب عندلیب سابق صدر کرناٹک اردو اکادمی نے کہا کہ محب کوثر سے میرے تعلقات دیرینہ تھے۔ ہم نے دوران ملازمت گرمنکال میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے ضمن میں کئی ادبی جلسے منعقد کیے۔ محب کوثر غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنی پاٹ دار آواز کے ساتھ مخصوص لب ولہجہ میں شعر سناتے تو سامعین بے حد متاثر ہوتے۔ صدر اجلاس میر شاہنواز شاہین نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ محب کوثر انتہائی چاہے جانے والی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بڑے مہمان نواز، خوش اخلاق تھے محب کوثر شاعر و ادیب کے ساتھ ساتھ ایک بہترین انسان بھی تھے۔ انھوں نے اپنے سارے افراد خاندان کو ایک اکائی کے مانند رکھا۔ محب کوثر عام فہم اور آسان زبان میں شعر کہتے تھے۔ ان کے اشعار دل میں اتر جانے کی کیفیت کے حامل ہیں۔ محب کوثر کے رفیق خاص جناب قاسم شاہ پوری رکن عاملہ نے کہا کہ محب کوثر ایک شاعر و ادیب اور ناظم مشاعرہ کے علاوہ ایک بے لوث سماجی خدمت گزار بھی تھے۔ ان کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی ان کی تعزیتی نشست کے موقعے پر اپنے تاثرات پیش کیے۔

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر........................ بتاریخ........................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فسانہ عجائب

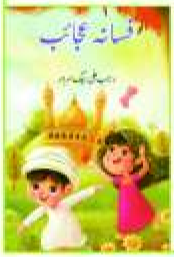

مصنف: رجب علی بیگ سرور

صفحات: 91

قیمت: 25 روپے

کیفیہ

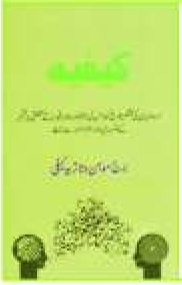

مصنف: برج موہن دتاتریہ کیفی

صفحات: 294

قیمت: 140 روپے

ارباب نثر اردو

مصنف: سید محمد

صفحات: 247

قیمت: 135 روپے

تاریخ تحریک آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

صفحات: 736

قیمت: 310 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 279

قیمت: 125 روپے

تفہیمات وترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

خودنوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجیؒ

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

مشاہیر ادبیات مشرق

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 292

قیمت: 145 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, October-2019, Vol.21, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2019
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025